زندان نامہ
علیم الحق حقی

خواجہ مقصود وزارت داخلہ کی عمارت کے بڑے ہال میں صحافیوں کے روبرو تھا۔ اس کے سامنے کئی مائیکروفون رکھے تھے اور وہ ان گنت کیمروں کا سامنا کر رہا تھا۔ ان میں اسٹل کیمرے بھی تھے اور نیوز ریل کیمرے بھی۔ وہ بھاری جسامت کا پستہ قامت شخص تھا جس کے سر کے بال آدھے سے زیادہ اڑ چکے تھے۔ وہ کمیونسٹوں کی مشہور زمانہ پالیسی کے مطابق نہایت معمولی لباس پہنے ہوئے تھا۔ یہ تاثر دینے کے لئے کہ وہ ریاست کے غریب لوگوں کا حقیقی نمائندہ ہے.......... اور خود بھی متوسط طبقے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کی پیشانی خوب صورت تھی اور چمکیلی آنکھیں ظاہر کرتی تھیں کہ وہ چالاک آدمی ہے۔ کبھی وہ یقیناً خوبرو رہا ہو گا مگر اب برسوں سے اس کے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ اور چہرے پر مضحکہ اڑانے والا تاثر رہتا تھا۔ اس کے ذریعے وہ اپنے اندر اور باہر کی فضا میں رچی ہوئی سفاکی اور بے رحمی کو چھپا کر رکھتا تھا۔

اس وقت وہ ایک اہم تقریر کرنے والا تھا۔ لکھی ہوئی تقریر کے صفحات اس کی موٹی' بھدی انگلیوں کی گرفت میں تھے۔ پیشے کے اعتبار سے وہ وکیل تھا جو بڑے دھڑلے سے سیاست میں گھسا تھا اور آگے موجود لوگوں کو گرا کر روندتا ہوا اقتدار کی کرسی تک پہنچ گیا تھا۔ وہ مقبوضہ کشمیر کا وزیر برائے امور ریاست رہا تھا۔ اب بھارت کا وزیر داخلہ تھا۔

براڈ کاسٹ ڈائریکٹر نے اپنی اسٹاپ واچ پر نگاہ ڈالی اور کھنکار کر گلا صاف کیا۔

"ایکسی لینسی.........." اس نے مودبانہ لہجے میں کہا۔

ہال میں خاموشی چھا گئی۔ مووی کیمروں کے سوا کہیں کوئی آواز نہیں تھی۔ خواجہ مقصود نے سامنے رکھے ہوئے مائیکروفون کو مناسب فاصلے پر رکھا اور براڈ کاسٹ ڈائریکٹر کی طرف متوجہ ہوا۔ آخری سگنل ملتے ہی اس نے تقریر شروع کر دی۔ تقریر کے اختصار

نے اس کے تاثر کو اجاگر کر دیا تھا۔

"پولیس اور دیگر سرکاری ایجنسیوں کے چوکنے پن کی وجہ سے ریاست کشمیر کے خلاف ایک خوفناک اور گھناؤنی سازش بے نقاب ہوئی ہے۔ یہ سازش پاکستان میں تیار ہوئی اور اسے بعض مسلم ممالک کی پشت پناہی حاصل ہے۔ اس کے تحت ریاست کشمیر میں جاسوس اور تخریب کار بھیجے جا چکے ہیں' بھیجے جا رہے ہیں اور بھیجے جاتے رہیں گے۔ ان کا مقصد تخریبی کارروائیوں کے ذریعے کشمیر میں بے چینی پھیلانا ہے۔

"آپ سب جانتے ہیں کہ خوش قسمتی سے ہم نے پاکستانی دہشت گرد نواز علی کو تخریبی کارروائیوں کا آغاز کرنے سے پہلے ہی گرفتار کر لیا تھا۔ نواز علی پر کھلی عدالت میں انصاف کے تمام اصولوں کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے مقدمہ چلایا گیا۔ اس نے اعتراف کیا تھا کہ وہ غیر قانونی طور پر کشمیر میں داخل ہوا ہے اور اس کا ارادہ کشمیریوں کے خلاف کارروائی تھا۔ نواز علی پر جرم ثابت ہو چکا ہے اور اسے عدالت نے بیس سال قید با مشقت کی سزا سنائی ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ ریاست میں جاسوس' تخریب کار اور دہشت گردوں کے داخلے کا سلسلہ موقوف نہیں ہو گا۔ ہماری انسانیت نوازی اور رحم دلانہ رویے سے انہیں کوئی سبق نہیں ملے گا۔ ہمارے معزز ججوں کی غیر جانبداری اور نرمی ان کے حوصلے بڑھاتی رہے گی۔ کشمیر کے متعلق پاکستان کا مجرمانہ کردار نہیں بدلے گا۔

"لیکن میں پاکستان اور اس کے ساتھی ملکوں پر اور پوری دنیا پر یہ واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ ہم ان کارروائیوں سے نمٹنے کے لئے تیار ہیں اور تیار رہیں گے۔ جیسے اس جاسوس نواز علی کے لئے تیار تھے۔ ہم پاکستانی جاسوسوں اور تخریب کاروں کو گرفتار کرتے رہیں گے' ان پر کھلی عدالتوں میں مقدمے چلائے جاتے رہیں گے' وہ اپنے جرائم کا اعتراف کرتے رہیں گے' مجرم ثابت ہوتے رہیں گے لیکن اب میں اور جب میں ایک فرق ہو گا۔ اب کوئی تخریب کار' دہشت گرد یا جاسوس پکڑا گیا تو بات سزائے قید پر نہیں ٹلے گی۔ اب انہیں سزائے موت دی جائے گی......... پھانسی پر لٹکا دیا جائے گا........."

☆==========☆==========☆

روزنامہ انقلاب' پیرس کے ادارتی کمرے میں ہونے والی تند و تیز بحث لحاتی

تعطل سے دو چار ہوئی۔ اخبار کے ایڈیٹران چیف عمر جاوید کی سیکریٹری زرینہ نے دروازہ کھول کر اندر جھانکا اور پوچھا۔ "موسیو عمر نہیں ہیں یہاں!؟"

اکبر نے جواب دیا۔ "وہ تو یہاں نہیں ہیں۔"

کاپی ڈیسک کے ہیڈ' نواب نے اضافہ کیا۔ "انہیں تو کب سے نہیں دیکھا ہے۔"

سٹی ایڈیٹر' صدیق فون پر اپنے مخصوص انداز میں ٹوٹی پھوٹی فرانسیسی میں بات کر رہا تھا۔ اس نے زرینہ کا استفسار سنا تو ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ "میرا خیال ہے' وہ اوبر ٹرانس اوشیانک پریس میں گئے ہیں۔"

"شکریہ۔" زرینہ نے کہا۔ "یہاں آئیں تو انہیں بتانا کہ بلغراد سے ان کے لئے ایک اہم کال ہے۔"

"او کے۔" صدیق نے کہا اور دوبارہ فون پر گفتگو میں مصروف ہو گیا۔

نواب نے ایک کاپی سلاٹ میں ڈال کر کاپی ریڈر کی طرف بڑھائی۔ "اس کی سرخی لگا دینا اور اس پر B کا ٹیگ لگا دینا۔" اس نے کہا۔ پیکٹ سے ایک سگریٹ نکال کر' سلگانے کے بعد اس نے شریر نظروں سے تیمور حسین کو دیکھا جو انقلاب' نیویارک سے ٹرانسفر ہو کر یہاں آیا تھا۔ تیمور اس لحاتی تعطل میں بحث کو بھول کر اپنے سامنے رکھے ٹائپ رائٹر کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ "تو تمہارے خیال میں ہم یہاں صرف حرام خوری کر رہے اور اپنا اپنا وزن بڑھا رہے ہیں۔" اس نے تیمور کو اکسایا۔ "تمہارے خیال میں عمر جاوید ایک نااہل ایڈیٹر ہے......... اور اخبار ایک گرما گرم اسٹوری سے محروم کر دیا گیا ہے۔ ممکن ہے' تمہاری بات درست ہو نوجوان لیکن یہاں کچھ دن گزارو گے تو........."

تیمور بھوکی مچھلی کی طرح وہ "چارہ" نگلنے کے لئے لپکا۔ اس کے ٹائپ رائٹر کی کھٹ کھٹ رکی' اس کی کرسی اس کے بھاری بھرکم جسم کے پہلو بدلنے کی وجہ سے چرچرائی۔ وہ دیو قامت آدمی تھا۔ قد چھ فٹ چار انچ سے کم نہیں تھا۔ جسم توانا اور کپڑوں سے باہر نکلنے کی کوشش کرتا محسوس ہوتا تھا۔ اس نے نظر اٹھا کر نواب کو گھورا۔ "میں نے یہ نہیں کہا تھا۔" اس کی آواز بھی بہت بھاری اور گونج دار تھی۔ "لیکن اگر تمہیں ایسا لگتا ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔"

اکبر نے جو ایک "کیریکٹر" کا انٹرویو کر رہا تھا' دانت نکالتے ہوئے کہا۔

"واہ........ پھر شروع ہو گیا۔" یہ کہہ کر وہ اپنے "کیریکٹر" کی طرف متوجہ ہوا۔

"کیریکٹر" بلجیم کا رہنے والا تھا۔ اس کا دعویٰ تھا کہ اس نے فوم اور ربر کا شاک سوٹ ایجاد کیا ہے اور اس کی آزمائش کے لئے بغیر پیراشوٹ کے ایفل ٹاور کی دوسری بالکونی سے چھلانگ لگانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ اکبر نے اس سے کہا۔ "بھاگ جاؤ۔ میں بہت مصروف ہوں۔ تم ایسا کرو کہ چھلانگ لگا دو' میرا وعدہ رہا کہ میں تمہیں اپنے کالم میں ضرور جگہ دوں گا۔"

ایک رپورٹر نے جو ہڑتال کی اسٹوری پر کام کر رہا تھا اور وہ اسے بور لگ رہی تھی' جان چھڑانے کے اس موقعے کو غنیمت جانا۔ اس نے کہا۔ "نواب بھائی' میرے خیال میں تیمور صاحب کا یہ مطلب نہیں تھا۔ سب جانتے ہیں کہ یہ امریکا نہیں ہے جہاں کسی بھی اسٹوری کو گائے سمجھ کر مسلسل دوہا جاتا ہے۔ میرے خیال میں نیاز علی کی اسٹوری بچھڑا ہے جو دودھ نہیں دے سکتا۔"

"بھئی میرے خیال میں تو اس اسٹوری سے جو کچھ حاصل کیا جا سکتا تھا' کر لیا گیا ہے۔" نیوز ایڈیٹر شکور احمد نے کہا۔ وہ چھوٹے قد کا موٹا آدمی تھا جس کے مزاج میں بلا کی جارحیت تھی۔ اس نے اپنے سامنے رکھے شیڈول پر نظر ڈالی اور پڑھنا شروع کیا۔ "نواز علی کی سزا' پاکستان کا رد عمل' مسز نواز کی ذاتی اپیل۔ اس سے اچھی کوریج تو ممکن نہیں۔ سری نگر میں ہمارے مطلب کا ایک ہی نمائندہ ہے........ ایران نیوز والا۔ ہاں' بیگم نواز والے زاویے سے کچھ اور........"

"شاندار! زبردست۔" تیمور نے داد بیداد دی۔ "سب زاویے دیکھ لئے گئے لیکن یہ زاویہ کسی کو نظر نہیں آتا کہ نواز علی نے بھارتی عدالت میں اس جرم کا اعتراف کیوں کیا جو اس نے نہیں کیا۔ اسے رپورٹنگ کہتے ہو تم لوگ؟"

بینچ پر بیٹھے ہوئے لوگ اس بحث کو بڑے غور سے سن رہے تھے۔ ان میں بھانت بھانت کے لوگ تھے۔ سب سے نمایاں استخوانی چہرے' اداس آنکھوں اور پتلی مونچھوں والا وہ یورپین تھا جو اپنے مفلر کے رنگوں اور ڈیزائن کی وجہ سے یاد رہتا تھا۔

نواز علی کے کیس میں سبھی دلچسپی لے رہے تھے۔ پاکستان کے لئے وہ معاملہ ساکھ خراب کرنے والا تھا۔ امریکا ویسے ہی پاکستان کو دہشت گرد قرار دینے پر تلا ہوا تھا۔ پاکستانی

حکومت نواز کا دفاع کرنے کی بجائے اپنا دفاع کر رہی تھی۔

اکبر نائٹ کلبوں پر کالم لکھتا تھا۔ وہ بولا۔ "کل رات میری ایک روسی سے بات ہو رہی تھی۔ اس کا کہنا ہے کہ نواز علی کو کوئی نشہ آور چیز کھلائی گئی ہو گی۔"

"ہاں۔ تصویر سے صاف پتا چلتا ہے کہ نواز پر تشدد نہیں کیا گیا ہو گا۔" شکور بولا۔ "میں نے سنا ہے کہ دماغ کا آپریشن کیا جاتا ہے جس کی وجہ سے........"

"لاحول ولا قو" تیمور غرایا۔ اس کی غراہٹ نے ڈیسک کو ہلا کر رکھ دیا۔ دھان پان سی لائبریرین نیلوفر نے اسٹیل کی فائلنگ کیبنٹ سے پلٹ کر تیمور کو دیکھا۔ وہ نظر کا چشمہ لگاتی تھی........ لیکن رنگ دار۔ کوئی نہیں جان سکتا تھا کہ وہ اس وقت کیا سوچ رہی ہے۔

"سنا ہے........ کسی نے بتایا ہے........ اس کے علاوہ بھی کچھ آتا ہے تم لوگوں کو!" تیمور نے کہا۔ "کوئی وثوق سے کچھ نہیں کہتا' معلوم کرنے کی کوشش بھی نہیں کی جاتی۔ نواز ہماری ہی طرح پاکستانی ہے اور اگر وہ جاسوس ہو سکتا ہے تو میں اور تم بھی جاسوس ہیں۔ اگر وہ انٹیلی جنس کا آدمی ہوتا تو کبھی اس بات کا اعتراف نہ کرتا۔ جاسوس بہت پکے ہوتے ہیں۔"

ایک اور رپورٹر وقار نے خیال آرائی کی۔ "ممکن ہے' اس نے اپنے کیے کا اعتراف کر لیا ہو۔ کسی اور کے تحفظ کے لئے........"

تیمور نے اسے بدمزگی سے دیکھا۔ "میں تم "ممکن ہے" ٹائپ کے لوگوں سے عاجز آ چکا ہوں۔" اس نے تند لہجے میں کہا۔ "یہ بات تو کوئی بھی کہہ سکتا ہے اور کسی سلسلے میں بھی کہہ سکتا ہے۔ یہاں کوئی انویسٹی گیٹ کرنے والا' یہ کہنے والا بھی کوئی ہے کہ ایسا ہے۔ یہ اتنی زبردست' گرما گرم اسٹوری ہے اور کشمیر میں ہمارا کوئی آدمی اس پر کام کرنے والا نہیں۔ بلکہ کشمیر کیا' کہیں بھی کوئی اس سلسلے میں کام نہیں کر رہا ہے۔"

"میرے بھائی' یہ جو تم اتنی باتیں کر رہے ہو تو اس لئے کہ تم نیویارک سے آئے ہو۔ پاکستان سے آئے ہوتے تو چپ بیٹھے ہوتے۔ بلکہ ہماری کارکردگی کے قصیدے پڑھ رہے ہوتے۔" نواب نے کہا۔ "ہم ایک غیر ملک میں بیٹھے اردو اور انگریزی اخبار چلا رہے ہیں۔ یہاں ہمیں خیال رکھنا پڑتا ہے اپنے قارئین کا۔ ذرا ادھر ادھر ہو جائیں تو

مشرقی یورپ میں کہیں بھی پابندی لگ جاتی ہے اخبار پر اور متاثر کون ہوتا ہے.......... ہمارے اردو اخبار کے قارئین جن کے لئے یہ ایک بہت بڑی نعمت ہے۔ آزادیٔ صحافت' آزادیٔ تحریر و تقریر کے علم بردار! کبھی اپنے وطن میں جا کر تو دیکھو' وہاں کسی ہاٹ اسٹوری پر سرے سے کام ہی نہیں کیا جاتا۔ اسے دبا دیا جاتا ہے۔ صرف اس لئے کہ شملہ معاہدہ بہت محترم ہے۔" وہ سانس لینے کے لئے رکا۔ "میں تمہیں بتا دوں کہ ہمارا یہاں کا اخبار پوری دنیا میں جاتا ہے بشمول پاکستان اور بھارت۔ جو لوگ خبریں پڑھنا جانتے ہیں' وہ ہمارا اخبار منگواتے ہیں۔ سمجھے؟"

"میں جانتا ہوں کہ پاکستان میں کیا حال ہے۔" تیمور کا لہجہ اب بھی تند تھا۔

"لیکن یہاں تو تم سب کچھ لکھ سکتے ہو۔ اگرچہ یہ مضحکہ خیز بات ہے کہ اپنے ملک میں تو زبان بند رہے اور غیر ملک میں کھل جائے لیکن ہے ایسا ہی۔ یہاں بیٹھ کر تم وہ کچھ کر سکتے ہو جو پاکستان میں ممکن نہیں۔"

نواب نے امریکا سے آئے ہوئے اس پُرجوش صحافی کو دیکھا جس کی شخصیت دوسروں پر چھا جانے والی تھی' جس کی آواز میں گھن گرج تھی۔ اس نے آتے ہی اسٹاف کو بری طرح متاثر کیا تھا۔ اس لئے بھی کہ وہ ایک بیسٹ سیلر ناول کا مصنف بھی تھا جس میں بڑی بے باکی سے پاکستانی سیاست کی گندگی اور اس پر بیرونی اثرات کو اجاگر کیا گیا تھا۔ جس میں ملک کے سرکردہ سیاسی رہنماؤں سے بڑے منشیات فروشوں کے تعلق کو طشت از بام کیا گیا تھا۔ نواب کو اپنے ایڈیٹران چیف کی' اسٹاف کے سامنے توہین اچھی نہیں لگی۔ اخبار کا ماحول خراب ہونے کا ڈر الگ تھا۔ وہ جان گیا کہ حملہ کرنا ضروری ہے۔ "تم بھول رہے ہو کہ تمہارا انگریزی ناول پولیٹیکل مافیا پاکستان میں بین ہے۔" اس نے کہا۔ "اور جہاں تک اسٹوری پر کام کرنے کا تعلق ہے' تو تم یہ بھی جانتے ہو کہ تم بھارت میں داخل ہو سکتے ہو لیکن مقبوضہ کشمیر میں نہیں پہنچ سکتے۔ اول تو تمہارے پاسپورٹ پر بھارت کا نام شامل ہی نہیں ہو گا۔"

"یہ درست ہے۔" تیمور نے کہا اور ہذیانی قہقہہ لگایا۔ "اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ اگر تم اچھے اور دیانت دار صحافی ہو تو ایسی کوئی رکاوٹ تمہیں نہیں روک سکتی۔"

"عمر کو کسی ہاٹ اسٹوری کی اتنی پروا نہیں ہوتی۔" نواب نے نرم لہجے میں کہا۔

"لیکن وہ ہاتھ پاؤں بچا کر' اپنے اسٹاف کو کسی دشواری میں پھنسائے بغیر ایک اچھا اخبار نکالتا ہے جسے دنیا بھر میں پاکستانی اور ہندوستانی عوام پڑھتے ہیں اور یقین کرو' یہ ایک بہت بڑی کامیابی ہے۔ یہ امریکا نہیں ہے دوست۔"

اسپیشل فیچر رائٹر فرید نے کہا۔ "تیمور' تم امریکا واپس کیوں نہیں چلے جاتے؟ تمہیں یہاں کی آب و ہوا راس نہیں آئے گی۔"

تیمور مسکرایا۔ "تم لوگ یہاں رہ کر غیر ملکی ہو گئے ہو لیکن میں تمہیں ٹھیک کر دوں گا۔ تمہیں پاکستانی ہی رہنا ہے۔ میں تمہیں بیدار کر دوں گا.........."

فائلنگ کیبنٹ کے پاس کھڑی نیلوفر اسے پرستش بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

☆============☆============☆

زرینہ نے عمر جاوید سے رابطہ کر کے اسے بلغراد کی کال کے بارے میں خود بتا دیا۔

عمر فوراً نیچے چلا آیا۔ "بلغراد سے کون فون کر سکتا ہے؟" وہ بڑبڑایا اور پھر اپنی بیوی تسکین کی طرف متوجہ ہوا جو اس کے آفس سے ملحقہ چھوٹے سے آفس میں ادارتی صفحے پر کام کر رہی تھی۔ "تسکین.........تم نے تو بلغراد میں کسی سے بات نہیں کی تھی؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں لیکن میں سننا چاہتی ہوں کہ وہاں سے کون کال کر رہا ہے۔" تسکین نے کہا۔ وہ اس کے پیچھے پیچھے آفس میں چلی آئی۔

ٹیلی فون کی گھنٹی بجی تو عمر اور تسکین دونوں نے اپنے اپنے ریسیور اٹھا لئے۔

آپریٹر نے بتایا کہ بلغراد سے بلغاریہ کے وزیر محنت کی کال ہے......... موسیو عمر جاوید کے نام۔

"ویکلاف بوروچ۔" عمر نے سرگوشی میں کہا۔ "یہ لندن میں بلغاروی سفیر بھی رہا ہے۔ میں اس سے مل چکا ہوں۔ اچھی خاصی دوستی ہو گئی تھی۔ میں دو ایک بار اس کے کام بھی آیا ہوں۔"

ذرا دیر کی کھٹ کھٹ کے بعد رابطہ ملا۔ رابطہ ایسا تھا جیسے کسی دوسرے سیارے سے کال آئی ہو۔ دو منٹ بعد تسکین اپنے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھے چیخ چیخ کر ہنس رہی تھی۔ اس کے ہنسنے کی آواز نے مینجنگ ایڈیٹر ڈیڈ لیپ ہام کو متوجہ کر لیا جو اس وقت

راہداری سے گزر رہا تھا۔ وہ ایک لمحے ٹھٹکا پھر اس نے دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔

"کس سے بات ہو رہی ہے فون پر؟" اس نے پوچھا۔ "دوسری طرف جیری لوئیس ہے کیا؟"

عمر نے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "ایک اہم قاری کی کال ہے۔ یہ تو ریکارڈ ہونی چاہئے تھی۔ بلغراد سے وزیر محنت پوچھ رہے ہیں کہ انہیں دو دن سے ڈیلی ریوولوشن کیوں نہیں مل رہا ہے۔ ریوولوشن کے بغیر ناشتا بے کیف ہو کر رہ گیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ کشمیر میں نواز علی کیس کے سلسلے میں وہ صرف ہمارے اخبار پر اعتبار کرتے ہیں۔"

تسکین کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا آنکھیں خوشی سے ناچ رہی تھیں۔ "انہیں یہ نہیں معلوم کہ ان کے وزیر اطلاعات نے ریوولوشن پر پابندی عائد کر دی ہے۔" وہ بولی۔

ڈیڈ نے آنکھیں چمکاتے ہوئے کہا۔ "اور شاید تمہیں یہ معلوم نہیں کہ تم نے ادارتی صفحے پر روزن برگ کا جو آرٹیکل چھاپا تھا' پابندی اس کی وجہ سے لگی ہے۔"

عمراب بلغاروی وزیر محنت کو پابندی کے متعلق بتا رہا تھا۔ پھر وزیر محنت نے شاید نواز کیس کے بارے میں پوچھا کیونکہ عمر اسے نواز کیس کے بارے میں بتانے لگا۔ "تازہ ترین خبر یہ ہے کہ بھارتی وزیر داخلہ نے کہا ہے کہ اب ہر جاسوس اور دہشت گرد کو پھانسی دی جائے گی۔ اور ویکلاف سنو' اپنے منسٹر سے بات کر کے ہم پر سے پابندی ختم کرا دو۔ اچھا گڈبائی۔"

ریسیور رکھ کر وہ تسکین کی طرف متوجہ ہوا جو بہت خوش نظر آ رہی تھی لیکن عمر کے چہرے پر ایک سایہ سا لہرایا۔ اس نے کہا۔ "اب سوچتا ہوں کہ مجھے وہ آرٹیکل شائع نہیں کرنا چاہئے تھا۔"

"میرے خیال میں وہ اتنا سخت نہیں تھا۔" ڈیڈ نے خیال ظاہر کیا۔

"اتنا سخت بہرحال تھا کہ ہم پر ایک مارکیٹ بند کر دی گئی۔ ہمارے قائین کو ہماری غیر ذمے داری کی وجہ سے پریشانی اٹھانی پڑی۔ غلطی میری تھی۔"

تسکین جانتی تھی کہ وہ ایسا ہی ہے.......... ہر الزام خود پر لینے والا۔ اس کے لئے وہ اخبار' اس کا سرکولیشن اور یہ بات بہت اہم تھی کہ اس کا اخبار ہر جگہ پڑھا جائے۔

جس آرٹیکل کی وجہ سے اخبار پر پابندی لگی تھی' اس کے لئے تسکین نے ہی اسے اکسایا تھا اور اسے اس پر کوئی شرمندگی بھی نہیں تھی۔ اس لئے کہ کبھی کبھی عمر کی سرد مزاجی اور مقصدیت اسے اپنے لئے بہت بڑا بوجھ معلوم ہوتی تھی۔ حالانکہ اسی کے زور پر وہ مغربی یورپ میں ایک آزاد پاکستانی اخبار شائع کر رہا تھا۔

ڈیڈ نے کہا۔ "تم یقیناً نواز علی کی سزا کے متعلق شائع کرنا چاہو گے۔" وہ چند لمحے سوچتا رہا۔ "وہ لڑکا تیمور اس سلسلے میں بہت بپھرا ہوا ہے' سلگ رہا ہے بری طرح۔ ادارتی کمرے میں زبردست بحث ہو رہی تھی ابھی۔ تیمور اس سلسلے میں کچھ لکھنا چاہتا ہے۔ تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں؟"

"اس کی تحریر پر منحصر ہے۔" عمر نے مختصراً کہا۔

"مجھ سے اس نے بات کی تھی۔" تسکین نے جلدی سے کہا۔ "اس نے اصرار.......... میرا مطلب ہے' میں نے اپنے صفحے پر خالی جگہ چھوڑ دی ہے اس کے لئے۔ اگر مضمون اچھا ہوا تو.........."

عمر نے اسے متجسس نظروں سے دیکھا۔ وہ کچھ کہنے والا تھا مگر اس نے خود کو روک لیا۔

خاموشی کے اس خلا کو تسکین ہی نے بھرا۔ "ایک اعتبار سے میں سمجھ سکتی ہوں کہ وہ کس طرح محسوس کر رہا ہے۔ یہ بات ہلا دینے والی ہے کہ ایک ملک اپنے ایک شہری کے دفاع کے لئے کچھ بھی نہ کرے اور اس کے شہری کے ساتھ زیادتی.........."

"بشرطیکہ وہ بے قصور ہو۔" عمر نے بے رحمی سے کہا۔

ڈیڈ نے اسے حیرت سے دیکھا۔ "تو کیا تمہیں اس کے اعتراف جرم پر یقین ہے؟"

"میں کسی اعتراف جرم کو پوری طرح تسلیم نہیں کرتا۔" عمر نے خشک لہجے میں کہا۔ "لیکن کسی کو اندھا دھند پوری طرح بے قصور بھی نہیں سمجھتا اور پھر نواز علی شارٹ سروس کمیشن لے چکا ہے۔ کون جانے' الزام میں کسی حد تک صداقت ہی ہو۔ بہرحال' یہ بتاؤ کہ تیمور کا زاویہ نظر کیا ہے؟"

تسکین ایک طرف سر جھکا کر سوچنے لگی۔ جس وقت تیمور اسے بتا رہا تھا تو وہ

سب کچھ واضح اور درست معلوم ہو رہا تھا۔ یہ تیمور کی خصوصیت تھی۔ وہ جس بات کے حق میں بولتا' وہ اہم اور درست معلوم ہونے لگتی۔ اس بات کے پیچھے اس کا یقین اور گویا اس کے بھاری بھرکم وجود کا وزن بھی ہوتا تھا۔ اس کے سامنے مخالفت کرنے والے حقیر لگتے تھے لیکن تسکین اب اس کا مؤقف یاد کرنے کی کوشش کر رہی تھی تو پتا چل رہا تھا کہ اس سلسلے میں اسے کوئی ٹھوس بات یاد نہیں ہے۔ "اس کا کہنا ہے کہ اس سلسلے میں کچھ کیا جانا چاہئے۔" بال آخر وہ بولی۔ اس کے لہجے میں بے بسی تھی۔ اسے یہ احساس بھی تھا کہ اس کا شوہر عجیب انداز میں مسکرا رہا ہے۔ "عمر......... تم زیادتی کرتے ہو۔" اس نے جھنجلا کر کہا۔ "وہ بہت پُرجوش جوان ہے۔"

ڈیڈ نے پوچھا۔ "تو میں اسے آرٹیکل لکھنے کے لئے کہہ دوں؟"

"اس کو روکنا کوئی آسان کام نہیں ہوگا تمہارے لئے۔" عمر نے کہا۔ "اسے لکھنے دو۔ لائن سے باہر ہوگا تو روک دیا جائے گا۔ تسکین! تم اس جگہ کے لئے متبادل آرٹیکل تیار رکھنا۔"

تسکین کا منہ بن گیا۔ "میرے پاس روزن برگ کا ایک اور آرٹیکل موجود ہے۔ میرا خیال ہے' اس کی وجہ سے پراگ میں ہم پر پابندی لگ سکتی ہے۔ وہ چلے گا؟" یہ کہہ کر وہ اپنے آفس میں چلی گئی۔ عمر مسکرا رہا تھا لیکن اس کے جاتے ہی اس کا تاثر بدل گیا۔ اسے تیمور کے بارے میں تسکین کے لفظ یاد آئے......... "وہ بہت پُرجوش جوان ہے۔"

وہ سوچ رہا تھا کہ جوانی کی حدیں کہاں پر ختم ہوتی ہیں۔ آدمی کو پتا چلتا ہے کبھی کہ جوانی اسے ہمیشہ کے لئے چھوڑ کر رخصت ہو رہی ہے؟ اور کیا پُرجوش ہونا جوانی کی علامت ہے؟ کیا عورتیں......... بلکہ اور لوگ بھی اس کے حوالے سے جوانی کا تعین کرتے ہیں؟

عمر جاوید کی عمر چھیالیس سال تھی۔ وہ اوسط قدوقامت کا چاق و چوبند مرد تھا۔ اس کا جسم اب بھی توانائیوں کا سرچشمہ تھا۔ اس کے کندھے چوڑے تھے اور بازو مضبوط۔ وہ اپنی عمر سے بہت کم لگتا تھا۔ اپنے مضبوط جبڑے سے وہ فائٹر لگتا تھا لیکن بھوؤں کی بناوٹ اور آنکھوں سے ذہانت ظاہر ہوتی تھی۔ وہ محسوس کرتا تھا کہ وہ پُرجوش تو اب بھی ہے لیکن مارپیٹ اور جسم کے استعمال کا قائل نہیں رہا ہے۔ تسکین کا تبصرہ اسے ڈسٹرب کر رہا تھا۔ ایک ہفتہ پہلے اس نے یہی بات کہی ہوتی تو اس نے اس پر غور بھی نہیں کیا

ہوتا۔ تیمور کو پیرس آئے ہوئے ایک ہفتہ ہوا تھا۔ اسے مزید تجربے اور تربیت کے لئے یہاں بھیجا گیا تھا۔

لیکن عمر یہ اب بھی تسلیم نہیں کرنا چاہتا تھا کہ تسکین کے تبصرے پر اس کی پریشانی او تیمور کی آمد کا آپس میں کوئی تعلق ہے۔ اس کے باوجود جس وقت اس کی سیکریٹری نے آکر اسے اس کی طے شدہ ملاقاتوں کے بارے میں بتایا' تب بھی وہ تصور میں تیمور کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی چھا جانے والی شخصیت' وہ جسم جس کی موجودگی مین خاصا بڑا کمرا بھی چھوٹا لگنے لگتا تھا اور اس کا وہ اعتماد جو مخاطب کو اس کی ہر بات پر یقین دلا دیتا تھا۔

"تین بجے آپ کو پاکستانی سفارت خانے پہنچنا ہے۔" زرینہ کہہ رہی تھی۔ "اور پونے چار بجے فرانسیسی وزیر خارجہ کی پریس کانفرنس میں شرکت کرنی ہے۔"

عمر سوچ رہا تھا کہ تیمور سامنے ہو تو آدمی ایسی بے بسی محسوس کرتا ہے جیسے ٹینک کے مقابل کھڑا ہو۔

اس نے باہر نکلتے ہوئے تسکین کو بتایا کہ وہ پانچ بجے تک واپس آجائے گا۔ جواب میں تسکین نے سر اٹھائے بغیر ہاتھ ہلاتے ہوئے اسے خدا حافظ کہا۔ عمر جانتا تھا کہ جب سے تسکین نے ادارتی صفحہ سنبھالا ہے' وہ کتنی محنت کرتی ہے اور یہ بھی سچ تھا کہ اس نے اس صفحے کی ایک ساکھ بنا دی تھی۔

عمر کو وہ دن یاد آگیا جب اس نے تسکین کو پہلی بار دیکھا۔ وہ ۷۱ء کا نومبر تھا......... اور مقام ڈھاکا تھا۔ وہ اپنی جیپ میں بیٹھا محمد پور کے علاقے سے گزر رہا تھا کہ اس نے اس بچی کی گرمجوشی سے ہاتھ ہلاتے دیکھ کر جیپ روک دی۔ وہ اپنے گھر کے سامنے کھڑی تھی۔ عمر کو اس میں ایک غیر معمولی بات نظر آئی۔ وہ یقیناً کم عمر بچی تھی مگر اس کے چہرے کے نقوش بے حد پختہ تھے......... بے حد مکمل لگ رہے تھے۔ اس میں معصومیت بھی تھی اور وہ اپنی عمر سے بڑی بھی لگ رہی تھی۔

"میرا نام تسکین ہے......... تسکین ظفر۔" بچی نے بڑے اعتماد سے کہا۔ اسی لمحے دروازہ کھلا اور ایک ادھیڑ عمر شخص باہر نکلا۔ وہ یقینی طور پر اس بچی کا باپ تھا۔ "مجھے یقین ہے کہ آپ بہت بہادر آدمی ہیں۔" بچی نے مزید کہا۔ پھر پوچھا۔ "آپ کا نام کیا ہے

جناب؟"

"اے کینو' یہ کیا بدتمیزی ہے!" اس کے باپ نے اسے ڈانٹا۔ "انکل بولو نا۔" لہجے سے اندازہ ہو گیا کہ وہ بہاری ہے۔

"نہیں۔ یہ انکل لگتے ہی نہیں مجھے۔" بچی نے کہا۔ "آپ نے نام نہیں بتایا۔"

"میں کیپٹن عمر جاوید ہوں۔" عمر نے کہا۔

بچی نے خالص فوجیوں کے انداز میں اسے جس طرح سیلوٹ کیا' وہ عمر کبھی نہیں بھول سکا۔ قیدیوں کے کیمپ میں جنگی قیدیوں کی حیثیت سے بھی نہیں کیونکہ ایک ماہ بعد ہی پاکستانی فوجیوں نے ہتھیار ڈال دیے تھے۔

۷۴ء میں رہائی کے بعد وہ پاکستان آیا۔ فوج سے ناتا ٹوٹ گیا تو اس نے اپنے پرانے شوق یعنی لکھنے کی طرف توجہ دی۔ روزنامہ انقلاب میں سیاسی صوت حال پر اس کے کئی تجزیے اور تبصرے شائع ہوئے۔ بالآخر وہ اس روزنامے سے منسلک ہو گیا۔ وہاں اس کی چھپی ہوئی صلاحتیں سامنے آئیں اور بہت کم وقت میں اس نے خود کو منوا لیا۔

ایک روز وہ دفتر میں بیٹھا کام کر رہا تھا کہ اسے احساس ہوا' کوئی اسے بہت غور سے دیکھ رہا ہے۔ وہ کام میں لگا رہا۔ چند لمحے بعد میز کے قریب آتی ہوئی قدموں کی چاپ ابھری تو اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ عین اسی لمحے اس خوبصورت لڑکی نے خالص فوجیوں کے انداز میں اسے سیلوٹ کیا اور بولی۔ "آپ کیپٹن عمر جاوید ہیں نا؟"

عمر اسے ویسے نہیں پہچان سکتا تھا لیکن سیلوٹ کے بعد کسی شک و شبے کی گنجائش نہیں تھی۔ اس نے کہا۔ "ہاں' میں کیپٹن عمر جاوید ہوں اور تم تسکین ظفر ہو۔ ہے نا؟"

وہ بچوں کی طرح خوش ہو گئی۔ "آپ نے مجھے یاد رکھا' آپ نے مجھے پہچان لیا۔ کمال ہے! آٹھ سال کے بعد جبکہ........."

"میں نے تمہیں بہت چھوٹا سا دیکھا تھا۔" عمر نے اس کی بات اچک لی۔ "لیکن میں تمہیں بھول ہی نہیں سکتا تھا۔" اس نے اسے پاؤں سے سر تک بغور دیکھا۔ "تم بہت بڑی ہو گئی ہو۔"

اس کا چہرہ حیا سے تمتما اٹھا۔ "جی ہاں' بڑی ہو گئی ہوں میں۔"

"تمہارے ابو کیسے ہیں؟" عمر نے پوچھا۔

"ابو؟" اس کا چہرہ پہلے بے تاثر ہوا پھر اس پر اذیت کا سایہ لہرا گیا۔ "ابو کیا' وہاں تو کوئی بھی نہیں بچا۔ امی' بھیا' دونوں بہنیں......... سب مار دیئے گئے۔ میں اب بالکل اکیلی ہوں۔" یہ کہتے کہتے وہ وہی چھوٹی سی بچی بن گئی جسے عمر نے محمد پور میں دیکھا تھا۔ لیکن اس کی آنکھیں خشک ہی رہیں۔

"بات رسمی سی لگتی ہے لیکن سچ یہ ہے کہ یہ سن کر بہت دکھ ہوا ہے مجھے۔" عمر نے کہا۔ پھر بولا۔ "تم کہاں رہتی ہو؟ کیا کر رہی ہو آج کل؟"

رشتے کے ایک چچا ہیں......... ان کے ہاں قیام ہے۔" وہ بولی۔ "اور آج کل کام کی تلاش میں ہوں۔"

"تعلیم مکمل کی؟"

"جی ہاں۔ مشرقی پاکستان سے میں انگلینڈ پہنچی تھی......... نانا ساتھ تھے۔ وہاں گریجویشن کیا۔ نانا کا انتقال ہوا تو وطن واپس آ گئی۔"

"کہیں جاب کی کوشش کر رہی ہو؟"

"یہیں اخبار میں کام کرنا چاہتی ہوں۔"

عمر کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ "لیکن اس کام کے لئے تو تم بہت کم عمر ہو۔"

"آپ غلط سمجھ رہے ہیں۔ میری عمر اٹھائیس سال ہے۔"

عمر چکرا گیا۔ "یہ کیسے ممکن ہے! آٹھ سال پہلے تم مجھے ملی تھیں۔ اس وقت تم بیس سال کی تو نہیں تھیں۔"

"میں اس وقت بارہ سال کی تھی اور غریب الوطنی کے آٹھ اذیت بھرے سال' سولہ سال کے برابر ہوئے۔ اب آپ خود حساب لگا لیں۔" اس کے ہونٹوں پر زخمی مسکراہٹ ابھری۔

عمر کا دل بھر آیا اس کے لئے۔ "لیکن تسکین........."

"آپ یہاں کیا ہیں؟"

"ایڈیٹر ہی سمجھ لو۔"

"تو میرا یہ آرٹیکل پڑھ لیجئے۔" اس نے عمر کی طرف چند صفحات بڑھائے۔

عمر نے اس کے لئے چائے منگوائی اور خود اس کا آرٹیکل پڑھنے بیٹھ گیا۔ آرٹیکل

نے اسے حیران کر دیا۔ وہ بیس سالہ لڑکی کا لکھا ہوا تو نہیں لگتا تھا۔ موضوع تھا سیاست۔ مارشل لاء کے نفاذ اور بعد میں انتخابات کے التوا کے حوالے سے بڑی خوبصورتی سے صورت حال کا تجزیہ کیا گیا تھا۔

عمر نے وہ آرٹیکل رکھ لیا۔ دو دن بعد وہ شائع بھی ہو گیا۔ اس کے بعد تسکین نے چند اور آرٹیکل لکھے پھر وہ انقلاب کے ادارتی اسٹاف میں شامل ہو گئی۔ کچھ ہی عرصے میں عمر کو اندازہ ہو گیا کہ تسکین ایک بالغ لڑکی ہے۔ اس نے بارہ سال کی عمر میں موت کو بہت قریب سے دیکھا تھا۔ وہ آگ اور خون کا سمندر پار کر کے مشرق پاکستان سے نکلی تھی۔

دونوں غیر محسوس طریقے سے ایک دوسرے کے قریب آتے گئے۔ عمر نے ہچکچاتے ہوئے اسے پروپوز کیا تو تسکین نے اسے بتایا کہ اس نے تو پہلی ہی نظر میں اسے پسند کر لیا تھا......... بارہ سالہ بچی کے انداز میں نہیں' وہ ایک عورت کی پسند تھی۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ ایک دن کیپٹن عمر جاوید سے شادی کرے گی۔

شادی کے بعد بھی وہ دونوں اخبار میں کام کرتے رہے۔ اخبار اس وقت لندن اور نیو یارک سے شائع ہوتا تھا۔ پبلشر نے پیرس سے بھی اردو اور انگریزی میں اخبار شائع کرنے کا فیصلہ کیا تو قرعۂ فال عمر کے نام نکلا۔ تسکین بھی عمر کے ساتھ تھی۔ اس کی بے پناہ محنت نے اخبار' پیرس کو اشاعت کے اعتبار سے نیو یارک اور لندن کے انقلاب سے آگے پہنچا دیا۔ اس کامیابی میں اخبار کی پالیسی کا بہت زیادہ دخل تھا۔ اب تسکین' عمر کے لئے داہنے ہاتھ کی اہمیت رکھتی تھی۔ ویسے تو اس کے ذمے صرف ادارتی صفحہ تھا مگر عمر کسی ضروری کام سے کہیں جاتا تو وہ سارا کام سنبھال لیتی۔ عمر اس اعتماد سے جاتا کہ کام میں کوئی گڑ بڑ نہیں ہو گی۔

یہ سب کچھ سوچتے ہوئے عمر اپنی کار میں بیٹھا تو اس کے تصور میں ادارتی صفحے کی خالی جگہ لہرا رہی تھی۔ وہ دو کالمی سوراخ جسے تسکین' تیمور کے تجزیے سے بھرنے کا ارادہ رکھتی تھی۔ وہ تجزیہ جو مقبوضہ کشمیر میں پکڑے جانے والے پاکستانی نواز علی کی سزا سے متعلق تھا۔

☆============☆============☆

ادارتی کمرے میں نیلوفر ریاض نووارد تیمور حسین کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ وہ سادہ سی بے کشش لڑکی تھی۔ اس نے برسوں پہلے اپنی شکل و صورت کے معمولی پن سے سمجھوتا کر لیا تھا اور اس خلا کو اپنی فطرت کی نرمی اور مہربانی سے بھر دیا تھا۔ وہ لوگوں کے کام آ کر خوش ہوتی تھی۔ چنانچہ کوئی بھی اپنا کام اس پر تھوپنے میں ذرا بھی نہیں ہچکچاتا تھا۔ کوئی اسے سگریٹ لانے یا کافی کا آرڈر دینے کے لئے بھیج دیتا تو کوئی اس سے اپنی بیوی کو فون کروا دیتا کہ وہ دیر سے گھر آئے گا۔

نیلوفر نے پلٹ کر تیمور کی طرف دیکھا جو ٹائپ رائٹر کو یوں پیٹ رہا تھا جیسے اس سے اندر دہکتی ہوئی آگ سرد ہو جائے گی۔ اسے دیکھ کر نیلوفر کو اس کے ناقابلِ تسخیر ہونے کا احساس ہوتا تھا۔ یہ احساس پہلے کبھی کسی کو دیکھ کر نہیں ہوا تھا۔

سٹی ایڈیٹر صدیق نے ٹیلی فون کریڈل پر رکھا۔ سامنے رکھی کاپی پر کچھ اضافہ کیا اور پکارا۔ "گرشا......... گرشا کو دیکھا ہے کسی نے؟"

بینچ پر بیٹھا ہوا یورپی جس کا مظہر ایسا تھا جو دیکھے' کبھی نہیں بھولے' نیم استادہ ہو گیا۔ اس کے ہاتھ میں سگریٹ کا ایک ٹکڑا تھا' جس میں اس نے پن لگائی ہوئی تھی تاکہ اسے آخری حد تک پی سکے۔ ایک ملگجا رین کوٹ بینچ پر اس کے پاس ہی رکھا تھا۔

صدیق نے اسے دیکھا۔ "ہاں......... ذرا یہ تو بتاؤ' وہ کون شخص ہے جسے ۵۰ء میں رومانیہ کی حکومت سے نکالا گیا تھا۔"

یہ عجیب بات تھی کہ گرشا کو جب بھی مخاطب کیا جاتا' اس کا جسم تن جاتا۔ تاہم جواب دیتے ہوئے اس کی آنکھوں میں چمک ہوتی تھی۔ "اس کا نام جین پاپلیسکو تھا۔ وہ ۵۹ء سے مارچ ۵۰ء تک وزیر زراعت رہا تھا۔" اس نے بتایا۔ "اس کا تعلق دہقان پارٹی سے تھا۔"

"شکریہ گرشا۔" صدیق نے بے پروائی سے کہا......... اور دوبارہ کاپی پر جھک گیا لیکن اب گرشا اپنے بے وقعتی کے زنداں میں واپس جانے کو تیار نہیں تھا۔ وہ بینچ چھوڑ کر صدیق کی طرف بڑھا۔ اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "میں آپ کو ایک اہم شخصیت کے بارے میں زبردست اسٹوری دے سکتا ہوں......... صرف پانچ ہزار فرانک کے عوض اور یہ بات میرے علاوہ کوئی نہیں جانتا پلیز......... مجھے موقع دیں۔"

صدیق نے یوں نظریں اٹھا کر اسے دیکھا جیسے اس مداخلت سے بدمزہ ہو گیا ہو۔ وہ مشرقی یورپ کے ان لوگوں کو اب تک ذہنی طور پر قبول نہیں کر پایا تھا جو انفارمرز کی حیثیت سے اخبارات کے دفاتر میں دھرنا دیے رہتے تھے۔ وہ چند سکوں کے عوض کوئی افواہ' کسی کی ساکھ' حتیٰ کہ کسی کی زندگی بھی فروخت کر دیتے تھے۔ تاہم وہ جانتا تھا کہ گرشا کبھی غلط اطلاعات فراہم نہیں کرتا۔ اس وقت بھی گرشا اس کی میز پر جھکا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں میں التجا تھی۔ حلق کا کنٹھا بری طرح متحرک تھا۔

"یہ اسٹوری چیکوسلواکیہ کے ایک پادری سے متعلق ہے جسے فرانسیسیوں نے بچایا تھا۔ اور.........." اتنا کہہ کر گرشا جھکا اور اس نے اپنے ہونٹ صدیق کے کان سے تقریباً ملا دیئے۔

صدیق سنتا رہا پھر اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "اس اطلاع کے پانچ ہزار فرانک! نہیں۔ میں تمہیں دو ہزار دلوا دوں گا۔"

گرشا نے ایک لمحے کو خاموشی سے صدیق کو دیکھا پھر کندھے جھٹک دیئے۔ دوبارہ جھکتے ہوئے صدیق کو سرگوشی میں تفصیل بتانے لگا۔ صدیق سامنے رکھے پیڈ پر سب نوٹ کرتا رہا پھر اس نے نظر اٹھا کر فائلنگ کیبنٹ پر جھکی نیلوفر کو دیکھا جو اپنی ناک پر پھسل آنے کے عادی چشمے کو انگلی سے اوپر دھکیل رہی تھی۔ "نیلوفر.......... اچھی بچی۔" اس نے پکارا۔ "ذرا فائلوں میں فادر ریسنک کے بارے میں دیکھو۔ وہ ایک زمانے میں پراگ میں پاپائی سیکریٹری تھا۔"

"ابھی لو۔" نیلوفر نے کہا اور جو کچھ کر رہی تھی' اسے بھول کر اس تلاش میں لگ گئی۔ وہ خود کار انداز میں فائلیں ٹٹول رہی تھی لیکن اس کے ذہن میں خیال تیمور کا تھا۔ تیمور جس کا جسم چٹان کی طرح تھا' جس کے سامنے رکھا ٹائپ رائٹر کھلونا نظر آتا تھا۔ وہ ٹائپ رائٹر پر انگلیاں یوں چلا رہا تھا جیسے کوئی باکسر رِنگ میں اپنے حریف پر گھونسے برسا رہا ہو۔ نیلوفر کو یہ خیال تھا کہ تیمور نے اب تک اسے نظر بھر کر بھی نہیں دیکھا۔ جیسے اسے اس کے وجود کا احساس ہی نہیں ہے۔

نیلوفر نے اس کی آواز سنی تو پلٹ کر دیکھا۔ تیمور نے ٹائپ رائٹر سے ہاتھ اٹھا لیا اور پلٹ کر اپنی گونج دار آواز میں کہہ رہا تھا۔ "یقیناً وہ کوئی نشہ آور دوا دیتے ہوں گے

لیکن جب تک معلوم نہ ہو' یہ بات لکھی کیسے جا سکتی ہے۔"

دوسرے لوگ خاموشی سے سنتے رہے اس لئے کہ وہ ان کی بے چینیوں کو اجاگر کر رہا تھا' وہ سوالات اٹھا رہا تھا جنہوں نے نواز علی کی مقبوضہ کشمیر میں گرفتاری کے بعد ان سب کو پریشان کر رکھا تھا۔

"اگر کوئی نشہ آور دوا نہیں دی گئی تو اس نوع کا تشدد کیا گیا جس نے کوئی نشان نہیں چھوڑا۔" تیمور اپنی کہتا رہا۔ "نواز علی پاکستانی ہے لیکن اس نے اعتراف جرم اس انداز میں' اس لب و لہجے میں کیا ہے جو بھارت کے پروپیگنڈے کا خاص انداز ہے۔ اگر وہ جاسوس ہے تو ہم یہ کہیں گے اس نے کھلی غداری کی ہے۔ اپنے دوستوں کو بھارتیوں کے ہاتھ بیچ دیا۔ ہماری انٹیلی جنس میں خامیاں ہیں لیکن اس کے آدمی اتنے کمزور نہیں کہ دوستوں کو بیچ دیں۔ ان سے یوں اعتراف جرم نہیں کرایا جا سکتا۔ یہ اعتراف تو مجھ سے بھی نہیں کرایا.........."

وہ شیخی معلوم ہوتی تھی لیکن تھی نہیں۔ لگتا تھا کہ وہ تجزیہ کر رہا ہے اور خود کو بہت اچھی طرح جانتا ہے۔ وہ کوئی جذباتی گفتگو نہیں تھی۔ نیلوفر نے جو بدستور فائلیں ٹٹول رہی تھی' اس کی بات پر فوراً یقین کر لیا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اس پہاڑ جیسے آدمی کو تو بدترین تشدد بھی نہیں توڑ سکتا۔ شاید مہینے لگیں گے اسے توڑنے میں۔ اس کے گوشت اور ہڈیوں کو پار کر کے اس کی روح تک پہنچنا مہینوں کا کام ہو گا لیکن ساتھ ہی اس پر تشدد کا تصور کر کے نیلوفر کا دل بگڑنے لگا۔

"ٹھیک کہتے ہو۔" وقار نے کہا۔ "لیکن اگر وہ تمہیں اس جرم کا اعتراف کرنے پر مجبور کر دیں جو تم نے نہیں کیا تو..........؟"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ یہ تو مفروضہ ہے۔" تیمور نے کہا۔ "ہم نواز علی کے متعلق بات کر رہے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ وہ جاسوس نہیں تھا۔ یہاں موجود مسخروں میں سے کسی کو تو معلوم ہونا چاہئے کہ ایک عام شخص سے جاسوس ہونے کا اعتراف کیسے کرایا گیا۔" یہ کہتے ہوئے اس کی نظر گرشا پر پڑی جو صدیق کو اسٹوری کی تفصیلات بتانے کے بعد اس کی میز سے پلٹ رہا تھا۔ صدیق نے کیشئر کو ہدایت دے دی تھی کہ اسے دو ہزار فرانک دے دے۔

"ادھر.......... تم سنو۔" تیمور نے بڑی بے رحمی سے چیخ کر اسے مخاطب کیا۔ انداز میں حقارت تھی۔ "تم کہاں کے ہو؟"

"گرشا کیشئر کی طرف بڑھتے بڑھتے یوں رک گیا جیسے تیمور نے اسے تھپڑ مار دیا ہو۔ اس کی رنگت زرد پڑ گئی اور ہونٹ پھڑپھڑانے لگے۔ اس نے بڑی کوشش کر کے اس بہت تھوڑے سے وقار اور عزت نفس کو بحال کیا جو تیمور کے استفسار نے اس سے چھین لیا تھا۔ "میرا تعلق براسو سے ہے۔" اس نے جواب دیا۔

تیمور نے دہرایا۔ "براسو۔" نواب مسکرایا۔ تیمور کو اندازہ ہی نہیں تھا کہ براسو کہاں واقع ہے۔ وہ تیمور کی بے خبری اور بے بسی سے لطف اندوز ہو رہا تھا لیکن وہ زیادہ دیر لطف اندوز نہ ہو سکا کیونکہ تیمور نے اپنی بے خبری کی رکاوٹ کو ایک طرف ہٹاتے ہوئے گرشا سے کہا۔ "تم نے تو دنیا دیکھی ہے' بتاؤ کہ آہنی پردے کے پیچھے ایسے معاملات میں کیا کچھ ہو رہا ہے؟ بتاؤ تم لوگ کسی کے ناخن اکھیڑے بغیر اسے مادر وطن کے خلاف بیان دینے پر کیسے مجبور کرتے ہو۔ بتاؤ مجھے۔ بتاؤ اس کی ترکیب کیا ہے؟" اب وہ چلا رہا تھا۔ اس کے ذہن میں یہ غلط تصور اسے چیخنے پر مجبور کر رہا تھا کہ جن لوگوں کی مادری زبان انگریزی نہیں ہوتی' انہیں صرف اسی طرح کچھ سمجھایا جا سکتا ہے اور اپنے سوال پر زور دینے کے لئے وہ گرشا پر تن کر کھڑا ہو گیا۔ گرشا' بے چارے کو لگا کہ اس کے سر پر ایفل ٹاور گرنے والا ہے۔

بڑی کوشش کے بعد گرشا نے وہ طلسم توڑا جس میں وہ گرفتار ہو گیا تھا۔ اس نے تیمور کے چہرے سے نظریں ہٹائیں اور پلٹا۔ "میں کچھ نہیں جانتا۔" اس نے کہا۔ "آئی ایم سوری۔ میں آپ کی مدد نہیں کر سکتا۔ ایکسکیوز می پلیز!" یہ کہہ کر وہ تقریباً بھاگتا ہوا بینچ تک پہنچا جہاں اس نے اپنا رین کوٹ چھوڑا تھا۔ رین کوٹ اٹھا کر وہ تیزی سے کمرے سے نکل گیا۔

"ارے.......... اس چوہے میں کوئی بد روح گھس گئی تھی کیا؟" تیمور بڑبڑایا۔ "یہ اسے کیا ہوا؟"

"کوئی خاص بات نہیں۔" نواب نے کہا۔ "اس پر بھی اس سے ملتی جلتی کچھ گزری ہو گی۔ تم نے اسے بری طرح ڈرا دیا۔"

"وہ پھر واپس آئے گا۔" صدیق نے نہایت اطمینان سے کہا۔ "پیسے کی خاطر وہ کچھ بھی کر سکتا ہے۔"

پہلی بار تیمور کو احساس ہوا کہ بغیر کسی وجہ کے کمرے کے بیچوں بیچ کھڑا وہ احمق لگ رہا ہو گا۔ اب پلٹ کر اپنی میز پر جانے کا مرحلہ اسے شرمندگی کا لگ رہا تھا۔ دوسری طرف وہ بدشکل' پچکی ہوئی لڑکی ہاتھ میں ایک فولڈر لئے سٹی ڈیسک کی طرف جا رہی تھی.......... اور وہ اس کے راستے میں کھڑا تھا۔ ایک طرف ہٹ کر اسے راستہ دینا بھی عجیب لگتا۔ وہ اور تماشا بن جاتا۔ چنانچہ وہ پلٹا اور ادارتی کمرے کے عقبی دروازے سے باہر لفٹ کی طرف چلا گیا۔

لابی میں پہنچ کر اس نے سوچا کہ اوپر کلب بار میں جا کر کچھ پئے لیکن اسی وقت اسے ڈیڈ لیپ ہام کے آفس سے تسکین نکلتی نظر آئی۔ اس کے ہاتھ میں اپنے صفحے کا پروف تھا۔ وہ اسے دیکھ کر مسکرائی۔ "ہیلو تیمور تمہارا آرٹیکل کیسا جا رہا ہے؟"

اسے دیکھ کر تیمور کو خوشی ہوئی۔ اس سے تنہائی میں ملنے.......... بات کرنے کا بہانہ مل گیا۔ "بہت خراب جا رہا ہے۔" اس نے تندی سے کہا۔

تسکین پریشان ہو گئی۔ ادارتی صفحے کے دو کالمی خلا نے اسے پریشان کر دیا۔

"یہ نہ سہی لیکن ایک اور موضوع ہے جس پر میں لکھ سکتا ہوں.......... اور لکھوں گا۔ میں پاکستان کے محکمہ خارجہ اور بھارت میں پاکستانی سفیر کی طبیعت سے کھنچائی کروں گا۔ ان لوگوں نے بھارتی حکومت کی مذمت میں زبان تک نہیں کھولی ہے۔ ایک معصوم پاکستانی عذاب جھیل رہا ہے اور انہیں کوئی پروا نہیں۔ اس غریب کی کسی کو بھی پروا نہیں۔"

"لوگوں کو پروا ہے۔ بہت لوگ بڑی گہرائی سے پروا کرتے ہیں لیکن وہ کچھ کر نہیں سکتے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کریں۔" تسکین نے کہا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ ایک ایسے آرٹیکل پر عمر کا کیا ردعمل ہو گا جس میں پاکستان کی وزارت خارجہ کو لتاڑا گیا ہو۔

تیمور نے اپنی بلندی سے نظر جھکا کر تسکین کو دیکھا۔ جانے کیا بات تھی کہ تسکین کی موجودگی میں اس کا اعتماد رخصت ہو جاتا تھا اور ہوش و حواس ساتھ چھوڑتے محسوس

ہوتے تھے۔ اس نے کہا۔ "تسکین......... آج ڈنر میرے ساتھ کر سکیں گی آپ؟"

تسکین نے نظریں اٹھا کر اسے تعجب سے دیکھا۔ "کیا مطلب؟ ابھی پچھلی رات تو میں نے ڈنر کیا ہے تمہارے ساتھ.........اور اس سے دو دن پہلے بھی........."

"کیوں؟ کیا عمر صاحب کو برا لگے گا؟"

تسکین کو اس سے پہلے یہ خیال ہی نہیں آیا تھا کہ یہ بات عمر کو بری لگ سکتی ہے۔ "میں عمر کی بیوی ہوں اور انہیں مجھ پر اعتماد ہے" بالآخر وہ بولی۔

"ایک بات بتاؤں۔ میں آپ کو دیکھتا ہوں تو آپ مجھے شادی شدہ نہیں لگتیں۔"

تیمور نے کہا اور یہ سچ تھا۔ جب اس نے تسکین کو پہلی بار دیکھا تھا تو اسے عمر جاوید کی بیوی سمجھنے سے ہمیشہ کے لئے انکار کر دیا تھا۔ وہ عمر کو باس اور ایڈیٹر مانتا تھا' یہ بھی تسلیم کرتا تھا کہ اسے ایک حد تک عمر کے احکامات کی پیروی کرنی ہے لیکن تسکین کے شوہر کی حیثیت سے اس کے نزدیک عمر کا وجود ہی نہیں تھا۔ اس نے عمر کو جسمانی اور ذہنی سطح پر ناپا تھا اور اسے خود سے کمتر انسان قرار دے کر نظرانداز کر دیا تھا۔ اس کے بعد وہ تسکین کو اٹھارہ سالہ کنواری لڑکی سمجھنے میں حق بہ جانب تھا۔

تسکین نے کہا۔ "تو میں شادی شدہ نہیں لگتی.........؟"

"یہ بات نہیں۔" تیمور نے بے بسی سے کہا۔ "تسکین' میں سوچتا ہوں کہ کاش میں........."

تسکین نے دل میں سوچا......... مجھے پہلے ہی سمجھ لینا چاہئے تھا کہ یہ مجھ سے محبت کرتا ہے' اس نے اس کی بات پوری نہیں ہونے دی۔ "میں چلتی ہوں۔ کام بہت پڑا ہے۔" درحقیقت وہ خوفزدہ ہو گئی تھی لیکن وہ خوف اس کے لئے پُرکشش بھی تھا۔ وہ اس کے جثے' اس کی شدت اور اس کی طاقت سے خوفزدہ تھی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ اس سے محبت کرتا ہے اور پوری شدت سے اس کی طرف بڑھے گا اسے حاصل کرنے کے لئے اور راستے کی ہر رکاوٹ کو ہٹا دے گا۔ ایسے طاقت ور لوگوں کی انا بہت توانا ہوتی ہے۔ ان کی خواہشات انہیں اندھا کر دیتی ہیں۔ تسکین خود بھی متضاد کیفیات کی شکار تھی۔ وہ ان خصوصیات سے گھبراتی بھی تھی اور ان میں کشش بھی محسوس کرتی تھی اس لئے کہ وہ خصوصیات فطری......... جبلی تھیں۔ وہ سمجھتی کہ تیمور خود کو بھی پوری طرح

نہیں سمجھتا۔ وہ خود کو شاید بے ضرر سمجھتا تھا' جیسے سدھایا ہوا ریچھ۔ وہ پسے ہوئے لوگوں کو تحفظ دینا چاہتا تھا لیکن وہ ایسا تھا کہ جو اس کے راستے میں آتا' وہ اسے کچل کر آگے بڑھ جاتا۔ اس کی برہمی' اس کی مثالیہ پسندی سچی تھی۔ کوئی ایسے شخص کے سامنے ایک لمحے کے لئے بھی غیر محتاط ہو جائے تو.........

اسی وقت ڈیڈ اپنے ہاتھ میں صفحہ نمبر۲ اور ۳ کے لے آؤٹ لئے اپنے آفس سے نکلا۔ وہ تیمور کو دیکھ کر خوش دلی سے مسکرایا۔ "تمہارا آرٹیکل تیار ہو گیا؟" اس نے پوچھا۔ "مسز عمر اب اپنا صفحہ نمبر چھ مکمل دیکھنا چاہیں گی۔"

یوں وہ خطرناک صورت حال ٹل گئی۔ ڈیڈ کے منہ سے مسز عمر سن کر تیمور کو ایسا لگا جیسے اسے تھپڑ مار دیا گیا ہے۔ "میں ابھی آرٹیکل مکمل کر کے تسکین کو دیتا ہوں۔" اس نے تسکین کے نام پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "میں چلا" یہ کہہ کر وہ ادارتی کمرے میں چلا گیا۔

☆============☆============☆

پاکستانی سفارت خانے اور فرانسیسی وزارت خارجہ کے دفتر میں ہونے والی کانفرنسیں منفی اور آف دی ریکارڈ ثابت ہوئیں۔ پاکستانی سفیر کی کانفرنس میں اتنا ہوا کہ نواز علی کیس پر بولنے کا موقع دیا گیا۔ سفیر صاحب نے آزادی صحافت کے متعلق خوب گفتگو کی لیکن آخر میں درخوست کی کہ یہ سب کچھ چھاپا نہ جائے۔ ان کا کہنا تھا کہ صورت حال بہت نازک ہے۔ پاکستان پر امریکا کا دباؤ بڑھ گیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ برصغیر پر جنگ کے بادل منڈلانے لگے ہیں۔

"مطلب یہ ہے کہ ایک آدمی کی خاطر دس کروڑ افراد کو خطرے میں نہیں ڈالا جا سکتا؟" عمر نے کہا۔

سفیر صاحب کے ہونٹوں پر سرد مسکراہٹ نظر آئی۔ "میں نے ایسی کوئی بات نہیں کی۔"

فرانسیسی وزیر خارجہ کی پریس کانفرنس بھی لاحاصل رہی۔ وہ مغربی اقوام کے معاہدہ دفاع کی میٹنگ میں شرکت کے متعلق بتاتے رہے۔ انہوں نے نواز کیس کا تذکرہ تک نہیں کیا۔ عمر کا جی چاہا کہ کہے......... اگر بھارت یا کوئی اور ملک تمہارے کسی

معصوم شہری پر ایسا ظلم کرے تو تم کیا کرو گے لیکن اس نے اپنی زبان کو سختی سے قابو میں رکھا۔ ڈپلومیٹ اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ انہیں اخباری نمائندوں کے مجمعے میں کسی مصیبت میں پھنسایا جائے اور عمر کے لئے سب سے دشوار کام یہی تھا کہ ڈپلومیٹس کو خوش رکھا جائے۔ خاص طور پر فرانسیسی ڈپلومیٹس کو۔ اس کا اخبار فرانس میں مہمان اخبار تھا.......... یعنی روزنامہ انقلاب پاکستان کا پیرس ایڈیشن۔ یہ حکومت فرانس کی مہربانی تھی کہ وہ اسے اخبار نکالنے دے رہے تھے۔ در حقیقت عمر پر کوئی پابندی نہیں تھی کہ کیا چھاپے اور کیا نہ چھاپے لیکن اسے احساس تھا کہ حکومت فرانس ذرا سی بھی غیر ذمے داری' خواہ وہ غیر ذمے داری ہی نہ ہو' برداشت نہیں کرے گی۔

وہ آہستگی سے ڈرائیو کرتا ہوا ایونیو جارج ففتھ پہنچا۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ بوجھ بہت زیادہ ہے۔ اشاعت میں ذرا سی کمی پر پاکستان میں پبلشر کا منہ بن جاتا۔ وہ تو ویسے ہی شکایت کرتا تھا کہ پیرس ایڈیشن کے اخراجات بہت زیادہ ہیں۔ پھر وہ قارئین کو بھی اپنی ذمے داری سمجھتا تھا۔ وطن سے دور' وطن کو ترسے ہوئے لوگ اس کے اخبار کے ذریعے وطن کے متعلق جان لیتے تھے۔ اس کے لئے ضروری تھا کہ اخبار کی اشاعت کا تسلسل نہ ٹوٹے۔

دفتر کے قریب پہنچتے پہنچتے اسے اندازہ ہو گیا کہ وہ اس قدر چڑچڑا کیوں ہو رہا ہے۔ چڑچڑے پن کا اصل سبب تو تیمور حسین ہی تھا۔ وہ شاید نیویارک سے انقلاب' پیرس کو سدھارنے کا ارادہ لے کر آیا تھا۔ نیویارک سے آنے والے سبھی لوگ اسی طرح کے ہوتے تھے۔ وہ یہاں آتے' ان کے نظریات ٹوٹتے۔ پھر یا تو وہ عقل پکڑتے' تجربہ حاصل کرتے یا رخصت ہو جاتے۔ یا تو وہ آتے ہی پورے سسٹم کو بدلنے اور انقلاب لانے کی کوشش کرتے یا پولیس کا رول سنبھال لیتے۔ ان کے عزائم بہت زیادہ بلند ہوتے تھے۔ وہ صحافت کی دنیا میں ایک دم بہت بڑا نام کمانے کی کوشش کرتے۔ یہ بھی عمر کے فرائض کا ایک حصہ تھا کہ وہ ان لوگوں کو زندگی اور صحافت کے یورپی حقائق سے روشناس کرائے۔

اسے احساس تھا کہ تیمور حسین اس کے لئے زیادہ بڑا مسئلہ ہے۔ اس لئے کہ وہ دوسروں سے زیادہ اہلیت رکھتا تھا۔ عام صورت حال میں تو وہ اس بات پر یقین رکھتا کہ

اسٹاف کے لوگ ہی نوواردوں کو ٹھیک کر دیں گے۔ اخبار کی تنظیم اخبار کی ضرورت کے عین مطابق تھی۔ ایک یہ بات بھی تھی کہ اسے مسابقت کا سامنا نہیں تھا۔ تمام کام کرنے والے سیٹ تھے اور باہر سے آنے والا کوئی بڑبولا انہیں ڈسٹرب نہیں کر سکتا تھا۔

لیکن تیمور ایک مختلف آدمی تھا۔ وہ نہ صرف جوان تھا بلکہ قوت اور اولوالعزمی کی علامت تھا۔ عمر جانتا تھا کہ اسٹاف کے کچھ جوان لوگوں کو اس نے بہت زیادہ متاثر کیا ہے' وہ اس بات سے بھی واقف تھا کہ اس کا سٹی ایڈیٹر صدیق بھی متاثر ہونے والوں میں شامل ہے۔ مقامی پالیسی اور کوریج کے مروجہ اصولوں کے متعلق اس کے ذہن میں شبہات ابھرنے لگے ہیں.......... اور وہ کارکردگی بڑھانے کے لئے سنسنی خیز اسٹوریز اور نئے زاویوں کی تلاش میں لگ گیا ہے۔ یعنی بیماری وبا کی طرح پھیل رہی تھی۔

کار سے اترتے وقت اس کے ذہن میں ایک اور خیال آیا۔ اب تو وہ خود بھی اپنی پالیسیوں کے بارے میں سوچنے لگا تھا کہ وہ ٹھیک ہیں یا نہیں۔ آخر وہ کس قسم کا اخبار شائع کر رہا ہے۔ کیا وہ ایک محتاط لیکن کھلے ذہن کا ایڈیٹر ہے جو اپنے فرائض بخوبی انجام دے رہا ہے یا وہ مدافعانہ طرز عمل رکھنے والا ادھیڑ عمر شخص ہے جو یورپ کے مقابلے میں احساسِ کمتری میں مبتلا ہے جو اپنا عرصہ جوانی بھول چکا ہے' جب وہ بھی صحافی تھا۔

انقلاب کا پیرس ایڈیشن ہمیشہ ٹھیک وقت پر پریس پہنچا دیا جاتا تھا اور دفتر میں کبھی افراتفری نہیں ہوتی تھی۔ یہ صرف ایسے اخبار کے لئے ممکن ہے جہاں اسٹاف میں ڈسپلن ہو اور نیوز ایڈیٹر اور چیف آف کاپی ڈیسک اپنے کام میں طاق ہوں۔

عمر شام چھ بجے دفتر پہنچا تو تسکین کی میز پر کوئی ادھورا کام نہیں تھا۔ دونوں رپورٹر وقار اور زبیر اپنا کام ختم کر کے گھر جانے کی تیاری میں مصروف تھے۔ اکبر اپنے شعری مجموعے کے سلسلے میں مصروف تھا' جس پر وہ فارغ وقت میں کام کرتا تھا۔ نیلوفر ٹریول ڈیپارٹمنٹ کے مسٹر اسٹافورڈ کا ہاتھ بٹا رہی تھی جو موسم بہار کے ٹریول سپلیمنٹ کے لئے خصوصی ڈیزائن تیار کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

عمر ایک نظر میں اخبار کی پوری صورت حال سمجھ لیتا تھا۔ ریکارڈنگ بوتھ میں نینی میلٹ اپنے سر پر' ائرفون چڑھائے مصروف تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ باہر سے کسی نمائندے کی رپورٹ آنے والی ہے اور ممکن ہے کہ وہ رپورٹ پہلے ایڈیشن میں شاملِ

اشاعت ہو۔ نیوز ڈیسک اور کاپی ڈیسک کی صورت حال اطمینان بخش تھی۔ کمرے میں سرگرمی کی بس ایک ہی علامت تھی.......... تیمور کے ٹائپ رائٹر کی کھٹ کھٹ.......... اور وہ بڑے زور شور سے ٹائپ کر رہا تھا۔ تسکین اس کے پاس کھڑی ٹائپ شدہ صفحات پڑھ رہی تھی۔ عمر نے اس کے چہرے کے تاثر کا اندازہ کرنے کی کوشش کی لیکن وہ یہ فیصلہ نہیں کر سکا کہ ان صفحات نے تسکین کو متاثر کیا ہے یا پریشان۔

نواب نے سر اٹھا کر عمر کو دیکھا۔ "ہیلو عمر! اس پھانسی کے بیان کے متعلق کیا ارادہ ہے..........؟"

عمر نے پروف اٹھا کر اس خبر کا جائزہ لیا۔ بھارتی وزیر داخلہ کا بیان پڑھ کر اس کا جی چاہا کہ اس خبر کو پھاڑ ڈالے لیکن وہ جذباتی رد عمل تھا۔ "اسے پہلے صفحے پر لگانا۔" اس نے نواب کو ہدایت دی۔ "ایک کالمی باکس میں" پھر وہ شکور کی طرف مڑا۔ "فرانسیسی وزیر خارجہ سے کچھ نہیں ملا ہے۔" پھر وہ تسکین کی طرف بڑھا۔ "کیسا جا رہا ہے؟" اس نے پوچھا۔ تیمور نے جانے سنا یا نہیں۔ بہرکیف اس نے ٹائپ رائٹر سے سر نہیں اٹھایا.......... اور بدستور ٹائپ رائٹر کو کوٹتا رہا۔

تسکین نے کوئی جواب دینے کے بجائے وہ صفحات عمر کی طرف بڑھا دیے۔ وہ تین ورق تھے جن میں تیمور کی اسٹوری کا پہلا حصہ تھا۔ عمر نے مستفسرانہ نظروں سے تسکین کو دیکھا۔ ان کے درمیان زبردست انڈرسٹینڈنگ تھی اور وہ بغیر لفظوں کے بھی ایک دوسرے کی بات سمجھ لیتے تھے لیکن اس وقت تسکین نے نظروں سے اسے جواب نہیں دیا۔ بلکہ اس نے اپنا چہرہ بے تاثر رکھنے کی کوشش کی۔ یعنی وہ یہ چاہتی تھی کہ عمر خود پہلے سے کوئی رائے قائم کیے بغیر اس آرٹیکل کو پڑھے۔ عمر کا اندازہ تھا کہ تسکین کچھ نروس ہے۔ بلکہ وہ اس آرٹیکل کے بارے میں اس کی رائے کے لئے فکر مند تھی۔

عمر میز کے کنارے پر ٹک گیا اور ٹانگیں پھیلا کر آرٹیکل پڑھنے لگا۔

آرٹیکل میں نواز علی کے کردار کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا گیا تھا۔ نفرت اور برہمی ہر لفظ سے جھلک رہی تھی۔ اس میں ان ممکنہ طریقوں پر بحث کی گئی تھی جن کے تحت ایک بے قصور پاکستانی سے ان جرائم کا اعتراف بھی کرا لیا گیا جو اس نے نہیں کئے تھے۔ آرٹیکل میں حکومت پاکستان کو اس کی کمزوری اور بے حسی پر بری طرح لتاڑا گیا تھا۔ عالمی

برادری اور خصوصاً امریکا سے اس کی عالمی چوہدراہٹ کے حوالے سے اپیل کی گئی تھی کہ وہ ایک بے قصور انسان کو اس ناجائز قید سے رہائی دلائے۔ اس میں بیشتر باتیں وہ تھیں جو عمر خود بے حد تلخ انداز میں سوچتا رہا تھا لیکن وہ اس کی انفرادی سوچ تھی۔ ایک ایڈیٹر کی حیثیت سے وہ اسے دوسروں تک پہنچانا مضر سمجھتا تھا۔ اس نے تنقیدی نقطہ نظر سے آرٹیکل پر غور کیا تو پتا چلا کہ نہ اس میں کوئی خبر ہے' نہ کوئی تشریح۔ وہ تو اعلان جنگ تھا جسے وہ خواب میں بھی نہیں چھاپ سکتا تھا۔

اس نے صفحات کو انگلیوں میں تھام کر ہاتھ سے اشارہ کیا۔ وہ جانتا تھا کہ تسکین اسے سمجھ جائے گی۔ اسے لگا کہ اس نے تسکین کی آنکھوں میں مایوسی دیکھی ہے مگر تسکین کے کندھے سے جو اس کی نظر اٹھی تو اس نے خود کو نیلوفر کی آنکھوں میں دیکھتے پایا۔ اسے حیرت ہوئی۔ ان آنکھوں میں مایوسی کے ساتھ دبی دبی التجا بھی تھی۔

عمر نے تسکین سے پوچھا۔ "تمہارے پاس اس خالی جگہ کو بھرنے کے لئے مواد موجود ہے نا؟"

"ہاں ہے۔"

"وہی پراگ والا روزن برگ کا آرٹیکل؟"

"کیا تم اس پر کارٹون کو ترجیح دو گے؟" تسکین نے پوچھا۔

عمر کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اس کا مذاق اڑا رہی ہے یا سنجیدہ ہے۔ عام طور پر وہ اس کے ساتھ تمسخر نہیں کرتی تھی۔ اس نے غور سے دیکھا۔ اس کے چہرے پر اور آنکھوں میں سنجیدگی تھی۔ تاہم یہ طے تھا کہ وہ تیمور کے آرٹیکل کی اشاعت کے حق میں ہے۔

کی بورڈ پر تھرکتی تیمور کی انگلیاں لمحے بھر کو رکیں۔ اس نے سر اٹھا کر ان دونوں کو دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں دیوانگی کی چمک تھی اور سانسیں ایسے اکھڑی ہوئی تھیں جیسے وہ تیز تیز چلتا رہا ہو۔ "ہیلو۔" اس نے کہا۔ "مجھے افسوس ہے کہ آرٹیکل لیٹ ہو گیا۔" اس نے نظر اٹھا کر کلاک کو دیکھا۔ "اگر آپ پہلے ایڈیشن میں چھاپنا چاہتے ہیں تو میں اسے ایک صفحے میں مکمل کر دوں گا۔"

عمر نے دوستانہ انداز میں اس کے کندھے کو تھپتھپایا۔ "تم اطمینان سے اسے

مکمل کرو۔ ہم آج ویسے بھی اسے شائع نہیں کر سکیں گے۔ تسکین کے پاس متبادل اسٹوری موجود ہے۔"

"کیوں؟" تیمور نے پوچھا۔ "اس اسٹوری میں کوئی خرابی ہے؟"

عمر نے تولنے والی نظروں سے اسے دیکھا۔ وہ جانتا تھا کہ رائٹرز بچوں کی طرح ہوتے ہیں.......... اپنی تخلیق کے بارے میں بہت زیادہ حساس۔ وہ سوچ رہا تھا کہ یہ جہازی سائز کا جسم اس زخم انا کو جھیل سکے گا۔ خاص طور پر اوروں کی موجودگی میں۔ بالآخر اس نے وار کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ "تمہاری تحریر بہت جان دار ہے لیکن اس شکل میں ہمارے لئے ناقابل اشاعت ہے۔ اس پر تبادلہ خیال ضروری ہے۔ صبح میرے آفس میں آجانا' بات کرلیں گے اس پر۔"

"تو تبادلہ خیال ابھی اور یہیں کیوں نہ ہو جائے۔"

عمر نے تیمور کے چیلنج پر غور کیا۔ وہ تیز و تند بحث سے گھبراتا نہیں تھا بلکہ اسے تو گفتگو کرنا اور سکے کے دونوں رخ الٹ پلٹ کر دیکھنا اچھا لگتا تھا' لطف آتا تھا اس میں۔ بلکہ وہ اس سلسلے میں اسٹاف کی حوصلہ افزائی کرتا تھا۔ اس میں غصہ کئے بغیر بحث کرنے کی اہلیت بھی تھی۔ اگر تیمور' لوگوں کی موجودگی میں اپنے آرٹیکل کی کمزوریاں جاننا چاہتا تھا تو عمر کو اس پر کوئی اعتراض بھی نہیں تھا۔ "کیوں نہیں۔" اس نے کہا۔ "تمہارا آرٹیکل خوبصورت اور مؤثر طرز تحریر کا شاہکار ہے لیکن اس میں کئی باتوں کا لحاظ نہیں رکھا گیا۔ ایک تو ایڈیٹر کی حیثیت سے میری پوزیشن کا۔ دوسرے اس بات کا کہ ہمارا یہ اخبار ایک غیر ملک سے .... یورپ کے ایک ملک سے شائع ہو رہا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس میں حقائق موجود نہیں ہیں۔ یہ حقیقت سے بعید' تند جذبات کا آئینہ دار معلوم ہوتا۔ صرف میری پوزیشن کی بات ہوتی تو میں اسے ہرگز خاطر میں نہ لاتا کیونکہ وہ سب سے کم اہم ہے۔"

"تو تم نواز علی کو بے قصور نہیں سمجھتے؟" تیمور دہاڑا۔

عمر نے چند لمحے خاموش رہ کر خود کو ٹٹولا۔ "یہ بات نہیں۔" بالآخر وہ بے حد ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ "لیکن جو حقائق میرے سامنے ہیں' ان سے وہ مجرم ثابت ہوتا ہے۔ ہم یہ یقین کرنا چاہتے ہیں کہ اس سے زبردستی اعتراف جرم کرایا گیا ہے لیکن

ہم یہ بات ثابت نہیں کر سکتے۔ اس پر کسی غیر جانبدار شخص کو قائل نہیں کر سکتے۔ حقائق یہ ہیں کہ اس پر کھلی عدالت میں مقدمہ چلایا گیا اور وہاں اس نے بغیر کسی ظاہری دباؤ کے اعتراف جرم کیا۔ ٹرانس اوشیانک کے جس پریس رپورٹر نے اس مقدمے کو رپورٹ کیا' اس آدمی کا کہنا ہے نواز علی بالکل نارمل اور صحت مند دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے علاوہ ہم کچھ بھی نہیں جانتے۔"

"یہاں کوئی کچھ جاننے کی' کچھ معلوم کرنے کی کوشش بھی نہیں کرتا۔" تیمور نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

اس سوال کے بعد کے وقفے میں تسکین کی آواز ابھری۔ "میں نیچے جا کر اپنا صفحہ فائنل کروں گی۔" یہ کہہ کر وہ دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ تیمور کا ہاتھ اٹھا.......... اشارہ کرنے کے لئے اور منہ کھلا کچھ کہنے کے لئے لیکن اسی لمحے اس نے خود کو روک لیا۔ عمر کو احساس ہوا کہ وہ کچھ اس قسم کی بات کہنے والا تھا.......... رک جاؤ تسکین.......... اور دیکھو کہ میں اس شخص کی کیسے خبر لیتا ہوں.......... پھر اس نے سوچا کہ تسکین اس قدر اچانک کیوں رخصت ہو گئی۔ کیا اس لئے کہ جانتی تھی' تیمور جیت نہیں سکے گا۔

"ہم اپنی حد تک کوشش کرتے ہیں۔" اس نے تیمور کے سوال کا جواب دیا۔ "مگر ہماری حد بہت تھوڑی ہے۔ تفتیشی رپورٹنگ کے معاملے میں یورپ' امریکا سے بے حد مختلف ہے یہاں لوگوں سے کچھ معلوم کرنا اور معلوم ہو بھی جائے تو اسے شائع کرنا دشوار کام ہے۔"

"تمہارے خیال میں ہماری حکومت کا رویہ مناسب ہے؟" تیمور نے پوچھا۔

"نہیں۔"

"تو یہ بات کہہ کیوں نہیں سکتے تم؟ لکھ کیوں نہیں سکتے؟"

"اس لئے کہ اپنی حکومت کا وقار مجروح کرنا اچھی بات نہیں۔ ہم اس کی عزت نہیں کریں گے تو دوسرے تو اسے ذلیل کریں گے ہی۔"

"ہم اپنے سفارت خانوں کو بھی مطعون نہیں کر سکتے؟"

"نہیں۔ یہ مناسب نہیں۔ تم بس یہ یاد رکھو کہ یہ یورپ.........."

اس بار دیو قامت تیمور پھٹ پڑا۔ "میرے خدا' یہ یورپ کس قسم کا مقام ہے! ضروری ہے کہ یہاں جو آئے وہ بزدل ہو جائے؟ یہاں کوئی حق بات کے لئے بھی آواز بلند نہیں کر سکتا۔ ہٹلر کو رخصت ہوئے نصف صدی ہو چکی اور یہاں ابھی تک حبس ہے' کھلی فضا میسر نہیں۔"

کمرے کی فضا میں بس ایک لفظ گونجتا محسوس ہو رہا تھا...... بزدل۔ صدیق یہ ظاہر کر رہا تھا کہ وہ فرانسیسی اخبار لی مونڈ کی تازہ کاپی کا جائزہ لے رہا ہے۔ شکور اپنے ناخن تراشنے میں مصروف ہو گیا۔ نواب نے کچھ پروف سمیٹ کر انہیں یوں پیپر ویٹ کے نیچے دبایا جیسے لفظ بزدل کو دفن کر رہا ہو۔

اسی لمحے ادارتی کمرے کا دروازہ دھڑ سے کھلا اور اخبار کی فیشن رائٹر تھائرا ایڈی سن آندھی طوفان کی طرح اندر آئی۔ فربہ اندام ہونے کے باوجود بہت تیز چلتی تھی۔

"ہیلو ڈارلنگز" اس نے چیختی ہوئی آواز میں کہا۔ "کیا مجھے دیر ہو گئی؟ بہت زیادہ دیر ہو گئی؟ میرا انتظار کر لو گے۔ دیکھو' یہ چھپنا بہت ضروری ہے۔ غضب کا ڈیزائن ہے یہ۔"

وہ پلپلی' بے ڈول عورت تھی۔ سر جسم کے مقابلے میں بہت چھوٹا تھا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سا بھولپن تھا۔ ادارتی کمرے میں اس کی آمد نے اس کھچاؤ کو ختم کر دیا جو بتدریج بڑھتا جا رہا تھا۔ نواب نے کہا۔ "تم کہاں تھیں تھائرا بیگم؟ تمہیں دیکھے تو زمانے ہو گئے۔"

"رینے ویسول میں اوپننگ ہو رہی تھی نا۔ میں وہاں موجود تھی۔ ارے...... یہ سب تو چھپنا بہت ضروری ہے۔ میں کیا بتاؤں' انہوں نے سب سے بڑی سرپرائز سب سے آخر میں دی۔"

"کیسی سرپرائز؟" شکور نے پوچھا۔ "کیا لنگوٹی بھی میدان میں لے آئے تم لوگ؟"

"آستینیں۔" تھائرا نے سنسنی آمیز لہجے میں کہا۔ پتا ہے' اب آستینیں الگ کی جا سکیں گی۔"

"نہیں!" شکور نے حیرت کی اداکاری کرتے ہوئے اسی کے لہجے میں کہا۔ "میرے خدا' اب کیا ہو گا۔ تم مذاق کر رہی ہو تھائرا۔"

اکبر نے احتراماً سر خم کرتے ہوئے کہا۔ "اندر آؤ تھائرا...... اور اپنی آستینیں لباس سے الگ کر کے میز پر رکھو اور کام شروع کر دو فٹافٹ"

"یہ تم لوگ کیسے لفظ بولتے ہو۔ یہ لنگوٹی کیا ہوتی ہے......؟"

"ایک طرح کا زیر جامہ ہوتا ہے جو ہمارے ہاں کے پہلوان جامہ زیبی کے لئے استعمال کرتے ہیں۔" شکور بولا۔

"اور فٹافٹ یہ ہوتا ہے۔" اکبر نے اسے چٹکی بجا کر دکھائی۔ "اور یوں ہوتا ہے...... آناً فاناً۔" اس نے پلکیں جھپکائیں۔

"خیر...... تم نہیں سمجھ سکتے کہ یہ کیسی سنسنی خیز خبر ہے۔" تھائرا نے کہا۔

"میری اسٹوری چھپے گی تو پیرس' نیویارک اور لندن میں تہلکہ مچ جائے گا۔"

"بس تو لکھنا شروع کر دو۔" نواب بولا۔ "جو کچھ میسر ہو گا' وہ میں پہلے ایڈیشن میں چھاپ دوں گا۔ باقی آئندہ۔"

تھائرا اپنی میز کی طرف بڑھی۔ اس کی کرسی اس کے عقب میں غروب ہو گئی۔ اگلے ہی لمحے وہ اپنی ٹائپ رائٹر پر پل پڑی

"ہاں...... تو پھر؟" تیمور نے کہا۔

عمر نے اپنی توجہ ان صفحات پر مرکوز کی جو اس کے ہاتھ میں تھے۔ وہ جانتا تھا کہ تیمور اس وقت کیا محسوس کر رہا ہو گا۔ اس نے کہا۔ "تمہاری بات درست ہو سکتی ہے۔ جو کچھ تم نے لکھا ہے' اس میں بیشتر سچ ہے لیکن میں اسے اس کی موجودہ ہیت میں چھاپوں گا نہیں۔" اس نے کچھ توقف کیا' پھر بولا۔ "ہم حقائق اور نظر ثانی کے بغیر کچھ بھی شائع نہیں کرتے۔ تمہیں یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہئے۔" یہ کہہ کر وہ مڑا اور اس دروازے کی طرف چل دیا جو کمپوزنگ روم میں کھلتا تھا۔

تیمور کا رد عمل فوری اور بے حد شدید تھا۔ وہ زخمی شیر کی طرح غصے سے نڈھال ہو رہا تھا۔ اس نے اپنے آرٹیکل کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے ردی کی ٹوکری میں پھینک دیئے۔

نیلوفر کا چہرہ سپید پڑ گیا تھا۔ اس کے حلق سے ایسی گھٹی گھٹی چیخ نکلی جیسے تیمور نے آرٹیکل کے نہیں' اس کے جسم کے ٹکڑے کر دیئے ہوں لیکن تیمور نے وہ چیخ نہیں

سنی۔ وہ اس وقت کچھ سننے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ وہ اٹھا' اس نے کھونٹی سے اپنا کوٹ اتارا اور کسی کی طرف دیکھے بغیر چپ چاپ کمرے سے نکل گیا۔

"یہ تھا پہلا سبق۔" وقار نے تبصرہ کیا۔

زبیر ملول نظر آ رہا تھا۔ وہ بولا۔ "لیکن اس شخص میں بڑی صلاحیت ہے۔ میں نے اسے پڑھا ہے۔ وہ بہت اچھا لکھتا ہے۔"

صدیق نے سر جھٹکتے ہوئے کہا۔ "عمر صاحب وقت ضرورت بہت سخت آدمی ثابت ہوتے ہیں۔ وہ کسی کو پالیسی سے ہٹ کر کچھ نہیں کرنے دیتے۔"

"میرے خیال میں تیمور اسی سلوک کا مستحق تھا۔" شکور نے تبصرہ کیا۔

"گرم خون ہے۔ آہستہ آہستہ سمجھے گا۔" نواب نے بے پروائی سے کہا پھر پکارا۔ "تھائرا!"

"ڈارلنگز' میں نے پہلا پیراگراف مکمل کر لیا ہے۔" تھائرا نے فاتحانہ لہجے میں اعلان کیا۔

☆===========☆===========☆

کاپیاں پریس جا چکی تھیں۔ اب وقفہ بے کاری تھا۔ اس دوران اسٹاف کھانے کے لئے نکل جاتا تھا۔ آٹھ اور نو بجے کے درمیان دفتر سنسان رہتا تھا۔ آٹھ بجے کے بعد کوئی مقامی خبر ملنے کا امکان کم ہی ہوتا تھا پھر بھی کوئی نہ کوئی موجود رہتا تھا کہ فون آئے تو پیغام نوٹ کر لے۔

اس رات مسٹر اسٹافورڈ اور نیلوفر دفتر میں ہی رہ گئے تھے۔ بڈھے مسٹر اسٹافورڈ مصروف بہت تھے اور نیلوفر ان کا ہاتھ بٹا رہی تھی۔ نو بجے کے ذرا دیر بعد اسٹافورڈ نے ایک آرٹیکل فرانسیسی سے ترجمہ کر کے نیلوفر کے حوالے کیا اور نیلوفر فوراً ہی اسے ٹائپ کرنے میں مصروف ہو گئی۔

کاپی ڈیسک پر رکھے فون کی گھنٹی بجی تو نیلوفر نے اٹھ کر کال ریسیو کی۔

"ہیلو.......... ڈیلی ریولوشن؟"

اسے تیمور کی بھرائی ہوئی آواز پہچاننے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ اگرچہ آواز میں لڑکھڑاہٹ تھی۔ "ہیلو.......... ہیلو.......... تسکین موجود ہے؟"

"نہیں۔ آپ نے ان کے آفس میں ٹرائی کیا ہے؟"

"ہاں۔ وہاں سے جواب نہیں مل رہا ہے۔"

"سوری' وہ موجود نہیں ہیں۔ چاہیں تو کوئی پیغام نوٹ کرا دیں۔" نیلوفر نے کہا۔

دوسری طرف تیمور چند لمحے سوچتا رہا پھر اس نے کہا۔ "اس کی ضرورت نہیں۔ ہاں.......... ڈیڈ موجود ہیں کیا؟"

"نہیں.......... یہاں میرے اور مسٹر اسٹافورڈ کے سوا کوئی موجود نہیں ہے۔ سب باہر گئے ہوئے ہیں.......... کھانا کھانے۔"

"تم......... تم کون ہو؟"

"میں نیلوفر ریاض۔"

دوسری طرف خاموشی چھا گئی۔ نیلوفر کو لگا' جیسے رابطہ ختم ہو گیا ہے لیکن پھر فوراً ہی تیمور کی آواز ابھری۔ "تم نے کھانا کھا لیا ہے؟"

"نہیں۔ میں مسٹر اسٹافورڈ کی مدد کر رہی تھی۔ اب باہر جانے ہی والی تھی۔"

"تو ایسا کرو' کھانے میں میرا ساتھ دے دو۔"

نیلوفر نے گہری سانس لیتے ہوئے چھت کو دیکھا۔ ریسیور پر اس کی انگلیوں کی گرفت سخت ہو گئی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ تیمور نے اسے کھانے کی دعوت دی ہے۔ وہ سوچ رہی تھی......... میں اس پر ظاہر نہیں ہونے دوں گی کہ مجھے اس بات کی کتنی آرزو تھی۔ "آپ کو یقین ہے تیمور.........؟"

دوسری طرف پھر خاموشی چھا گئی اور نیلوفر کا دل ڈوبنے لگا' اس نے خود تیمور کو دھکیلنے کا سامان کر دیا تھا مگر پھر دوسری طرف سے تیمور نے کہا۔ "یقین ہے' تبھی تو کہہ رہا ہوں۔ فون تو میں نے کیا ہے نا تمہیں۔ تم آ جاؤ۔ ہم باہر گھومیں گے۔ اس رات کو یادگار بنائیں گے۔ میں کچھ ٹائٹ ہو جانا چاہتا ہوں۔"

نیلوفر کو یقین تھا کہ وہ اس وقت بھی کچھ سے زیادہ ٹائٹ ہے۔ "ٹھیک ہے تیمور۔ تم کہاں سے بات کر رہے ہو؟" اس نے پوچھا۔

"میں سڑک کے پار جو کی بار میں ہوں۔"

"اوکے۔ میں دس منٹ میں آ رہی ہوں۔"

وہ فوراً ہی سڑک پار کر لینا چاہتی تھی......... اڑ کر پہنچنے میں دس سیکنڈ لگتے۔ مگر اس نے بڑی ہمت کر کے تیمور کو دس منٹ کی مہلت دی تھی کہ وہ چاہے تو ارادہ بدل دے۔ وہ اس دوران واش روم میں چلی گئی۔ منہ ہاتھ دھو کر اس نے ہونٹوں پر تازہ لپ اسٹک لگائی' بالوں میں کنگھا کیا اور اپنے عکس کو دیکھ کر بڑبڑائی۔ "اتنی خوفناک کیوں لگتی ہوں میں؟"

اس نے نظر کا چشمہ اتار کر عکس کا جائزہ لیا۔ اس کی خوفناکی میں کچھ کمی آ گئی تھی لیکن وہ اپنے بے کشش چہرے اور زاویے دار جسم کا تو کچھ نہیں بگاڑ سکتی تھی۔ وہ چند

لمحے اس میں الجھتی رہی کہ چشمہ لگائے یا نہ لگائے۔ بالآخر اس نے چشمہ لگا ہی لیا۔ کندھے جھٹکتے ہوئے وہ باہر نکل آئی۔ اسے اللہ نے جیسا پیدا کیا تھا' اس کو تو کوئی نہیں بدل سکتا تھا۔ اس نے اپنا ٹوئیڈ کا براؤن کوٹ اٹھایا اور مسٹر اسٹافورڈ کو گڈ نائٹ کہہ کر باہر نکل آئی۔

تیمور بار کے کارنر پر بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھوں کی چمک اور چہرے کی تمتماہٹ بتا رہی تھی کہ وہ دیر سے پی رہا ہے۔ وہ بار سے ٹیک لگائے جس انداز میں بیٹھا تھا' کم از کم تین افراد کی جگہ گھیرے ہوئے تھا۔ نیلوفر کو وہ پھر ناقابل تسخیر لگا۔

اس نے نیلوفر کو دیکھ کر ہاتھ ہلایا اور جام لبوں سے لگا کر ایک ہی گھونٹ میں خالی کر دیا۔ "ہیلو نیلو۔ کیا پیو گی؟ یہیں بیٹھیں یا کہیں اور چلیں؟"

"تمہاری مرضی۔ مجھے کسی بات پر بھی اعتراض نہیں۔"

"تو ٹھیک ہے۔ میں یہاں بور ہو گیا ہوں۔ چلو یہاں سے۔ میری کار باہر کھڑی ہے"

وہ باہر نکل آئے جہاں تیمور کی گرے کلر کی فورڈ کھڑی تھی۔ "اب بولو' کہاں چلیں؟ تیمور نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھنے کے بعد کہا۔

میں پیرس سے زیادہ واقف........."

تیمور نے اس کی بات کاٹ دی۔ "میری نسبت تو زیادہ ہی جانتی ہو گی۔ میں سامز بار جانا چاہتا ہوں۔ بہت سنا ہے اس کے بارے میں تم بس مجھے راستہ بتا دو۔"

نیلوفر اسے راستہ بتاتی رہی۔ اسے یہ بھی پروا نہیں تھی کہ تیمور پیتا ہے......... اور آج اسے بھی پینی پڑے گی۔ وہ کبھی کبھی موسم سے تنگ آ کر ایک آدھ جام لے لیتی تھی' لیکن اس نے شراب کو کبھی شراب سمجھ کر نہیں پیا تھا مگر اتفاق سے اسے تیمور کی جو قربت مل رہی تھی اس کی خاطر وہ کچھ بھی کر سکتی تھی۔ اس پر ابھی سے خود سپردگی طاری ہو رہی تھی۔

بار میں پہنچ کر تیمور نے اسکاچ کا آرڈر دیا۔ جام آئے تو تیمور نے اس کے جام سے جام ٹکرایا۔ نیلوفر بہت خوش تھی۔ حالانکہ جانتی تھی کہ تیمور اسے زیادہ توجہ نہیں دے رہا ہے۔ تیمور نے جام بلند کرتے ہوئے کہا۔ "انقلاب' پیرس کے نام......... ان دنوں کی یاد میں جب وہ ردی کا ٹکڑا نہیں' اخبار ہوا کرتا تھا۔"

اس کے لہجے میں حقارت تھی۔ نیلوفر نے چونک کر اسے دیکھا

"میں غلط نہیں کہہ رہا ہوں۔" تیمور نے پُرزور لہجے میں کہا۔ "کیا یہ سمجھتی ہو کہ تم ایک اخبار کے لئے کام کرتی ہو؟ یہ لوگ نااہل ہیں۔ یہ بھی نہیں جانتے کہ اخبار کیا ہوتا ہے۔" وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "جو لوگ یہ اخبار چلا رہے ہیں وہ حوصلے سے محروم ہیں۔ مسابقت سے محرومی نے انہیں اجارہ دار بنا دیا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ پیرس سے اخبار نکال کر وہ بڑا کارنامہ کر رہے ہیں۔ مشینی انداز میں کام کرتے ہیں یہ مصلحت کوش لوگ۔ صحافت کی ذمے داری بھی نہیں سمجھتے۔ یہاں کوئی صحافی ہے ہی نہیں۔ ممکن ہے، کبھی رہے ہوں۔ اب تو یہ بچھڑے ہیں بچھڑے اور عمر جاوید گائے۔ یہ تصویر کے دونوں رخ دیکھنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔ اخبار ایسے تو نہیں چلایا جاتا۔"

نیلوفر اسکاچ کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ لے رہی تھی۔ اسے ڈر تھا کہ دو تین جام پی کر ہی وہ آؤٹ ہو جائے گی۔ پھر وہ یہ بھی سوچ رہی تھی کہ آؤٹ ہو جانا ہی بہتر ہے۔ یہ خواب کہیں ٹوٹ نہ جائے۔ تیمور نے اس کا جام خالی دیکھا تو بار ٹینڈر سے کہا۔

"جام بھر دو......... میرا بھی اور چار چشمی کا بھی۔" پھر وہ نیلوفر کی طرف مڑا۔ "کیا خیال ہے تمہارا، میں غلط تو نہیں کہہ رہا ہوں؟ یا تم یہ سمجھتی ہو کہ وہ شاندار لوگ ہیں۔ اس لئے کہ فون کا جواب فرانسیسی میں دے سکتے ہیں، فرانسیسی اخبار پڑھ سکتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔"

نیلوفر اسے عجیب سی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ "انہیں کوئی حق نہیں پہنچتا کہ تمہیں کچھ کرنے سے روکیں اور وہ روک بھی نہیں سکتے۔ کوئی بھی نہیں روک سکتا۔"

تیمور نے اسے حیرت سے دیکھا۔ بلکہ آگے کو جھک آیا تاکہ اسے زیادہ قریب سے دیکھ سکے۔ اس نے دیکھا، نیلوفر کا چہرہ شدت جذبات سے تمتما رہا تھا۔ اس کے ہونٹ گلاب کی پتیوں کی طرح نرم و گداز ہو گئے تھے۔ اس کے لئے......... "لڑکی، تم میں کوئی عجیب سی بات........." وہ بولا۔

اس لمحے نیلوفر نے اسے دیکھا۔ دونوں کی نظریں ملیں اور تیمور کو احساس ہوا کہ وہ لڑکی تو اس کی پرستش کرتی ہے مگر اسی لمحے تیمور کے خیال کی رو تسکین کی طرف مڑ گئی اور وہ نیلوفر کو بھول گیا۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ اس نے تسکین سے، دفتر سے بھاگ کر

حماقت کی۔ صرف اس لئے کہ عمر جاوید نے اس کے آرٹیکل کو مسترد کر دیا تھا جو کچھ اس نے لکھا تھا، وہ اسے بے حد جان دار گرم لگا تھا لیکن ممکن ہے وہ اتنا جان دارانہ ہو۔ پھر یہ بھی اس کی حماقت تھی کہ اس نے عمر کو اس کے اپنے میدان میں چیلنج کیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ تسکین اس کی حلیف ہے۔ وہ اسے شکست کھاتا دیکھنے سے بچنے کے لئے باہر چلی گئی تھی اور خدا اس نے کیا کیا تھا؟ کم حوصلہ انسانوں کی طرح اپنے زخم چاٹتا دفتر سے نکل بھاگا تھا اور اب اس چار چشمی مولی نما لڑکی کے ساتھ ایک بار میں بیٹھا بے وقوفوں کی طرح پی رہا تھا۔ لڑکی ڈیٹ تھی مگر پیرس میں کیا وہی ایک رہ گئی تھی اس کے لئے۔ اس کی قربت میں وہ تسکین کو کیسے بھول سکتا تھا۔ اس بے رنگ، بے بو اور بے ذائقہ لڑکی کی وجہ سے تو تسکین اور زیادہ یاد آ رہی تھی۔ اس نے جھنجلا کر سوچا۔ "یہ لڑکی ہے یا پانی........." ہائیڈروجن آکسائیڈ! تاہم نیلوفر کے لئے اس کے انداز میں سختی اب بھی نہیں آئی۔

"چلو......... اب کھانا کھالیں۔" اس نے نرم لہجے میں کہا۔

انہوں نے ڈٹ کر کھانا کھایا اور پھر ریڈ وائن پی۔ اسکاچ کا تاثر زائل ہونے لگا اور اس کی جگہ وائن کے پھیلاؤ نے لے لی۔ "تم پیرس کیسے آگئیں بے بی؟" اس نے پوچھا۔

"امریکا میں، میں نے تعلیم حاصل کی۔ جرنلزم کی ڈگری لی۔ اس دوران وطن سے اطلاع ملی کہ حادثے میں میرے ماں باپ مر گئے ہیں۔ بس پھر میں وطن واپس نہیں گئی۔"

انہوں نے وائن کی ایک اور بوتل ختم کی۔ نیلوفر کا وجود شکر گزاری کے احساس سے بھر گیا۔ "تمہاری مہربانی کہ تم مجھے یہاں لائے۔ اب کہاں چلنا ہے......... کیا کرنا ہے؟"

"میں پیرس دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"میں تمہیں پیرس دکھاؤں گی۔"

وہ باہر نکلے اور کار میں آ بیٹھے۔ ایک بج رہا تھا۔ سڑکوں پر اب ٹریفک کی اتنی زیادتی نہیں تھی۔ تیمور نہیں جانتا تھا کہ نیلوفر اسے کہاں لے جا رہی ہے۔ بس وہ خاموشی سے اس کی ہدایت پر عمل کر رہا تھا۔ اسے اتنا احساس ضرور تھا کہ انہوں نے دریائے سین

دوبارہ عبور کر لیا ہے۔ ابتدا میں وہ جانی پہچانی عمارتوں کے حوالے سے گرد و پیش کو پہچانتا رہا پھر سب کچھ اس کی سمجھ سے باہر ہو گیا۔ اب نہ سمتوں کا احساس نہ تھا نہ شناسائی کا۔ بس اتنا احساس ہو رہا تھا کہ وہ اوپر کی طرف جا رہے ہیں۔

بالآخر نیلوفر نے اسے کار روکنے کا اشارہ کیا۔ اس نے کار روکی۔ وہ اور نیلوفر نیچے اترے۔ وہ پہاڑی کی چوٹی پر کھڑے تھے۔ کنارے پر ریلنگ لگی تھی۔ نیچے جگمگاتا شہر جیسے ان کے قدموں میں بچھا ہوا تھا۔ "یہ ہے پیرس.......... تمہارے قدموں میں۔" نیلوفر بولی۔

تیمور مسکرایا۔ نیلوفر نے سچ مچ اس حیران کر دیا تھا۔ "ہم کہاں ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"مونٹ مارٹر کی چوٹی پر۔ پیچھے قربان گاہ ہے۔"

"لیکن اتنی اونچی پہاڑی اور شہر کے بیچ میں تو سمجھا تھا.........."

لیکن لگتا تھا کہ نیلوفر اس کی بات نہیں سن رہی ہے۔ چاندنی اس کے چہرے پر چٹک رہی تھی' اس کے چشمے کے شیشوں سے منعکس ہو رہی تھی۔ اس نے سرگوشی میں اپنی بات دہرائی۔ "یہ پیرس ہے۔ دیکھ لو.........."

تیمور سحر زدہ سا دیکھ رہا تھا۔ پیرس کسی بھی سجی سنوری فرانسیسی دوشیزہ کی طرح نظر آ رہا تھا.......... زیورات پہنے ہوئے۔ نیچے جہاں گھومتی ہوئی سڑکیں نظر آ رہی تھیں' لگتا تھا کہ پیرس ہیروں کا جڑاؤ بروچ پہنے ہوئے ہے۔ باروں اور کلبوں کے نیون سائنز یاقوت' زمرد اور نیلم کے زیوارت معلوم ہو رہے تھے اور مڑتا ہوا دریائے سین چاندی کا ربن معلوم ہو رہا تھا۔

"جان.......... مجھ سے محبت کرو گی؟ میری سویٹ ہارٹ بنو گی؟" تیمور نے چیخ کر کہا۔

نیلوفر جانتی تھی کہ وہ پیرس سے مخاطب ہے۔ اس نے نظریں بھی نہیں اٹھائیں لیکن اگلے ہی لمحے تیمور کا ہاتھ اس کے کندھے پر آ ٹکا۔ اس لئے کہ اس خوبصورتی نے اسے اندر سے بھر دیا تھا اور اس وقت اسے اپنے جذبات کے اظہار کے لئے ایک نسوانی وجود کے حوالے کی ضرورت تھی۔ تیمور اس وقت نشے میں تھا۔ نشہ صرف شراب کا

نہیں تھا۔ اس عورت کی محبت کا بھی تھا جو قانونی طور پر کسی اور کی تھی۔ نشہ اس خوبصورت رات کا بھی تھا.......... اور اس حسین نظارے کا بھی جسے وہ جرعہ جرعہ پی رہا تھا۔ "میں نواز علی کے جھوٹے اعتراف کے ڈھکے چھپے گوشے بے نقاب کر کے رہوں گا۔" اس نے اعلان کیا۔ "کشمیر میں جو کچھ ہو رہا ہے' میں اس کا پردہ چاک کروں گا۔ جو لوگ وہاں گولیاں کھا رہے ہیں' جیلوں میں اذیتیں اٹھا رہے ہیں' میں ان کی داستان الم لکھوں گا۔"

اس کی بانہوں کی گرفت میں پھنسی نیلوفر کسمسائی اور سر گھما کر اسے دیکھنے لگی۔

"خدایا.......... مجھے ان لوگوں پر ترس بھی آتا ہے اور غصہ بھی جو وہاں موجود تھے اور جنہوں نے صورت حال کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ ٹرانس اوشیانک کے نمائندے کو نواز علی نارمل اور صحت مند لگا۔ یوہ۔ وہ وہاں موجود تھا اور خود کو رپورٹر کہتا ہے وہ۔ میں ان بے حوصلہ لوگوں کو دکھاؤں گا کہ رپورٹنگ کیسے کی جاتی ہے۔ میں بھی فوجی ہوں۔ پاکستانی فوجی۔ میرے لئے کچھ بھی ناممکن نہیں۔ مجھے کوئی نہیں روک سکتا۔ میں معلوم کر کے رہوں گا کہ ایک اچھے بھلے آدمی کو بزدل اور غدار کیسے بنا دیا جاتا ہے۔ یہ معلوم کر کے میں پوری دنیا کو بتاؤں گا۔ پھر وہ کسی کے ساتھ یہ گندا کھیل نہیں کھیل سکیں گے اور خدا کی قسم' عمر کو وہ سب کچھ چھاپنا پڑے گا۔ دنیا بھر میں وہ اسٹوری صرف انقلاب میں چھپے گی.......... انقلاب کراچی' انقلاب لاہور' انقلاب پشاور' انقلاب کوئٹہ' انقلاب لندن' انقلاب پیرس' انقلاب نیو یارک۔ وہ اسٹوری پوری میں تہلکہ مچا دے گی۔ سب کو معلوم ہو جائے گا کہ کشمیر میں انسان کو گراموفون ریکارڈ کیسے بنایا جاتا ہے.........."

"بتاؤ کون روک سکتا ہے مجھے؟ یہ بے وقوف تھڑ دلے؟ کون روکے گا مجھے.........."

"سنو.......... تم پیاری لڑکی ہو۔" تیمور نے کہا۔ پھر اس نے نیلوفر کا چہرہ دونوں ہاتھوں کے پیالے میں بھرا اور اس پر جھک گیا۔

جانے کتنی دیر تک وہ یونہی رہے۔ تیمور کا جی نہیں چاہ رہا تھا کہ وہ اس جسمانی رابطے کو توڑ دے۔ اس نے آنکھیں موند لی تھیں۔ بس اسے اپنی بانہوں کے حلقے میں

لرزتے جسم کا احساس تھا۔ وہ سوچ رہا تھا........... کاش نیلوفر کے بجائے تسکین اس کے ساتھ ہوتی لیکن کیا اس کے ہونٹوں کا رد عمل بھی اس قدر خیر مقدمی' سچا اور پُر خلوص ہوتا؟

☆===========☆===========☆

تیمور کو عمر سے معذرت کئے دو ہفتے ہو چکے تھے۔ یہ بات حیرت انگیز تھی کہ اس کے باوجود دفتر کی فضا میں کشیدگی اور جذباتیت تھی۔ تیمور تو بظاہر پُرسکون ہو چکا تھا۔ وہ کام میں بہت دلچسپی لے رہا تھا۔ جو کام اسے دیا جاتا' دل جمعی سے کرتا اور لگتا تھا کہ وہ امریکا اور یورپ کا فرق سمجھنے کی بھی کوشش کر رہا ہے۔ اس رات کے بعد سے اب تک اس نے نواز علی کیس کے متعلق بات نہیں کی تھی۔ اس نے مسترد شدہ آرٹیکل پر نظرثانی بھی نہیں کی تھی اور اسے ری رائٹ بھی نہیں کیا تھا لیکن جو کچھ اس نے کیا اور کہا تھا' وہ اس کی شخصیت کی فورس سمیت انقلاب کے اسٹاف پر نہ مٹنے والا نقش چھوڑ گیا تھا۔ یہ بات چھوٹے اور غیر اہم واقعات کی شکل میں ظاہر ہو رہی تھی۔

اس روز عمر فارن آفس کے سیکریٹری سے آدھے گھنٹے کی ناخوشگوار گفتگو کے بعد لوٹا تھا اور اس کا موڈ بے حد خراب تھا۔ ناخوشگوار گفتگو ایک پادری کے متعلق ہوئی تھی جس پر چیکوسلواکیہ میں مقدمہ چلایا گیا تھا اور جسے نچلے درجے کی ایک فرانسیسی سفارت کار نے پناہ دی تھی۔ اسی نے چیکوسلواکیہ سے فرار میں پادری کی مدد کی تھی۔

عام حالات میں عمر' ڈیڈ کو اپنے پاس بلا کر سکون سے پوچھ گچھ کرتا کہ وہ اسٹوری کس ذریعے سے انقلاب تک پہنچی اور اسے شائع کرنے کی ذمے داری کس کی ہے لیکن ڈیڈ اپنے آفس میں موجود نہیں تھا۔ عمر اس کی تلاش میں خود ادارتی کمرے میں چلا آیا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ چڑچڑا ہو رہا ہے اور اعصابی کشیدگی کا شکار ہے۔ چھپنے سے پہلے اس نے وہ اسٹوری نہیں پڑھی تھی اور چھپنے کے بعد بھی اسے اہمیت نہیں دی تھی۔ یہ اس عرصے کی بات تھی جس میں کشمیر میں نواز علی کو سزا مل گئی تھی اور تیمور اس کے لئے مسئلہ بنا ہوا تھا۔

ڈیڈ' تھائرا کی میز پر جھکا اس سے گفتگو میں مصروف تھا۔ نیلوفر فائلوں میں سر کھپا رہی تھی۔ وہ شاید کسی کے لئے نوٹس تیار کر رہی تھی۔ گرشا سمیت دو تین افراد بینچ پر

بیٹھے تھے۔ تیمور اپنی جگہ بیٹھا کچھ ٹائپ کر رہا تھا۔ اس کے جارحانہ انداز کو دیکھ کر عمر کو نواز علی کیس یاد آ گیا۔ وہاں صرف صدیق ہی خالی بیٹھا تھا۔

عمر نے جا کر وہ اخبار جس میں وہ پریشان کن اسٹوری شائع ہوئی تھی' صدیق کے سامنے پٹخ دیا۔ "یہ اسٹوری کہاں سے آئی تھی؟" اس نے تند لہجے میں پوچھا۔

صدیق اس اچانک جارحیت سے گھبرا گیا۔ "کیوں........... کوئی گڑبڑ ہے اس میں؟"

"بالکل ہے۔ اسی کی وجہ سے ابھی آدھے گھنٹے تک فارن آفس میں میری کھنچائی ہوئی ہے۔ وہ ناراض ہیں........... اور غلط بھی نہیں۔ چیکوسلواکیہ کی حکومت نے اس سے رسمی احتجاج کیا ہے۔ وہ میرے پیچھے پڑ گئے ہیں۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ اس کی اشاعت کا ذمے دار کون ہے؟"

صدیق اب بھی پوری طرح نہیں سمجھ سکا تھا۔ "مجھے یہ اسٹوری گرشا سے ملی تھی..........." اس نے کہا۔

"یہ گرشا کیا بلا ہے؟"

"انفار مر ہے اور قابلِ اعتبار انفار مر ہے۔ یہ جو بینچ پر بیٹھے ہیں..... ...." صدیق کی نظر اس طرف اٹھی جہاں گرشا سگریٹ کے ٹوٹے میں پن لگا کر پی رہا تھا تاکہ آخری حد تک اس سے استفادہ کر سکے۔ وہ اپنا وہی مفلر گلے سے لپیٹے ہوئے تھا اور اسے جیکٹ میں اڑس رکھا تھا۔ "وہ رہا گرشا۔" صدیق نے اشارہ کیا۔

عمر نے اشارے کی سمت دیکھا۔ گرشا نے اپنا نام سنا تو اٹھنے لگا لیکن ان دونوں کا رویہ اسے انتہائی لگا اور وہ درمیان میں معلق ہو گیا اگلے ہی لمحے وہ دوبارہ بیٹھ گیا۔

تیمور کا ہاتھ رک گیا۔ وہ پلٹ کر بڑی دلچسپی سے انہیں دیکھنے لگا۔ ڈیڈ لیپ ہام بھی سیدھا کھڑا ہو گیا۔ عمر کو احساس ہوا کہ وہ ایک ایسے کھلونے کی طرح ہے جس میں چابی بھر دی گئی ہے۔ اب وہ پیچھے نہیں ہٹ سکتا۔ اس نے صدیق سے کہا۔ "تم ایسے لوگوں کی مدد کیوں لیتے ہو۔ کیوں اتنا منہ لگاتے ہو انہیں۔ تمہارے پاس اتنی بھی عقل نہیں۔"

صدیق کو احساس ہوا کہ اس کے ساتھ زیادتی ہو رہی ہے۔ "کیا سٹوری جھوٹی

تھی؟" اس نے کہا۔ "اگر ایسا ہے تو میں معذرت..........."

"میں یہ نہیں کہہ رہا ہوں۔" عمر نے اس کی بات کاٹ دی۔ "مسئلہ یہی ہے کہ اسٹوری سچی ہے۔ اسی لئے اسے چھپنا نہیں چاہئے تھا۔ میری نظر سے گزرتی تو میں اسے نکال دیتا۔"

ڈیڈ اس کی طرف چلا آیا۔ "یہ غلطی میری ہے عمر۔ یہ کام مجھے کرنا چاہئے تھا۔"

لیکن ڈیڈ کے اعتراف نے عمر کو اور برہم کر دیا کیونکہ اسے احساس تھا کہ ایڈیٹر ان چیف ہونے کے ناتے اصل ذمے داری اس کی تھی۔ "وہ تو تھی ڈیڈ لیکن اس اسٹوری کو ہم تک پہنچنے سے پہلے ہی نکال دیا جانا تھا۔" اس نے کہا۔ "ہم بعض اوقات ہر سطر نہیں پڑھ سکتے۔ اتنا وقت نہیں ہوتا ہمارے پاس' اور ایڈیٹرز ہوتے کس لئے ہیں۔ یہ اسٹوری صدیق کو کِل کرنا چاہئے تھی۔ نواب کو اس پر اعتراض کرنا چاہئے تھا۔ یہ تین افراد اور ہیں۔ آخر تم لوگ یہ بات کب سمجھو گے کہ وہ اسٹوری بھی بہت اہم ہوتی ہے جو ناقابل اشاعت ہو۔ اس اسٹوری سے زیادہ اہم جو چھاپی جا رہی ہے۔" یہ کہہ کر وہ پاؤں پٹختے ہوئے کمرے سے نکل گیا۔

اس کا غصہ کمرے میں سگریٹ کے دھوئیں کی طرح معلق تھا۔ نواب' صدیق اور شکور تینوں کے چہرے سرخ ہو رہے تھے۔ انہیں غصہ آ رہا تھا۔ اس لئے کہ وہ کھنچائی کے مستحق تو تھے لیکن اتنے زیادہ بھی نہیں۔ اسٹوری زبردست تھی اور صدیق کو بجا طور پر اچھی لگی تھی۔ تاہم ان تینوں میں سے کسی ایک کو ڈیڈ یا عمر سے اس کے سلسلے میں مشورہ ضرور کر لینا چاہئے تھا۔ اس کے باوجود یوں سب کے سامنے ڈانٹ پھٹکار ان کے ساتھ زیادتی تھی۔ صدیق کو احساس ہو رہا تھا کہ اس کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔ اس کا کام ہی یہی تھا۔ سٹوری کھود کر نکالنا! اور یہاں اس کا مصرف ہی کیا تھا۔ باقی کام تو کوئی چپڑاسی بھی کر سکتا تھا۔

"گرشا!" صدیق نے تند لہجے میں پکارا۔

مختصر الوجود گرشا بینچ سے یوں اٹھا جیسے بینچ میں کرنٹ دوڑ گیا ہو۔ وہ اٹھ کر ڈیسک کی طرف لپکا۔ اس کے استخوانی چہرے پر تشویش کا تاثر تھا۔ "ایکسی لینسی.........؟"

صدیق نے اتنی بلند آواز میں کہ سب سن لیں' اسے ڈانٹا۔ "تمہارا مطلب کیا تھا۔ ایسی خطرناک اسٹوری مجھے دینے کا؟ میری بات سمجھ رہے ہو نا۔" اس نے اخبار اس کی طرف دھکیلا۔

گرشا نے اسٹوری کی سرخی دیکھی اور ہکلایا۔ "لیکن ایکسی لینسی........." اس کے ماتھے پر پسینہ پھوٹ نکلا۔ اس کی آنکھوں میں دکھ بھی تھا اور حیرت بھی۔

"لیکن ایکسی لینسی........." صدیق نے اس کی نقل اتاری۔ نواب' شکور اور ڈیٹ لیپ ہام ان دونوں کو دیکھ رہے تھے۔ ڈیڈ نے مداخلت نہیں کی۔ وہ جانتا کہ مسئلہ کیا ہے۔ پھندا ڈالنے کے لئے ایک گردن کی ضرورت تھی اور اس کے لئے گرشا سے مناسب گردن کسی اور کی نہیں ہو سکتی تھی۔ صدیق کو اپنی توہین کا بوجھ کہیں تو اتارنا تھا۔ مشرقی یورپ کے ایک تارک وطن انفارمر کی ذلت سے اگر ماحول خوشگوار ہو سکتا تھا تو اس میں حرج ہی کیا تھا۔ گرشا خود ہی یہاں آتا تھا۔ اسے کسی نے بلایا تو نہیں تھا کبھی۔

"لیکن اسٹوری سچی تھی ایکسی لینسی۔ اگر کسی نے اسے چیلنج کیا ہو تو بتائیں اور میں نے تو اسٹوری آپ کو دیتے ہوئے تنبیہہ کر دی تھی کہ........."

اس وقت عمر دوبارہ ادارتی کمرے میں داخل ہوا۔ وہ دروازے کی چوکھٹ پر رک گیا۔

"تم پر لعنت ہو۔ تم بکواس کرتے ہو۔" صدیق' گرشا پر دہاڑا۔ "تم اپنی لعنتی معلومات سمیت اسی وقت یہاں سے دفع ہو جاؤ۔ اگر میں نے اب تمہیں یہاں دیکھا تو جوتے سے ماروں گا تمہیں۔ جاؤ......... دفع ہو جاؤ یہاں سے۔"

گرشا کا چہرہ سپید پڑ گیا۔ وہ کھلی ہوئی بے انصافی تھی۔ ان سب کو ہی کچھ ہو گیا تھا۔ عمر جانتا تھا کہ یہ زیادتی ہے لیکن اس نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کے نزدیک یہ کوئی اہم بات نہیں تھی۔ گرشا بغیر ایک لفظ کہے پلٹا اس نے اپنا نیچے گرا ہوا رین کوٹ اٹھایا اور دروازے کی طرف چلا۔ اس کے سامنے بچے کھچے وقار کو بچانے کی ایک یہی صورت تھی۔ اس کے حلق کا کنٹھا متحرک تھا اور ہونٹ لرز رہے تھے۔ تیمور اسے حقارت سے دیکھ رہا تھا' جیسے کوئی طاقت ور کسی کمزور کو دیکھتا ہے۔ اس کے نزدیک وہ انسان نہیں' ایک انسانی چیتھڑا تھا جس کی نہ کوئی عزت ہوتی ہے' نہ کوئی وقعت.........

ایسے لوگ ذلیل ہوتے ہی رہتے ہیں۔

نیلوفر کا دل دکھ رہا تھا گرشا کے لئے۔ اسے بے انصافی سے نفرت تھی اور کہیں بے انصافی ہوتی تو اس کا احساس بھی فوراً ہی ہو جاتا تھا۔ جو کچھ ہوا تھا' اس میں گرشا کا قصور نہیں تھا۔

گرشا کو دروازے تک پہنچنے کے لئے اس کی میز کے پاس سے گزرنا تھا۔ وہ آخری میز تھی۔ گرشا وہاں پہنچا تو نیلوفر نے مسکراتے ہوئے سرگوشی میں کہا۔ ”اس بات کی اتنی پروا نہ کرو گرشا۔“ اسے اتنا افسوس ہو رہا تھا اس پر کہ وہ اس کا ہاتھ تھپتھپانا چاہتی تھی۔

ضرورت کے اس لمحے میں گرشا کو نیلوفر کے محسوسات نے سہارا دیا۔ اس وقت دروازے تک پہنچنے کے لئے اور ان ظالموں سے بھاگ جانے کے لئے ایک دوستانہ نگاہ' ایک مہربان نظر اسے درکار تھی جو نیلوفر نے اسے فراہم کر دی تھی۔ اس نے سر اٹھا کر نیلوفر کو دیکھا۔ اس کے ہونٹ ہلے۔ وہ شکرگزاری اور اعتراف کی موہوم سی مسکراہٹ تھی جو پل بھر کو اس کے ہونٹوں پر لرزی اور پھر معدوم ہو گئی۔ پھر وہ دروازہ کھول کر باہر چلا گیا۔ اس کے انداز میں بلا کی عجلت تھی۔

دوسرے دروازے پر کھڑے عمر کا جی چاہا کہ اسے بلا لے لیکن اس وقت تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ کمرے میں موجود سب لوگ اپنے اپنے کام میں لگ چکے تھے۔ اگرچہ وہ شرمندہ تھے۔ تاہم وہاں کی فضا سے کشیدگی کسی حد تک ڈھل چکی تھی۔ وہ کمرے میں داخل ہوا۔ ڈیڈا اسے دیکھ کر مسکرایا۔ شکور نے اسے ویانا سے آنے والی ایک خبر کے بارے میں بتایا تیمور کا ٹائپ کرتا ہوا ہاتھ رکا اور اس نے سر اٹھاتے ہوئے پوچھا۔ ”کچھ دیر بعد تم اپنے آفس میں ہو گے عمر؟“

”ہاں کیا بات ہے؟“

”میں آ کر تم سے کچھ بات کر سکتا ہوں؟“

”ضرور۔“ عمر نے کہا اور سوچا' اس شخص میں بہرحال سیکھنے کی صلاحیت ہے۔

”جب جی چاہے آ جانا۔“ اس نے کہا مگر وہ متفکر ہو گیا تھا کہ جانے اس سیماب صفت آدمی کے دل میں کیا ہو۔

☆============☆===========☆

تسکین نے پوچھا۔ ”تمہارے خیال میں یہ مناسب ہو گا.........؟ میرا مطلب ہے' تیمور کو پاکستان بھیجنا.........“

اس استفسار نے عمر کو چونکا دیا۔ تیمور نے خود اس سے درخواست کی تھی کہ اسے پاکستان بھیج دیا جائے۔ اس کے چونکنے کی دو وجوہات تھیں۔ ایک تو یہ کہ تسکین کو تیمور کے پاکستان بھیجے جانے پر اعتراض تھا اور دوسرے یہ کہ تسکین نے ایک اصول توڑا تھا۔ ان کے درمیان یہ بات طے تھی کہ دفتر سے باہر دفتر کے امور پر گفتگو نہیں کی جائے گی۔ اس وقت وہ دونوں تفریح کے لئے نکلے تھے۔ عمر مچھلی کا شکار کھیل رہا تھا۔

”میں سوچ رہی تھی کہ.........“

عمر نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”میں جانتا ہوں۔ میں نے تمہاری بات سن لی تھی۔ تم بتاؤ تمہارے ذہن میں کیا ہے۔“ اس نے سر گھما کر اسے دیکھا۔ ”تیمور کا کہنا ہے کہ پاکستان میں کچھ عرصہ کام کرنے کے بعد وہ یہاں زیادہ بہتر طور پر کام کر سکے گا۔ تب اسے یہاں آزادیٔ تحریر کا احساس ہو گا۔ امریکا سے آنے کے بعد تو اسے یہاں فضا گھٹی گھٹی لگتی ہے۔“

”تم اسے پاکستان ٹرانسفر تو نہیں کر رہے ہو؟“

”نہیں۔ وہ مجھے ہی جواب دہ ہو گا۔ یہ سمجھ لو کہ وہ اسلام آباد میں ہمارا نمائندہ ہو گا۔“

”یہ غیر ضروری ہے۔ وہاں کی خبریں تمہیں ویسے ہی مل جاتی ہیں۔“ تسکین نے اعتراض کیا۔

”وہاں سے سنسر شدہ خبریں ملتی ہیں۔ تیمور وہاں ہو گا تو مجھے فرسٹ ہینڈ نیوز مل سکیں گی.........ایکس کلوسیو۔“

”اس کے لئے تم کسی اور کو بھی بھیج سکتے ہو۔“

عمر نے سوچا' کتنی فکر مند ہے۔ نہ جانے کیوں اور لگتا ہے کہ اس سلسلے میں خوب غور و فکر کر چکی ہے۔ ”میں نے سوچا تھا لیکن بات نہیں بنے گی۔ کوئی اور وہاں جانے کو تیار کیوں ہو گا اور پھر تیمور نے خود یہ درخواست کی ہے مجھ سے۔ اسے وہاں بھیجنے

میں حرج ہی کیا ہے۔ وہاں وہ بہت کچھ سیکھ سکے گا.......... وہ کچھ جو ہم نہیں سکھا سکتے۔"

"میں اس کے پیرس میں رہنے کو ترجیح دوں گی۔" تسکین نے کہا.......... اور پھر جلدی سے وضاحت کی۔ "پاکستان میں رپورٹنگ اس کے لئے شاک ثابت ہو گی۔ میرے خیال میں وہ بہت ضدی آدمی ہے۔ اپنی مرضی ہر قیمت پر پوری کرنے کا قائل ہے۔"

"اسلام آباد میں وہ اپنی کون سی مرضی پوری کر سکے گا؟" عمر نے پوچھا۔

تسکین چند لمحے سوچتی.......... غور کرتی رہی۔ وہ یقینی طور پر تو کچھ نہیں جانتی تھی اس کا نسوانی وجدان اسے جو کچھ بتا رہا تھا' اسے لفظوں میں منتقل کرنا آسان نہیں تھا بالآخر اس نے کہا۔ "میں نہیں جانتی۔ بس اتنا کہہ سکتی ہوں کہ اس کا پیرس میں رہنا ہمارے لئے.......... اور اخبار کے لئے بہتر ہو گا۔" یہ کہتے کہتے اسے ایک خیال آیا جس نے اسے متعجب بھی کیا اور خوفزدہ بھی۔ وہ سوچ رہی تھی.......... ہاں' اس کا یہاں سے چلے جانا میرے لئے بہتر رہے گا۔ وہ مجھے اپ سیٹ کر دیتا ہے۔ یہ مجھے کیا ہو رہا ہے؟

عمر اپنے فیصلے پر غور و فکر کر رہا تھا۔ وہ ایک پل میں سمجھ گیا کہ تسکین اسے کیا بتانے کی کوشش کر رہی ہے لیکن یہ بات سمجھنے کی بجائے وہ اس سوچ میں الجھا رہا کہ تسکین نے خود کہا ہے کہ وہ تیمور کی پیرس میں موجودگی کو ترجیح دے گی۔ اسے احساس تھا کہ وہ تسکین کے لفظ پکڑ رہا ہے لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ بعض اوقات غیر شعوری طور پر آدمی اپنے ڈھکے چھپے خیالات کو بھی لفظوں کے انتخاب سے ظاہر کر دیتا ہے.......... "وہ بہت ضدی آدمی ہے۔ اپنی مرضی ہر قیمت پر پوری کرنے کا قائل ہے۔" یہی کہا تھا نا تسکین نے۔ اب فرض کرو کہ وہ تسکین کو حاصل کرنا چاہتا ہے اور تسکین نے بھی اس کے دل کی پکار سن لی ہے۔ تیمور جوان ہے سخت جان ہے' تسکین بھی اس سے متاثر ہو گئی ہے۔

وہ کوئی مروجہ احساس رقابت نہیں تھا۔ وہ عمر کی خوفناک حقیقت پسندی اور خود تنقیدی تھی جو ان اوہام کو بھوت بنا کر سامنے لے آئی تھی۔ تسکین عمر میں اس سے بہت کم تھی اور وہ سقوط مشرقی پاکستان کے بعد بھی وہاں رہی تھی۔ اس کے نتیجے میں اس کی طبیعت میں خطر پسندی کا پیدا ہو جانا غیر فطری نہیں تھا۔ وہ عملی بھی تھی۔ ایسا وقت دیکھنے

اور گزارنے والوں کے خون میں تو وحشت ناچتی ہی ہے۔

اور وہ خود فوجی تھا۔ کبھی اس کے خون میں بھی وحشت موجیں مارتی تھی۔ اس نے جنگ بھی لڑی تھی۔ انٹیلی جنس میں بھی کام کیا تھا مگر وہ جنگی قیدی بھی رہا تھا۔ اب اس کا خون سرد پڑ چکا تھا۔ اب وہ اتنا حوصلہ مند نہیں تھا۔ اب اسے ایڈونچر سے اتنی دلچسپی نہیں تھی۔ اب تو وہ بس دوسروں کی کارروائیوں کی رپورٹ شائع کر سکتا تھا۔

نوجوان لوگ' اپنی' خطرات کو چیلنج کرنے والی فطرت کی وجہ سے کتنے ہیجانی اور ڈرامائی ہوتے ہیں' کتنی سنسنی پھیلا سکتے ہیں' یہ وہ بخوبی جانتا تھا۔ کون جانے' تسکین کو پتا بھی نہ چلا ہو اور وہ تیمور سے متاثر ہو گئی ہو.......... ملتفت ہو گئی ہو اس پر۔ اور کون جانے' خود اس نے.......... عمر جاوید نے تیمور کو راستے سے ہٹانے کے لئے اسے پاکستان بھیجنے کا فیصلہ کیا ہو اور شعوری طور پر اسے اس کا احساس ہی نہ ہوا ہو۔

حقیقت پسند عمر یہ تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ تسکین کے لئے تیمور جیسے لوگوں کے مقابلے میں پُرکشش ہے۔

بالآخر اس نے تسکین کی بات کا جواب دیا تو اسے یہ احساس تھا کہ وہ تسکین کی بات پوری طرح سمجھنے کی کوشش نہیں کر رہا ہے اس لئے کہ اس کے ذہن میں پہلے ہی سے ایک سوچ موجود ہے لیکن وہ کچھ اور کر بھی نہیں سکتا تھا۔ "تمہاری منطق میری سمجھ میں نہیں آئی۔" اس نے کہا۔ "ابھی چند ہفتے پہلے تو تم کہہ رہی تھیں کہ وہ پُرجوش جوان ہے اور اگر آزادی دے دی جائے تو اخبار کے لئے بہت فائدہ مند ہو گا۔ اب میں اسے موقع دے رہا ہوں کچھ کرنے کا تو تم چاہتی ہو کہ اسے وہ موقع نہ دیا جائے۔"

تسکین نے ایک لمحے کو سوچا کہ یہ مرد' عورت کو سمجھنے کے معاملے میں اتنے احمق کیوں ہوتے ہیں۔ جب سے اس کے ذہن میں یہ خیال آیا تھا کہ تیمور کا پیرس سے چلے جانا اس کے.......... تسکین عمر کے لئے زیادہ بہتر ہے' تب سے وہ محتاط.......... اور اس کے نتیجے میں سوچ کے اعتبار سے معلق ہو گئی تھی۔ دوسری طرف عمر نے یہ طرز فکر اختیار کر کے کہ تیمور کے آنے کے بعد ان سب میں ہی کوئی نہ کوئی تبدیلی آئی ہے' سوچنے کے تمام راستے بند کر دیئے تھے۔ تسکین ایسی عورت تھی جسے اپنے شوہر کے پندار کا بہت احساس رہتا تھا۔ اب اگر عاقل و بالغ عمر یہ محسوس نہیں کر سکا تھا کہ تیمور نے

پچھلے دو ہفتوں میں خود کو دانستہ طور پر بدلا ہے.......... صرف اس لئے کہ اس کی طرف سے بے پرواہ اور بے فکر ہو جائے تو تسکین یہ بات بتا کر عمر کے پندار کو مجروح نہیں کر سکتی تھی۔ چنانچہ وہ پیچھے ہٹ گئی۔ "ارے عمر.......... تم نے مجھے ٹوکا بھی نہیں۔" اس نے بچوں کے سے انداز سے کہا۔ "میں نے تو ایک مسلمہ اصول کی خلاف ورزی کی ہے۔ دفتر کے باہر دفتر کی باتیں! جانے کس بات نے مجھے اس پر مجبور کر دیا.........."

اس کے بعد دونوں میں سے کسی نے بھی تیمور یا اس کے پاکستان جانے کے بارے میں بات نہیں کی۔

☆===========☆===========☆

"اپنا وطن کبھی کسی کو اجنبی نہیں لگتا۔ خواہ جدائی کتنی ہی طویل کیوں نہ ہو۔" عمر تیمور سے کہہ رہا تھا۔ "لیکن پاکستان تمہیں بہرحال اجنبی لگے گا۔ وہاں کے طور طریقے بدل چکے ہیں' اور لوگوں کی سوچ بدل چکی ہے۔ وہاں کوئی کسی کی نہیں سنتا۔ جو طاقت ور ہیں' انہیں کسی کی سننے کی ضرورت ہی نہیں۔ جو کمزور ہیں وہ بظاہر سنتے ہیں لیکن کرتے اپنے دل کی ہیں۔ تم پرل کانٹی نینٹل میں قیام کرنا۔ ٹرانس اوشیانک کا نمائندہ مائیکل گرین وہیں ہوتا ہے۔ اس سے مل لینا۔ اچھا آدمی ہے۔ کسی مدد کی ضرورت ہو تو اس سے کہنا۔"

"جی۔ بہت بہتر۔" تیمور نے سعادت مندی سے کہا۔

عمر اس روز بہت مصروف تھا۔ کئی ملاقاتیں طے تھیں۔ دو ملاقاتی آئے بیٹھے تھے لیکن وہ بیٹھا تیمور کو یوں سمجھا رہا تھا جیسے تیمور کوئی عاقل و بالغ مرد نہیں بچہ ہو۔ وہ خود کو بے وقوف محسوس کر رہا تھا اور یہ بھی جانتا تھا کہ اگر اس نے تیمور کو پوری طرح سمجھا بجھا کر اسلام آباد نہ بھیجا تو اسے پچھتاوا ہو گا۔ "آج پیر کا دن ہے۔ تیرہ تاریخ ہے۔" اس نے کہا۔ "وہاں پہنچ کر تمہیں گھر والوں سے' دوستوں سے ملنا ملانا ہو گا۔ پھر جمنے میں' رابطے بنانے میں وقت لگے گا۔ یوں سمجھ لو کہ تم بیس تاریخ کو فون پر مجھے پہلی رپورٹ.......... بلکہ اسٹوری دو گے جو میں منگل کی اشاعت میں شامل کروں گا۔ ڈیڈ نے تمہیں وقت بتا دیا ہے؟"

"جی ہاں۔ رات آٹھ بجے۔"

"ہاں۔ کال کے لئے پہلے سے بکنگ کرا لینا۔ کوئی گڑبڑ ہو' رابطہ نہ ملے تو لندن کال کر لینا۔ اور ہاں.......... خود کو کسی مشکل میں نہ پھنسا بیٹھنا۔"

تیمور ہنسنے لگا۔ وہاں مشکل کا کیا کام ہے..........؟"

"وہاں مشکل اور طرح کی ہے۔ سرکاری افسروں کی دم پر پاؤں رکھنے سے بچنا۔" عمر نے کہا۔ تیمور اسے عجیب سی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ عمر نے اپنی بات جاری رکھی۔ "تم وہاں جانے کے خواہش مند تھے۔ میں تمہیں اس لئے بھیج رہا ہوں کہ تم وہاں ہمارے بھی کام آ سکتے ہو اور خود بھی بہت کچھ سیکھ سکتے ہو۔ میں وہاں اپنا ایک رپورٹر دیکھنا چاہتا ہوں جو آنکھیں اور کان کھلے رکھے اور اتنا ذہین بھی ہو کہ جو دیکھے اور سنے' اس کا تجزیہ بھی کر سکے اور تشریح بھی۔ جو نہ خود کو کسی مصیبت میں پھنسائے' نہ اپنے اخبار کو۔"

"میں تمہارا شکر گزار ہوں کہ تم نے مجھے چانس دیا۔" تیمور بولا۔ "میں اپنی طرف سے پوری کوشش کروں گا۔"

عمر نے اسے بہت غور سے دیکھا۔ تیمور کی بات میں خلوص محسوس ہوتا تھا لیکن عمر کی سماعت میں خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگی تھیں۔ کوئی چیز تھی جسے تیمور نہیں چھپا پا رہا تھا۔ اس کا اظہار اس کا عضو عضو کر رہا تھا۔ وہ شاید ایک طرح کا احساس فتح تھا' ایک سنسنی سی تھی جسے جسم میں دوڑنے سے تیمور روک رہا تھا اور وہ جسم سے پھٹی پڑ رہی تھی۔ عمر اب بات کرتے ہوئے خود کو پوری طرح بے وقوف محسوس کر رہا تھا لیکن اس کے نزدیک یہ ضروری تھا کہ تیمور کو ان امکانی مسائل کے متعلق بتایا جائے جن سے اس کا سابقہ پڑ سکتا تھا۔ "تمہیں وہ سب کچھ بھول جانا ہو گا جو تم نے اب تک سیکھا اور سمجھا ہے۔" اس نے کھردرے لہجے میں کہا۔ "وہاں لوگ پبلسٹی پسند نہیں کرتے امریکا کی طرح۔ وہاں صرف ایک کثیر الاشاعت اخبار سے منسلک ہونا کافی نہیں ہو گا۔ تعلقات تمہیں خود بنانے ہوں گے.......... اپنی کوششوں سے۔ امریکا میں تم پولیس اسٹیشن میں دندناتے ہوئے گھس سکتے ہو۔ تم چیف آف پولیس کو بتاؤ گے کہ تم تیمور حسین ہو فرام ڈیلی ریوولوشن.......... تو وہ تمہارے سامنے بچھ جائے گا۔ تم اس کی میز پر ٹانگیں پھیلا کر بھی بیٹھ جاؤ گے تو وہ برا نہیں مانے گا۔ اس لئے کہ اسے تمہارے کالم میں اپنا تذکرہ پڑھوانے کی خواہش ہو گی۔ اسلام آباد میں پولیس والے تم سے یوں بچیں گے' جیسے تم

کوئی چلتی پھرتی متعدی بیماری ہو۔ وہاں کوئی تمہیں کچھ نہیں بتائے گا۔ کوئی تمہارے ساتھ تعاون نہیں کرے گا۔ کوئی تمہیں کچھ بتائے گا تو اس صورت میں کہ اس کی زندگی تمہارے رحم و کرم پر ہو یا اس لئے کہ اس کی اشاعت اس کے اور اس کے آقاؤں کے لئے سود مند ہو۔ یاد رکھو' وہاں کوئی آزاد نہیں' کوئی کتنے ہی بڑے منصب پر فائز ہو' اس کا کوئی نہ کوئی آقا ضرور ہو گا۔"

تیمور خاموش بیٹھا مسکراتا رہا۔ عمر نے اسے سگریٹ دی جو اس نے قبول کر لی۔

"بس اتنا کافی ہے۔" عمر نے کہا۔ "وہاں تم آزاد ہو گے لیکن یہ یاد رکھنا کہ مجھے یہاں اخبار نکالنا ہے۔ مجھے یہ احساس دلاتے رہنا کہ وہاں میرے پاس ایک قابل اعتماد رپورٹر موجود ہے جو خود کو اور اخبار کو کسی دشواری میں ڈالے بغیر اپنا کام چلا سکتا ہے۔ باقاعدگی سے فون پر رپورٹ دیتے رہنا۔"

"اوکے سر۔"

"گڈلک تیمور۔ جانے سے پہلے مجھ سے مل لینا۔"

☆============☆============☆

آفس سے نکلتے ہی تیمور کا سامنا تسکین سے ہو گیا۔ "واہ.......... اس وقت تو میں خدا سے جو بھی مانگتا' مل جاتا۔" تیمور نے چہک کر کہا۔ "مجھے خوشی ہے کہ میں نے اہم ترین خواہش کی۔"

تسکین کو اس کی موجودگی بھاری بوجھ محسوس ہوئی۔ ایک لمحے کو اسے ایسا لگا جیسے وہ درندہ ہے' اس پر اچھلے گا' اپنے جبڑے کھولے گا اور اسے ہڑپ کر جائے گا۔

"عمر صاحب مجھے اسلام آباد بھیج رہے ہیں۔" تیمور نے کہا۔

"تمہیں تو بہت اچھا لگے گا وطن واپس جانا۔"

تسکین کو صرف دیکھ کر تیمور کا وہ احساس فتح پوری قوت سے ابھر آیا جسے وہ عمر کے سامنے دباتا رہا تھا۔ "ظاہر ہے۔" اس نے کہا۔ "آؤ سڑک پار جو کی بار میں چل کر کچھ پئیں' جشن منائیں۔"

"نہیں تیمور' مجھے کام کرنا ہے۔" تسکین نے کہا۔ وہ اس کے ساتھ بار میں تنہا نہیں بیٹھنا چاہتی تھی جہاں وہ ٹکٹکی باندھ کر اسے دیکھتا رہے۔

"تو میرے ساتھ ڈرائیو پر چلو۔ مختصر سی ڈرائیو۔ میں اتنی تیز ڈرائیو کروں گا کہ تمہیں چکر آ جائیں گے۔ جانتی ہو' پیڑوں پر ہری ہری دھند اتر آئی ہے.........."

تسکین نہیں چاہتی تھی کہ اسے چکر آئیں۔ کون جانے' ایسے میں کیا ہو جائے۔

"نہیں تیمور.........."

"تو رات کا کھانا میرے ساتھ کھاؤ۔ کل میں چلا جاؤں گا۔"

یہ بھی ناممکن تھا۔ ریستوران کی مدھم روشنی میں' رومان پرور ماحول میں اس کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھانا۔ جبکہ وہ پی رہا ہو گا! تسکین جانتی تھی کہ وہ اس کی طرف کھنچتی ہے لیکن اس نے کبھی تجزیہ کرنے' اپنے جذبات کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ بلکہ وہ اس سے بچتی تھی۔ ڈرتی تھی کہ ذہن کے نہاں خانے کو کریدے گی تو پنڈورا باکس کھل جائے گا۔ جانے کیسی کیسی بلائیں نکلیں گی اور زندگی تہہ و بالا ہو کر رہ جائے گی۔ وہ یہ نہیں سمجھتی تھی کہ شعور سے فرار لاشعور کو قوی تر کر دیتا ہے اور انسان کمزور ہو جاتا ہے۔ لاشعور سے شعور میں لائی جائیں تو بڑی سے بڑی باتیں اہمیت کھو دیتی ہیں۔ "نہیں تیمور۔ آج ہمارے ہاں کچھ لوگ مدعو ہیں۔" اس نے جواب دیا۔ "میں رات کا کھانا باہر نہیں کھا سکتی۔"

تیمور نے اچانک اپنی شخصیت کا دباؤ اس پر سے ہٹا لیا جس کے ذریعے وہ اس پر چھا جانے کی کوشش کر رہا تھا۔ "تو ایسا کرو' میرے ساتھ ٹہلنے کے لئے چلو۔ بس ایک بلاک کا چکر لگا کر واپس آ جائیں گے۔" اس نے کہا۔ "مجھے تم سے باتیں کرنی ہیں۔ کل میں جا رہا ہوں نا۔"

ایسا لگتا تھا کہ تیمور نے اس کی سوچ پڑھ لی ہے۔ جان لیا ہے کہ وہ اس کے ساتھ تنہائی میں خود کو محفوظ نہیں سمجھتی۔ اور نئی پیشکش کے ذریعے جیسے وہ اس سے کہہ رہا تھا.......... بھری پری سڑک پر تو تم غیر محفوظ نہیں ہو گی۔ اب اس کے انداز میں لڑکپن تھا' نرمی تھی۔ تسکین نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "ٹھیک ہے.......... چلو"

تیمور کو اب بھی اس کے موڈ کا احساس تھا۔ اس نے اس کا ہاتھ تھامنے کی کوشش نہیں کی کہ اس کا لمس اسے بدکا دے گا۔ وہ خاموشی سے اس کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔

"کیا تم اپنی بات ہمیشہ یونہی منوا لیتے ہو تیمور؟" تسکین نے اچانک پوچھا۔

"ہاں- کیونکہ میں جب کوئی خواہش کرتا ہوں تو اس کے حصول کی کوشش میں اپنا سب کچھ جھونک دیتا ہوں- میں دوسروں کو دھکیل دھکیل کر اپنے لئے راستہ بناتا ہوں- یہاں تک کہ جو چاہتا ہوں' وہ حاصل کرلیتا ہوں- بس یہ خود بخود ہوتا ہے- کیا یہ بری بات ہے؟"

"جیسے اسلام آباد جانے کی خواہش پوری کی ہے؟"

"ہاں-"

اب وہ ایونیو مونٹی نون سے مڑکر رونڈ پوائنٹ کی طرف بڑھ رہے تھے- وہ بلاک جس کے گرد انہیں چکر لگانا تھا' بہت بڑا تھا- تسکین نے ایک خاص مقصد کے تحت چہل قدمی کی دعوت قبول کی تھی- اب وہ اس مقصد کی طرف آئی- "تیمور.......... تم اسلام آباد کیوں جانا چاہتے ہو؟" اس نے پوچھا-

تیمور نے چند لمحے اسے غور سے دیکھا- وہ اسے سب کچھ بتانے کے لئے تڑپ رہا تھا- اپنے خواب اور عزائم اس سے سنبھالے نہیں جا رہے تھے- وہ تسکین کو وہ سب کچھ سونپ دینا چاہتا تھا- وہ اس کی آنکھوں میں اپنے لئے ستائش کی چمک دیکھنا چاہتا تھا لیکن وہ ہچکچایا پھر وہ اس ارادے سے باز آگیا- اسے اس پر اعتماد نہیں تھا- وہ بہرحال عمر کی بیوی اور اس کی ساتھی تھی- وہ عمر کو بتا دیتی.......... کوئی اشارہ ہی دے دیتی تو.......... تو اسلام آباد جانا کینسل ہو سکتا تھا- "میں وہاں سے تمہارے لئے کوئی بے بہا تحفہ لاتا.......... اسے تمہاری گود میں ڈالنا چاہتا ہوں-" اس نے جواب دیا-

"تیمور.......... تمہیں کبھی خوف نہیں آتا؟" تسکین نے عجیب سے لہجے میں پوچھا-

"خوف؟ کس سے؟"

"اپنی بات درست ہونے کے یقین سے- لوگوں کو دھکیل کر اپنا راستہ صاف کرنے سے- اپنی پسند کی چیز حاصل کرنے سے' خواہ وہ کسی اور کے لئے اس سے زیادہ اہمیت رکھتی ہو-"

تیمور نے ایک گہری سانس لی اور خود کو یاد دلایا کہ یہ پیرس ہے اور وہ اس لڑکی کے ساتھ پیرس کی سڑک پر ٹہل رہا ہے جس سے محبت کرتا ہے- اور وہ لڑکی ذرا پہلے

اس کی قوت اور اپنی کمزوری کا اعتراف کر چکی ہے اور وہ اعتراف ایک طرح کی خود سپردگی کا اظہار تھا- اب آگے کی ذمے داری اس کی تھی-

اب وہ رونڈ پوائنٹ اور چیمپس ایلی سیز کے علاقے میں تھے- تقریباً فٹ پاتھ پر کھڑا ایک جوڑا ان کے راستے میں حائل تھا- پیرس میں ایسے جوڑے نظر آنا کوئی غیر معمولی بات نہیں- فٹ پاتھ پر لوگ چل پھر رہے تھے- سڑک پر ٹریفک کا اژدہام تھا لیکن وہ ان تمام چیزوں سے بے نیاز' مصروف محبت تھے-

وہ دونوں آگے بڑھ گئے لیکن اس منظر نے تیمور کے جذبے کو ہوا دے دی- اس نے تسکین کا ہاتھ پکڑا اور اسے ایک بند دروازے کی طرف لے گیا- یوں وہ کم از کم فٹ پاتھ پر نہیں تھے- دروازے سے فٹ پاتھ تک ایک بجریلا راستہ تھا- چھت ہونے کی وجہ سے وہاں نیم تاریکی تھی- تیمور نے تسکین کو بانہوں میں لے لیا اور اس کے چہرے پر جھک گیا..........

دروازہ دھڑ سے کھلا تو تیمور اچھل کر ایک طرف ہو گیا- دروازے سے آنے والا معذرت کرتا ہوا فٹ پاتھ پر چلا گیا لیکن اس لمحے کا جادو ٹوٹ چکا تھا- تیمور نے اس لمحے کو دوبارہ پکڑنے کی کوشش بھی نہیں کی- اب وہ جانتا تھا.......... اسے یقین تھا کہ ایسے بے شمار لمحے اسے ملیں گے- اس نے تسکین کو دیکھا جس کا چہرہ تمتما رہا تھا- وہ اس سے نظریں چرا رہی تھی- اس نے پرس سے رومال نکال کر اپنے ہونٹوں سے لپ اسٹک صاف کی اور دوبارہ لپ اسٹک لگائی- تیمور کو بھی احساس ہوا- اس نے جیب سے رومال نکال کر اپنے ہونٹ صاف کر لئے-

وہ دونوں باہر آئے اور خاموشی سے چلنے لگے- دفتر کی عمارت کے سامنے پہنچ کر تیمور نے کہا- "گڈ بائی تسکین- میں تم سے رابطہ رکھوں گا-"

"گڈ لک تیمور-" تسکین نے کہا- پھر وہ بہت کوشش کرکے مسکرائی اور پلٹ کر دفتر کی طرف چل دی- وہ خود سے اتنی خفا تھی کہ پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی-

☆==========☆==========☆

اگلے روز سہ پہر تک تیمور روانگی کی تیاریاں مکمل کر چکا تھا- اس نے گاڑی بلڈنگ کے سامنے پارک کی اور ساتھیوں کو خدا حافظ کہنے اندر چلا گیا- ادارتی کمرے میں

سب لوگ اپنے اپنے کام میں مصروف تھے۔ تیمور نے اندر جاتے ہی اعلان کیا۔ "ہیلو ڈیسک کمانڈوز.........ناچیز تو فیلڈ ورک کے لئے چلا۔"

کچھ لوگ یہ خبر افواہ کی شکل میں سن چکے تھے۔ کچھ یقینی طور پر جانتے تھے اور کچھ ایسے تھے جنہیں کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔

"کہاں کا ارادہ ہے؟" نواب نے پوچھا۔

"اسلام آباد جارہا ہوں۔"

"اسلام آباد والوں کے لئے پہلے ہی کم پریشانیاں ہیں کہ تم ان میں اضافہ کرنے چلے۔" نوب نے ہنستے ہوئے کہا۔

تھائرا ایڈی سن اپنے مخصوص انداز میں چلائی۔ "ڈارلنگ! وہاں کی عورتوں پر نظر رکھنا۔ فیشن کی کوئی غیر معمولی چیز نظر آجائے تو تصویر کھینچ کر مجھے بھیج دینا۔"

صدیق بولا۔ "پیارے......... خوش نصیب ہو کہ وطن واپس جارہے ہو۔ میں تو بس وطن کے خواب ہی دیکھ سکتا ہوں۔"

"وہاں تمہیں ایک اور کتاب کے لئے مواد مل جائے گا۔" زبیر نے کہا۔

وقار بولا۔ "ہاتھ پاؤں بچا کر کام کرنا وہاں۔"

سب بولتے رہے۔ بس نیلوفر چپ چاپ اپنی جگہ بیٹھی رہی۔ وہ دونوں ہاتھ اپنی گود میں رکھے خالی خالی نظروں سے اپنے ٹائپ رائٹر کو گھور رہی تھی۔ اس رات کے بعد وہ تیمور سے بس آفس میں ملی تھی۔ اور اب وہ اسلام آباد جارہا تھا اور اس رات اس نے کہا تھا کہ سرحد پار کر کے کشمیر پہنچنا کوئی بڑی بات نہیں۔ اسے آہستہ آہستہ سب کچھ یاد آیا اور وہ خوفزدہ ہوگئی۔ اس کے ساتھ گزرا ہوا وقت اس کی آنکھوں کے سامنے تیزی سے اڑتا ہوا گزر رہا تھا۔ وہ بت بنی بیٹھی تھی۔ کچھ بولنا.........اس طلسم کو توڑنا اس کے اختیار میں نہیں تھا اور کسی بھی لمحے وہ پلٹ کر جا سکتا تھا۔ اس کے کانوں میں تیمور کے اس رات کے کہے ہوئے لفظ گونج رہے تھے.........میں چوبیس گھنٹے کے اندر سرحد پار کر لوں گا.........

پھر اس کے بعد؟ نیلوفر نے سوچا۔ اور اگر تیمور کو کچھ ہوگیا۔ وہ دوبارہ اس سے

نہ مل سکی؟ تیمور نے کسی اور کو بھی اپنے عزائم کے بارے میں بتایا ہے؟ اس رات وہ سنجیدہ تھا یا نشے میں بڑبولا پن کر رہا تھا؟ کیا صرف وہی جانتی تھی کہ تیمور اسلام آباد جا کر کیا کچھ کر سکتا ہے؟ تیمور کو کچھ ہوگیا تو.........

اسی لمحے تیمور کی نظریں اس کی طرف اٹھیں۔ دونوں کی آنکھیں ملیں۔ تیمور' نیلوفر کو بھول ہی بیٹھا تھا مگر اب اسے یاد آگیا اور یاد کیا آیا کہ اس کے ذہن میں خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔ اسے مونٹ مارٹر کی وہ رات یاد آئی۔ اپنی بے خودی' اپنے محسوسات یاد آئے۔ یہ یاد آیا کہ اس نے نیلوفر کو اپنے ارادوں کے متعلق بتایا تھا۔ اسی لئے اس رات کے بعد سے وہ اس سے گریزاں رہا تھا کہ کہیں وہ سنجیدہ نہ ہو جائے۔ وہ بلاشبہ بہت پیاری لڑکی تھی اور وہ اسے کوئی دکھ نہیں دینا چاہتا تھا۔ وہ فرسٹریشن دور کرنے کی دوا کے طور پر تو استعمال کی جا سکتی تھی لیکن اس کے ساتھ پوری زندگی گزارنے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔

تیمور نے سوچا' فرض کرو کہ وہ اب بھی تم پر اسی طرح مرتی ہے۔ اب بھی خوابوں کی دنیا میں رہ رہی ہے اور فرض کرو' جو کچھ اس نے تم سے اس رات سنا تھا' کسی اور کو بتا دیتی ہے اور بات کسی طرح عمر تک پہنچ جاتی ہے تو عمر اسلام آباد روانگی منسوخ بھی کر سکتا ہے اور اگر تم جا چکے ہو تو تمہیں واپس بھی بلوا سکتا ہے۔

"اس نے نیلوفر کا زرد چہرہ' خوف زدہ آنکھیں اور لرزتے ہونٹ دیکھے جو اس کا نام لینے کی کوشش کر رہے تھے۔ ہاں......... وہاں اب بھی آگ جل رہی تھی اور اس آگ کو بجھانا ضروری تھا۔ اس کا رد عمل جبلی تھا۔ وہ نیلوفر کی آنکھوں میں دیکھتا رہا پھر اس نے سر ہلا کر دروازے کی طرف دیکھا۔ نیلوفر کی آنکھوں میں اس کا اشارہ دیکھ کر جو امید چمکی' وہ اس کے لئے بے حد طمانیت بخش تھی۔

"اچھا دوستو......... خدا حافظ۔" تیمور نے کہا اور لفٹ کی طرف کھلنے والے دروازے سے باہر نکل گیا۔ سیڑھیوں سے ہٹ کر لفٹ کی سائیڈ میں وہ نیلوفر کا انتظار کرتا رہا۔ نیلوفر اس کے پیچھے ہی نکل آئی تھی۔ "میں تمہیں اکیلے میں خدا حافظ کہنا چاہتا تھا بے بی........." اس نے سرگوشی میں کہا اور نیلوفر کو بانہوں میں سمیٹ لیا۔

"تیمور......... تیمور........." وہ اکھڑی ہوئی سانسوں کے درمیان کہہ رہی تھی۔

"مجھے تمہارے جانے کی خبر ہی نہیں تھی۔ مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے تیمور۔ تم وہ سب کچھ تو نہیں کرو......... نہیں کرو گے.........؟"

تیمور اس پر جھکتے ہوئے لاابالی پن سے ہنس دیا۔ وہ اس وقت اپنا سب کچھ محبت کی بھوکی اس لڑکی پر آزما رہا تھا۔ اپنی آنکھیں' قوت ارادی اور ہاتھوں کا لمس۔ "بے بی......... نشے میں کہی ہوئی کوئی بات سچی کہاں ہوتی ہے۔" اس نے کہا۔ "اس روز میں نے جانے کیا کچھ کہا ہو گا لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں بے وقوف ہوں اور مجھے مصیبت میں پھنسنے کا شوق ہے۔ جو کچھ میں نے اس رات کہا تھا' بھول جاؤ۔ میں نہیں چاہتا کہ کوئی میرے متعلق غلط تاثر لے۔"

نیلوفر نے سوچا' دنیا کا ہر مرد بڑی بڑی باتیں کرتا ہے اور تحفظ عورت کے قرب میں تلاش کرتا ہے۔ یہ تیمور بھی ایسا ہی ہے۔ چاہتا ہے کہ میں اس کے کمزور لمحات کو دوسروں کے سامنے نہ لاؤں۔ اس کے باوجود چند لمحے اس کا خوف اپنی جگہ رہا۔ "تیمور......... تم اپنا خیال رکھنا۔ رکھو گے نا؟ وعدہ کرو۔"

"تم فکر ہی نہ کرو بے بی۔"

اس نازک' شیریں لمحے میں نیلوفر نے اپنی بانہیں اس کی گردن میں حمائل کرتے ہوئے اپنے پیاسے ہونٹ اوپر اٹھائے۔ تیمور رشوت دینے کے لئے پوری طرح تیار تھا لیکن ایک عجیب بات ہوئی۔ پہلے کی طرح اس بار بھی اس کے ہونٹوں کی نرمی اور حلاوت نے اسے حیران کر دیا۔ رشوت ضرورت بن گئی۔ جب وہ ہٹا تو درحقیقت ہٹنا نہیں چاہ رہا تھا۔ تاہم وہ ہٹا' اس نے نیلوفر کی پیشانی پر الوداعی بوسہ ثبت کیا اور چلا گیا۔

نیلوفر نے اسے دو دو سیڑھیاں اترتے سنا پھر باہری دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز سنائی دی۔ تب وہ ادارتی کمرے کی طرف چلی جہاں اس کی غیر موجودگی سبھی نے محسوس کر لی تھی۔

نواب کمرے کے بیچ میں بیٹھا تھا اس لئے مس کچھ بھی نہیں کرتا تھا۔ اس نے تیمور اور نیلوفر کی آنکھوں کی گفتگو بھی سنی تھی اور تیمور کے فوراً بعد نیلوفر کو نکلتے بھی دیکھا تھا۔ "ارے بھائی......... یہ کیا ہو رہا ہے۔ کیا اسے دفتری رومانس کہتے ہیں۔" وہ بڑبڑایا۔ "مگر میری عقل میں نہیں آتا۔ کہاں تیمور اور کہاں وہ خشک ٹہنی نیلوفر۔"

صدیق نے کہا۔ "ہاں......... مگر ہوا تو یہی ہے۔ تیمور اسے بلا کر گیا تھا۔"

ہمیشہ کی طرح فیصلہ کن بات وقار نے ہی کی۔ "تم لوگ کیسے اخبار نویس ہو۔ مشاہدہ تک نہیں ہے تمہارے پاس۔" اس نے ملامتی لہجے میں کہا۔ "مسٹر تیمور جس کی محبت کی دلدل میں گردن تک اترے ہوئے ہیں' وہ کوئی اور نہیں' باس کی بیوی ہے۔ کیا تم لوگوں کے پاس آنکھیں نہیں ہیں!"

☆============☆============☆

تیمور حسین کو گئے ایک ہفتہ ہو چکا تھا۔ یہ وہ شام تھی جب اسے اسلام آباد سے فون کر کے اپنی پہلی اسٹوری ریکارڈ کرانا تھی۔ نیلوفر کو معلوم تھا کہ اسے فون ریکارڈ کرانے کے لئے پانچ بجے کا وقت دیا گیا ہے۔ چار بجے سے اس کی نظریں کلاک پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ نروس بھی تھی اور فکر مند بھی۔ وہ اس کی بھاری گونج دار آواز سننا چاہتی تھی۔ یہ جاننے کے لئے کہ اس کا خوف بے بنیاد تھا اور تیمور محفوظ ہے' یہی ایک صورت تھی۔ خوف اس ایک ہفتے میں اس سے آسیب کی طرح چمٹ کر رہ گیا تھا۔

پانچ بجنے میں دس منٹ پر اس کی قوت برداشت جواب دے گئی۔ وہ ٹیلی فون آپریٹر نین میلٹ کے پاس چلی گئی۔ بہانہ یہ تھا کہ وہ اس کا ہاتھ بٹانے آئی ہے۔ نین نے شکریہ ادا کرتے ہوئے اس کی پیشکش قبول کر لی۔ کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ کالز لیٹ بھی ہو جاتی تھیں۔ بعد کی کال پہلے آ جاتی تھی اور پہلے آنے والی کال بعد میں آتی تھی۔

نیلوفر نے نین کے سامنے رکھا کالز شیڈول دیکھا۔ بروسلز' پونے پانچ بجے۔ اسلام آباد' پانچ بجے۔ روم' سوا پانچ بجے۔ برلن' ساڑھے پانچ۔ استنبول' پونے چھ بجے اور پراگ ساڑھے چھ بجے۔

ٹیلی فون کی گھنٹی نیلوفر کے چٹختے ہوئے اعصاب کے لئے دھماکے سے کم نہیں تھی۔ نین نے ریسیور اٹھایا۔ "یس......... یس......... مسٹر ایکر۔ ابھی لیجئے۔" وہ نیلوفر کی طرف مڑی۔ "بروسلز کی کال لیٹ ہے۔ یہ مسٹر ایکر ہیں۔ آٹھ سو الفاظ کی اسٹوری ہے۔"

نیلوفر کو اپنا منہ خشک ہوتا محسوس ہوا۔ وہ بولی تو اس کی آواز نیچرل نہیں تھی۔ "میں اگلی کال ریسیو کروں گی۔"

نین نے سر کو تفہیمی جنبش دی۔ اس نے سبز رنگ کی سلولائیڈ کی ریکارڈنگ ڈسک اٹھائی اور سٹی روم میں چلی گئی جہاں دو ٹیلی فون ریکارڈنگ بوتھ موجود تھے۔ نیلوفر مطمئن ہو گئی۔ اگلی کال تیمور کی ہوتی۔ وہ اس کی کال ریسیو کرتی' اس کی آواز سنتی۔ وہ سنتا کہ اس کی پہلی اسٹوری نیلوفر ریکارڈ کر رہی ہے تو "یقیناً" خوش ہوتا۔

پانچ بجے نیلوفر کے اعصاب وائلن کے تاروں کی طرح کھنچنے لگے لیکن تیمور کی کال نہیں آئی۔ پانچ بج کر دس منٹ پر فون کی گھنٹی بجی تو اس نے سکون کی سانس لیتے ہوئے ریسیور اٹھایا لیکن دوسری طرف سے روم کا آپریٹر بول رہا تھا۔ وہ روم میں نمائندہ انقلاب کی کال تھی۔ "میں نیلوفر ریاض ہوں۔" وہ دوسرے بوتھ میں چلی گئی۔ یہ چیک کرنے کے بعد کہ دوسری طرف سے آواز صاف آ رہی ہے' اس نے ریکارڈر سے کنکشن جوڑا اور ریکارڈر کو آن کر دیا۔ اسی وقت اس نے پہلے بوتھ سے نین کو نکلتے دیکھا۔ روم کے نمائندے نے ایک ہزار الفاظ کی اسٹوری ریکارڈ کرائی۔ وہ چند منٹ نیلوفر کو بہت طویل لگے۔

بالآخر وہ نمٹ کر نکلی تو نین ایک اور کال ریکارڈ کرنے کے لئے بوتھ میں جا رہی تھی۔ اس نے پوچھا۔ "نیلو.......... تمہاری کال اسلام آباد کی تھی؟"

نیلوفر نے نفی میں سرہلایا۔ "نہیں' روم کی تھی۔"

نین نے کہا۔ "استنبول کی کال برلن سے پہلے آ رہی ہے۔ اس وقت تم میری مدد نہ کر رہی ہوتیں تو میں تو پاگل ہو جاتی۔ آج معاملات بری طرح الجھے ہوئے ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ برلن اور اسلام آباد کی کالز ایک ساتھ آئیں گی۔ جب گڑبڑ ہوتی ہے تو ایسا ہی ہوتا ہے۔"

لیکن ایسا ہوا نہیں۔ برلن کی کال تو آ گئی' اسلام آباد کی نہیں آئی۔ پھر پراگ کی کال پہلے آئی اور لندن کی طویل کال بعد میں۔ سات بجے کے قریب نین نے کہا۔ "اوہ ڈیئر.......... مجھے آج رکنا پڑے گا اسلام آباد کی کال کے لئے۔ جبکہ میں نے کسی سے ڈنر کا وعدہ بھی کر لیا تھا.........."

☆------------☆------------☆

"تم چلی جاؤ۔ میں رک جاؤں گی۔" نیلوفر نے پیشکش کی۔

"تم بہت پیاری لڑکی ہو نیل۔" نین نے کہا۔ "آٹھ بجے کے بعد رکنے کی ضرورت نہیں۔ آٹھ بجے کے بعد عام طور پر کال نہیں آتی۔" یہ کہہ کر وہ نیلوفر کو بیٹھا چھوڑ کر چلی گئی۔

ساڑھے نو بجے کے بعد ڈیڈ کھانا کھا کر واپس آیا تو اسے ریکارڈنگ روم کھلا دیکھ کر حیرت ہوئی۔ وہ اس طرف چلا گیا اور دروازہ کھول کر اندر دیکھا۔ اندر شیڈ چڑھا ٹیبل لیمپ روشن تھا۔ دھیمی روشنی میں چشموں سے جھانکتی ہوئی نیلوفر کی خوفزدہ آنکھیں عجیب سی لگ رہی تھیں۔

"ہیلو نیل.......... تم یہاں اندھیرے میں بیٹھی کیا کر رہی ہو؟" ڈیڈ نے پوچھا۔

نیلوفر نے لرزیدہ آواز میں کہا۔ "میں نے نین سے وعدہ کیا تھا کہ میں یہاں رکوں گی.......... اسلام آباد سے تیمور کی کال ریسیو کرنے کے لئے.........."

"کال اب تک نہیں آئی ہے تو آج آئے گی بھی نہیں۔" ڈیڈ نے کہا۔ "تم اس کے لئے یہاں بیٹھی ہو۔ جاؤ.......... جا کر کھانا کھاؤ۔ شاید تیمور کے پاس بھیجنے کے لئے کوئی خبر ہی نہیں ہو گی۔"

نیلوفر کچھ عجیب سی ہو گئی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور ہونٹ بھنچے ہوئے تھے۔

ڈیڈ ہام چند لمحے اسے بغور دیکھتا رہا پھر اس نے آگے بڑھ کر اپنی انگلی سے اس کی ٹھوڑی پکڑ کر چہرہ اٹھایا اور بولا۔ "گڑیا.......... تم کسی مشکل میں پھنس گئی ہو کیا؟ ایسا کرو' سب کچھ کسی کو بتا کر دل کا بوجھ ہلکا کر لو.........."

نیلوفر نے اس کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ چند لمحے وہ خاموش رہی پھر

اس نے سرگوشی میں کہا۔ "ڈیڈ............ مجھے خوف آ رہا ہے۔ ڈر لگ رہا ہے کہ تیمور کو کچھ ہو گیا ہے............؟"

ڈیڈ خوش دلی سے ہنس دیا۔ اس نے میز کے کنارے پر ٹکتے ہوئے کہا۔ "اس گوشت کے پہاڑ کو بھلا کیا ہو سکتا ہے۔ کسی لڑکی کے چکر میں پھنس گیا ہو گا۔"

نیلوفر اتنے جذباتی لہجے میں بولی کہ ڈیڈ بھی حیران رہ گیا۔ "بات ایسی ہوتی تو میں ہرگز پریشان نہ ہوتی ڈیڈ۔ میں آپ کو کچھ بتانا چاہتی ہوں مگر وعدہ کریں کہ آپ کسی اور کو یہ بات نہیں بتائیں گے۔ اس لئے کہ میں نے تیمور سے وعدہ کیا تھا کہ میں کسی کو نہیں بتاؤں گی لیکن تیمور کو کسی طرح کا خطرہ ہو' یہ میں برداشت نہیں کر سکتی۔ میں نے کسی کو نہیں بتایا تو پشیمان رہوں گی۔"

"ہاں............ بات تو ٹھیک ہے۔ مجھے بتاؤ کہ وہ بن مانس کس چکر میں ہے۔" ڈیڈ نے کہا۔ دل ہی دل میں اس نے تیمور کو جھاڑنے کے لئے پوری تقریر تیار کر لی تھی۔ اتنی سیدھی سادی اور شریف النفس لڑکی کو خراب کرنے کی کیا تک تھی۔ ڈیڈ کے ذہن میں یہی ایک بات تھی۔ لہٰذا جب نیلوفر نے تفصیل سے اسے حقیقت بتائی تو اسے شاک لگا۔ یعنی تیمور جو شیخیاں مارتا تھا' ان پر عمل کرنے کا ارادہ بھی رکھتا تھا۔ "تمہیں یہ یقین کیوں ہے کہ وہ واقعی سرحد پار کرنے کی کوشش کرے گا؟" سب کچھ سننے کے بعد اس نے نیلوفر سے پوچھا۔

"آپ سمجھ ہی نہیں رہے ہیں۔" نیلوفر نے شکایتی لہجے میں کہا۔ "وہ کچھ کرنا چاہے............ ارادہ کر لے تو اسے دنیا کی کوئی طاقت نہیں روک سکتی۔ وہ ناقابل تسخیر ہے۔ اب میں سوچتی ہوں' میں نے برا کیا۔ میں پہلے ہی کسی کو بتا دیتی تو شاید عمر صاحب اسے جانے ہی نہیں دیتے لیکن اس نے قسم کھا کر کہا تھا کہ اس نے نشے میں وہ ڈینگ ماری تھی۔ اس نے وعدہ لیا کہ میں یہ بات کسی کو بتا کر اس کی شرمندگی کا سامان نہیں کروں گی۔ ڈیڈ' اب اسے کچھ ہوا تو صرف میری وجہ سے ہو گا۔ یہ بات میرے لئے ناقابل برداشت ہے ڈیڈ............"

ڈیڈ خود کچھ پریشان ہو گیا تھا لیکن اس نے دلاسا دینے والے انداز میں کہا۔ "کیا حماقت ہے۔ بھول جاؤ یہ سب۔ جا کر سکون سے کھانا کھاؤ۔ تیمور جیسے لوگ جب تک

ہفتوں غائب نہ ہوں' ان کے لئے پریشان نہیں ہوتے۔ یہ ٹینک جیسے لوگ............ انہیں آسانی سے کچھ نہیں ہوتا۔ کیا پتا' وہاں ابھی تک اس کی دعوتیں چل رہی ہوں۔ آخر وہ برسوں بعد وطن واپس گیا ہے۔" ڈیڈ نے کندھوں سے تھام کر اسے کرسی سے اٹھایا اور اسے دھکیلتے ہوئے سٹی روم میں لے آیا۔ چمڑے کی جیکٹ اسے تھماتے ہوئے اسے باہر چھوڑ آیا۔

"ڈیڈ............ سچ' آپ بہت پیارے آدمی ہیں۔" نیلوفر نے کہا۔

"تم بھول جاؤ' بے فکر ہو جاؤ۔ وہ گوریلا اپنا خیال رکھ سکتا ہے۔ اب تم جاؤ' مجھے بہت کام کرنا ہے۔" ڈیڈ نے کہا لیکن اسے خود بھی اپنی بات پر یقین نہیں تھا۔ وہ جانتا تھا کہ تیمور ایک اچھا صحافی ہے اور جب کوئی اچھا صحافی کسی اسٹوری کے چکر میں پڑتا ہے تو کسی قیمت پر اس کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ اسے یقین ہو گیا کہ تیمور نشے میں ہو یا نہ ہو' اس نے نیلوفر سے جو کچھ کہا تھا' سچ کہا تھا۔

وہ سیدھا عمر کے دفتر میں گیا۔ وہاں معلوم ہوا کہ عمر اور تسکین کھانا کھانے کے لئے دیر سے نکلے ہیں اور دس بجے سے پہلے ان کی واپسی نہیں ہو گی۔ اس نے پیغام چھوڑ دیا کہ واپس آتے ہی وہ اس سے مل لیں۔ اپنے کمرے میں واپس آ کر پہلے تو اس نے کچھ ٹرنک کالز بک کرائیں پھر کشمیر کا نقشہ کھول کر بیٹھ گیا۔ وہ کشمیر کے محل وقوع سے ناواقف تھا۔ اس کے باوجود اس نے سمجھ لیا کہ اتنی طویل سرحد پر درجنوں ایسے مقامات ہوں گے جہاں سے مقبوضہ کشمیر میں داخل ہوا جا سکتا ہے۔

ساڑھے دس بجے عمر اور تسکین واپس آئے۔ ڈیڈ نے ان کے سامنے پوری صورت حال رکھ دی۔ "تیمور کی طرف سے کوئی پیغام موصول نہیں ہوا ہے۔" اس نے کہا۔ "کچھ دیر پہلے میری نیلوفر سے بات ہوئی ہے۔ وہ اس کی طرف سے بہت پریشان ہے۔ تین ہفتے پہلے اس نے نشے میں نیلوفر سے کہا تھا کہ اگر وہ پاکستان پہنچ گیا تو اسے کشمیر میں داخل ہونے میں صرف چوبیس گھنٹے لگیں گے۔ اب اسے گئے ہوئے ایک ہفتہ ہو چکا ہے۔"

عمر کچھ دیر سوچتا رہا پھر بولا۔ "تم نے اسلام آباد' پرل کانٹی نینٹل سے رابطہ کیا فون پر؟"

"کال بک کرا دی ہے۔" ڈیڈ نے کہا۔ "میں نے مظفر آباد کے لئے بھی کال بک کرائی ہے۔ مجھے یاد تھا کہ میجر رحیم تمہارا دوست ہے۔ لو......... شاید کال مل گئی ہے۔" اس نے فون کی گھنٹی بجنے پر کہا اور ریسیور اٹھا لیا۔ "ہیلو میں روزنامہ انقلاب سے بات کر رہا ہوں......... پیرس سے۔" اس نے کہا۔ "پلیز آپ چیک کریں کہ ہمارے نمائندے تیمور حسین اپنے کمرے میں موجود ہیں یا نہیں۔ نہیں ہیں تو انہوں نے کوئی پیغام چھوڑا ہے؟ ان سے کہاں بات کی جا سکتی ہے۔ ہمیں ان سے ضروری بات کرنی ہے۔ جی' میں ہولڈ کر رہا ہوں........."

عمر اور تسکین دونوں ڈیڈ کی طرف متوجہ ہو گئے۔ عمر پریشان ہونے کے باوجود یہ سوچ رہا تھا کہ اس وقت تسکین کیا سوچ رہی ہو گی۔

چند لمحے بعد ڈیڈ نے ماؤتھ پیس میں کہا۔ "جی ہاں' میں سن رہا ہوں۔ وہ کمرے میں موجود نہیں۔ کیا مطلب......... کب سے نہیں آئے؟ آپ نے آخری بار انہیں کب دیکھا تھا.........؟ تین رات پہلے؟ اور رات کی ڈیوٹی پر روز آپ ہی ہوتے ہیں؟ انہوں نے کوئی پیغام نہیں چھوڑا؟ ان کا سامان کمرے میں موجود ہے؟ جی ہاں......... میرا نام ڈیڈ لیپ ہام ہے......... جی شکریہ۔" ریسیور رکھ کر وہ عمر کی طرف مڑا۔ "وہ تین دن سے غائب ہے........." اسی وقت فون کی گھنٹی بجی۔ "یہ تم ریسیو کرو۔" ڈیڈ نے عمر سے کہا۔ "یہ میجر رحیم ہو گا۔"

عمر نے بڑھ کر ریسیور اٹھا لیا۔ "مائی ڈیئر رحیم......... میں میجر عمر بول رہا ہوں......... پیرس سے۔ بس خیریت ہی ہے۔ ایک بے وقوف آدمی نے مسئلہ کھڑا کر دیا ہے۔" اس نے میجر رحیم کو تیمور کے متعلق بتایا۔ "وہ جذباتی آدمی ہے فوجی ہے......... شارٹ سروس کمیشن والا۔ مجھے ڈر ہے کہ اگر وہ پہلے ہی کشمیر میں نہیں گھس چکا تو گھسنے کی کوشش ضرور کرے گا۔ نہیں......... وہ کشمیر سے ناواقف ہے۔ میں نے اسلام آباد سے معلوم کیا۔ وہ تین دن سے اپنے ہوٹل بھی نہیں گیا ہے۔ میں نے سوچا' ممکن ہے تمہاری طرف کسی سے ملا ہو........." وہ کچھ دیر سنتا رہا پھر بولا۔ "اوہ سمجھا۔ یار ذرا چیک کرتا پھر بھی۔ سو کائنڈ آف یو۔ خدا حافظ۔"

ریسیور کریڈل پر رکھ کر عمر نے پیشانی سے پسینہ پونچھا۔ "اس نے وہاں کسی سے

بھی رابطہ نہیں کیا۔" اس نے ڈیڈ کو بتایا۔ "تاہم میجر رحیم نے اسے مظفر آباد میں دیکھا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اس نے تیمور کو غلط قسم کے لوگوں سے ملتے دیکھا ہے۔ ایسے لوگ جن پر کشمیر سے کشمیر کے درمیان اسمگلنگ کا شبہ کیا جاتا ہے۔ اب رحیم مزید معلومات کرنے کے بعد مجھے فون کرے گا۔"

"ہو سکتا ہے' اسے کوئی حادثہ پیش آ گیا ہو۔" تسکین نے سنجیدگی سے کہا۔

عمر نے دل میں سوچا......... اور ممکن ہے' اپنی کسی محبوبہ کے ساتھ بے فکری سے وقت گزار رہا ہو لیکن اس نے یہ بات کہی نہیں۔ پھر اسے اس بات پر غصہ آنے لگا کہ اس نے کہی کیوں نہیں یہ بات۔ عام حالات میں وہ ڈیڈ اور تسکین سے یہ ضرور کہتا لیکن اس معاملے میں اسے ڈر تھا کہ اس سے تسکین کے جذبات کو ٹھیس پہنچے گی۔

تسکین کو احساس تھا کہ حادثے کا خیال محض اس کی اس خواہش کا آئینہ دار ہے کہ کسی پیچیدہ اور سنگین معاملے میں ملوث ہونے کی نسبت تیمور کو حادثہ پیش آنا زیادہ قابلِ قبول تھا لیکن اس کی گفتگو سننے کے بعد اسے اس بات کا یقین ہو گیا تھا۔

"وہ اتنا بے وقوف تو نہیں ہو سکتا کہ کسی سے مشورہ کئے بغیر اندھا دھند سرحد پار کرنے کی کوشش کرے۔" عمر نے تند لہجے میں کہا۔ "وہ جانتا ہے کہ........." اسی لمحے فون کی گھنٹی بجی۔ ان تینوں کے ہاتھ نروس انداز میں ریسیور کی طرف بڑھے مگر تسکین اور ڈیڈ نے فوراً ہی ہاتھ کھینچ لئے۔ عمر نے ریسور اٹھایا۔ "عمر جاوید سپیکنگ۔ یس......... ہیلو بوب! کیا......... تمہیں معلوم ہے.........؟ کیا......... کیا کہہ رہے ہو۔ ٹھیک ہے' ہم اوپر آ رہے ہیں۔" اس نے ریسیور کریڈل پر پٹخا اور ڈیڈ سے کہا۔ "یہ ٹرانس اوشیانک کے باب اسٹوکس کا فون تھا اوپر سے۔ اس کا کہنا ہے کہ سری نگر سے ایک سٹوری آ رہی ہے جس کا تعلق ہم سے ہے۔ لہٰذا بہتر ہو گا کہ ہم اوپر آ جائیں۔"

وہ تینوں لفٹ میں بیٹھ کر پانچویں منزل پر پہنچے جہاں ٹرانس اوشیانک پریس کا آفس تھا۔ آفس میں بوب نروس انداز میں سگریٹ پی رہا تھا۔ اس کی بیوی کانوں پر ائیر فون چڑھائے کچھ ٹائپ کر رہی تھی۔ صاف پتہ چل رہا تھا کہ وہ دوسری طرف سے رک رک کر بولی جانے والی رپورٹ ٹائپ کر رہی ہے۔

"کیا یہ اسٹوری تیمور حسین کے متعلق ہے؟" عمر نے بھاری آواز میں پوچھا۔

بوب اسٹوکس نے سگریٹ جلاتے ہوئے کہا۔ "ہاں عمر' آئی ایم سوری۔ میرا خیال ہے' اسے بری طرح پھانس لیا گیا ہے۔"

وہ تینوں مسز اسٹوکس کے پیچھے جا کھڑے ہوئے اور اس کی رپورٹ پڑھنے لگے۔

"سرینگر کے چیف آف پولیس نے آج اعلان کیا ہے کہ کشمیر میں ایک اور پاکستانی جاسوس اور تخریب کار کو پکڑ لیا گیا ہے۔ وہ کشمیر میں ناجائز طور پر داخل ہوا تھا۔ اس نے اپنا نام تیمور حسین بتایا ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ وہ پیرس کے ایک اردو انگریزی اخبار کا نمائندہ ہے۔ بنیادی طور پر وہ اخبار پاکستانی ہے۔ تاہم اس کے علاوہ اس کے پاس سے نہ پاسپورٹ برآمد ہوا ہے نہ کوئی ایسی دستاویز جس سے اس کے دعوے کی تصدیق ہو۔ اسے سرینگر کی سنٹرل جیل میں رکھا گیا ہے اور اس سے پوچھ گچھ کی جا رہی ہے۔ بھارت کے وزیر داخلہ خواجہ مقصود نے اپنے مختصر بیان میں تیمور حسین کو پاکستانی جاسوس قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ جرم ثابت ہونے پر اس جاسوس کو ہر قیمت پر سزائے موت دی جائے گی..........."

"میرے خدا!" تسکین کراہی۔

☆==========☆==========☆

بھارت میں پاکستانی سفیر کا احتجاج صدا بہ صحرا ثابت ہوا تھا۔ روزنامہ انقلاب کی طرف سے پاکستان کی وزارت خارجہ پر دباؤ ڈالا جا رہا تھا۔ سیکریٹری خارجہ طرح طرح کے پینترے بدل رہا تھا۔ سفارت کاروں کے خاص اسٹائل میں معاملے کو ٹالا جا رہا تھا۔ جوابی حکمت عملی بھی اختیار کی گئی تھی۔ یعنی تیمور کے کئے کی تمام تر ذمے داری عمر جاوید پر ڈال دی گئی تھی۔

عمر نے فون پر وزارت داخلہ کو پوری تفصیل سناتے ہوئے واضح کر دیا تھا کہ تیمور کو بھیجتے وقت خاص طور پر ہدایت کی گئی تھی کہ وہ کسی سنگین الجھن میں نہ پڑے' کسی ایسے ویسے معاملے میں ملوث نہ ہو لیکن وہ جانتا تھا کہ وہاں یہی سمجھا جا رہا ہے کہ تیمور نے یہ حرکت حکومت کو مصیبت میں پھنسانے اور اس کی پوزیشن خراب کرنے کے لئے کی ہے۔ پاکستانی عوام پہلے ہی کشمیر کے معاملے میں بے چین تھے۔ یہ تاثر عام تھا کہ پاکستانی حکومت کا طرز عمل مدافعانہ بلکہ غلامانہ ہے۔ انقلاب کے پبلشرز جانتے تھے کہ اس میں عمر

کا کوئی قصور نہیں لیکن وہ بھی ذمے دار اسی کو ٹھہرانے پر تلے ہوئے تھے اور عمر جانتا تھا کہ وہ بھی اپنی جگہ ٹھیک ہیں۔ وہ یہاں آزاد' خود مختار ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کر رہا تھا۔ اس نے تیمور کو پاکستان بھیجنے سے پہلے اس کے طرز عمل کے متعلق کچھ بھی نہیں بتایا تھا۔ اس کے رجحانات سے اسے بے خبر رکھا تھا اور اسے بھیجنے کے سلسلے میں ان سے مشورہ بھی نہیں لیا تھا۔ بس فیصلہ کر دیا تھا۔ لہٰذا ذمے داری بھی اس کی تھی۔

یہ بات طے تھی کہ تیمور نے مقبوضہ کشمیر میں داخل ہونے کے سلسلے میں ان لوگوں سے مشورہ لینا تو کجا بات بھی نہیں کی تھی جن سے ملنے کی اسے عمر نے ہدایت دی تھی۔ ان میں میجر رحیم بھی تھا۔ تیمور نے مقبوضہ کشمیر میں داخل ہونے کے لئے یقینی طور پر کسی اسمگلر کی مدد لی تھی۔ اس نے ناقابل یقین حد تک بے وقوفی کا مظاہرہ کیا تھا۔

تیمور کو گرفتار ہوئے ایک ہفتہ ہو چکا تھا۔ عمر کے مزاج میں چڑچڑا پن پیدا ہو گیا تھا۔ اسے بات بے بات غصہ آ جاتا اور وہ بری طرح بھڑک اٹھتا۔ وہ فرانس میں پاکستانی سفیر سے ملنے گیا تو اسے احساس ہوا کہ جتنا برہم وہ اس بات پر ہے کہ پاکستان نے سفارتی سطح پر تیمور کے لئے کچھ بھی نہیں کیا ہے' اس سے زیادہ برہم سفیر اس بات پر ہے کہ عمر نے اور روزنامہ انقلاب نے تیمور کو جان بوجھ کر کشمیر بھیجا تھا۔ اس کے خیال میں وہ کوئی صحافتی اسٹنٹ تھا۔ انٹرویو کا بیشتر وقت عمر کے لئے اپنی اور اپنے اخبار کی صفائی پیش کرتے گزرا۔

"چلو........... میں تمہاری بات مان لیتا ہوں۔" سفیر نے کہا اور ایک نیا نکتہ پیش کیا۔ "لیکن تم حکومت سے کیا چاہتے ہو؟ ایک غیر ذمے دار شخص کی حماقت کے جواب میں ہم دس کروڑ افراد کو ایک بے سود جنگ میں جھونک دیں؟ یہ دور تیر و تلوار کا نہیں عمر صاحب۔ اب جنگ مکمل تباہی کا نام ہے۔"

عمر کہنا چاہتا تھا کہ اس کمزور سوچ کو بنیاد بنا کر بھارت بے گناہ کشمیریوں کے ساتھ' حتیٰ کہ پاکستانیوں کے ساتھ ہر سلوک کرتا رہے اور آپ یہ سوچ کر آنکھیں اور کان بند کر لیں تو ایک دن اسی کمزوری کی شہ پر بھارت خود وہ جنگ چھیڑ سکتا ہے جس سے بچنے کے لئے آپ ذلت اوڑھ رہے ہیں لیکن اس نے یہ بات کہی نہیں۔ "میں صرف اتنا چاہتا ہوں کہ ہماری حکومت اس معاملے میں کمزوری دکھانے کے بجائے کسی اہم بھارتی شہری کو

پاکستان میں گرفتار کرے اور اسے پھانسی پر لٹکا دے۔" اس نے کہا۔

"کیا ایسا ہو جانے سے تمہارا تیمور حسین پھانسی پانے کے بعد جی اٹھے گا؟" سفیر صاحب نے تلخ لہجے میں پوچھا۔ "یا اس کے جواب میں ہندوستان میں ایک اور پاکستانی لٹکا دیا جائے گا؟"

"پاکستان میں ہندوستانی جاسوس کم نہیں ہیں۔" عمر نے کہا۔ "آپ ان میں سے کسی ایک کو پکڑیں' اس کے خلاف ثبوت فراہم کریں اور پھر بھارت پر دباؤ ڈالیں تیمور کی رہائی کے لئے۔"

"عمر صاحب' آپ کو خود بھی احساس ہو گا کہ آپ بچوں جیسی باتیں کر رہے ہیں۔" سفیر صاحب نے بدمزگی سے کہا۔ "مہذب لوگ سفارت کاروں پر ایسے ہاتھ نہیں ڈالتے.........."

"اور غیر مہذب لوگ ان مہذب لوگوں کو اس بات کی سزا دیتے رہتے ہیں! یہ آخر کب تک چلے گا؟"

سفیر کے ہونٹوں پر ایک سرد مسکراہٹ ابھری۔ "نواز علی کیس کے سلسلے میں آپ کا رویہ تند نہیں تھا عمر صاحب!"

"یہ معاملہ مختلف ہے اور پھر تیمور میری ذمے داری ہے۔" عمر نے تند لہجے میں کہا۔ "نواز علی کے بارے میں مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہ کون ہے' کیا کرتا ہے' کن لوگوں سے اس کے روابط ہیں۔ میں اس کے بیک گراؤنڈ سے ناواقف تھا۔ تیمور کے بارے میں مجھے معلوم ہے کہ اگر وہ جاسوس ہو سکتا ہے تو پھر میں اور آپ بھی یقینی طور پر جاسوس ہیں۔"

"مگر تمہیں نہیں معلوم کہ وہ کن حالات میں گرفتار کیا گیا ہے۔ میں جانتا ہوں۔" سفیر صاحب نے کہا۔ "اس نے ایک اسمگلر سے معاملات طے کئے۔ وہ گندم کی بوریوں کے درمیان چھپ کر مقبوضہ کشمیر میں داخل ہوا۔ وہ خود کو بہت عقل مند سمجھ رہا تھا۔ اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ اسمگلر کو اسے کشمیر میں اسمگل کرنے کا علیحدہ سے انعام ملا۔ اسمگلر نے خود اس کی نشان دہی کی اور وہ کشمیر میں داخل ہوتے ہی گرفتار کرلیا گیا۔ وہ غیر قانونی طور پر وہاں پہنچا.......... اور اس کی نیت یقیناً اچھی نہیں تھی.........."

"اس سے اسے بے وقوف تو ثابت کیا جا سکتا ہے' پاکستانی جاسوس نہیں۔" عمر نے ان کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ اسے خود پر غصہ آ رہا تھا کہ تیمور کو اس حماقت کا موقع خود اس نے فراہم کیا تھا۔

سفیر صاحب نے جیسے اس کی سوچ پڑھ لی۔ انہوں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

"میں تمہاری پوزیشن سمجھ رہا ہوں۔ اسلام آباد نے تمہاری پوزیشن کا سختی سے نوٹس لیا ہے۔ بھارت مسلسل بین الاقوامی طور پر ہماری پوزیشن خراب کر رہا ہے۔ ہماری ساکھ خراب ہو رہی ہے۔ ایسے واقعات پاکستان کے لئے رسوا کن ہیں۔ ان سے کشمیر کے سلسلے میں ہمارے مضبوط موقف تک کو نقصان پہنچتا ہے۔ غور تو کرو' امریکا ہمیں دہشت گرد قوم ڈیکلیئر کرنے پر تلا ہوا ہے۔ اس طرح کی حماقتیں ایسے میں ہمیں نقصان ہی پہنچا سکتی ہیں۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ تیمور جیسے لوگ نادانستگی میں سہی مگر وہ کام کرتے ہیں جو بھارتی ایجنٹ ہی کر سکتے ہیں۔"

عمر کو بری طرح شکست خوردگی کا احساس ہونے لگا۔ اب اس کے پاس کہنے کو کچھ بھی نہیں تھا۔

☆============☆============☆

سرینگر سینٹرل جیل کی عمارت بہت بڑی تھی۔ وہاں پولیس کا سخت پہرا رہتا تھا۔ اندر کئی محکمے اور ان کے دفاتر تھے۔ پھر تفتیشی کمرے' کوٹھریاں اور کال کوٹھریاں تھیں۔ وہاں ہر طرف سیلن کی' سرکاری افسروں کی' بیماریوں کی' انسانوں کی ایذاؤں کی' ان کے پسینے کی اور مظالم کی بو رچی ہوئی تھی۔

گرفتاری کے بعد سے عمر کو ایک چھوٹی سی کوٹھری میں رکھا گیا تھا۔ جہاں وہ بساط بھر ٹہلنے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ کوٹھری مربع نما تھی۔ لمبائی اور چوڑائی نو فٹ سے زیادہ نہیں ہو گی۔ ایک طرف ایک جھلنگا چارپائی پڑی تھی۔ وہاں فرنیچر نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ بیت الخلا مکانی اعتبار سے ناموجود تھا.......... اور ایک اعتبار سے وہ کوٹھری بجائے خود بیت الخلا تھی۔ فرش اس کا کچا تھا۔ دن میں ایک بار صبح چھ بجے ایک پہرے دار پھاوڑا جھاڑو اور پانی کا ایک ڈول لئے آتا تھا۔ اس کی ہدایت پر تیمور کو اپنی غلاظت وہیں برابر کرنا ہوتی تھی۔ یہ بڑا احسان تھا کہ اسے آب دست کے لئے پانی میسر تھا۔ دن میں دو بار اسے

کھانا ملتا۔ صبح پتلی دال اور جلی ہوئی سیاہ روٹیاں اور رات میں ابلی ہوئی بد مزہ سبزیوں کے ساتھ باسی چاول' جن سے کبھی بدبو بھی آتی تھی۔ وہ کھانا دیکھ کر تیمور کی بھوک اڑ جاتی تھی لیکن کھانا ضرورت بھی تھی۔ لہٰذا وہ بغیر اشتہا کے اسے زہر مار کر لیتا تھا۔

اس عرصے میں تیمور کو نہ ذلیل کیا گیا' نہ جسمانی طور پر کوئی سزا دی گئی۔ تاہم جس طرح اسے رکھا گیا تھا وہی ایک بہت بڑی سزا تھی۔ اس کا پاسپورٹ' بٹوا' رقم' انگوٹھی' گھڑی' کف لنکس اور جوتوں کے بند اس سے لے لئے گئے تھے۔ تاہم وہ اسی لباس میں موجود تھا۔ جس میں اسے گرفتار کیا گیا تھا۔

کوٹھری کے آہنی دروازے میں چھوٹا سا ایک روزن تھا جس سے ایک آنکھ وقفے وقفے سے اسے دیکھتی رہتی تھی۔ وقفے طے شدہ اور باقاعدہ نہیں تھے۔ تیمور نے وقفوں کا ٹائمنگ کرنے کی کوشش کی لیکن جلد ہی اسے احساس ہو گیا کہ ان میں دانستہ بے قاعدگی رکھی جاتی ہے۔ ایک گھنٹے میں اسے بارہ بار بھی چیک کیا جا سکتا تھا' تین بار بھی اور چوبیس بار بھی۔

ہفتے میں چار مرتبہ......... کم از کم تیمور کا حساب کتاب تو یہی تھا کہ وہ ایک ہفتہ تھا......... اور وہ بھی مختلف وقفوں سے پہرے دار اسے کوٹھری سے باہر لائے تھے۔ وہ اسے مارچ کراتے ہوئے ایک آفس میں لے گئے تھے جہاں اس جیسے کئی قیدی بینچ پر بیٹھے تھے۔ ان کی نگرانی کرنے والے پہرے داروں کے ہاتھوں میں خود کار اسلحہ تھا۔ کمرے میں ایک ریلنگ تھی جس کے پیچھے کئی میزوں پر باوردی افسر اور کلرک لوگ بیٹھے تھے۔

وہ لوگ شاید کشمیری زبان بولتے تھے۔ تیمور نے تمام عرصے میں انہیں ایک جملے کی حد تک بھی اردو بولتے نہیں سنا۔ کبھی کوئی افسر' قیدیوں میں سے کسی کو ریلنگ کے پار بلاتا' کچھ پوچھتا یا کسی کاغذ پر کچھ لکھواتا لیکن تیمور کو کبھی کسی نے آواز نہیں دی۔ کبھی کوئی عمال کچھ کاغذ لے کر آتا اور افسروں میں سے کسی سے تبادلہ خیال کے دوران وہ تیمور کی طرف دیکھتے اور سر ہلاتے لیکن آخر میں عمال کاغذات لے کر واپس چلا جاتا اور بس۔ ایک دن تیمور وہاں پانچ گھنٹے بیٹھا رہا اور موقعے پر اسے سات گھنٹے انتظار کرایا گیا تاہم اس دوران اسے باتھ روم جا کر ہاتھ منہ دھونے کا موقع ضرور دیا گیا۔

تیسرے موقع پر وہ جان لیوا انتظار' وہ سسپنس اور فرسٹریشن تیمور کے لئے

ناقابل برداشت ہو گیا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور میز کے پیچھے بیٹھے ہوئے ایک افسر پر دہاڑنے لگا۔ "تم مجھ سے پوچھ گچھ کیوں نہیں کرتے؟ مجھے آخر یہاں کب تک انتظار کرنا ہو گا؟"

افسر نے اسے یوں دیکھا جیسے ایک لفظ بھی سمجھ میں نہ آیا ہو اور یہ بھی ممکن ہے کہ واقعتاً ایسا ہی ہو۔ بہرحال پہرے داروں نے غصے سے اسے اشارہ کیا کہ وہ خاموشی سے اپنی جگہ بیٹھا رہے۔ تیمور بیٹھ گیا۔ دوسری بار اس نے ایک پولیس افسر کو اسی طرح پکارا' جو کچھ کاغذات لے کر آیا تھا۔ اس بار دونوں پہرے دار خطرناک تیوروں کے ساتھ اس کی طرف بڑھے اور اسے دوبارہ بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔ اس بار تیمور نے یہ دیکھنے کے لئے کہ ان کا رد عمل کیا ہو گا' ان کی بات نہ ماننے کا فیصلہ کیا۔ "پاگلو........" اس نے چیخ کر کہا۔ "اب میں نہیں بیٹھوں گا۔ اس وقت تک یونہی کھڑا رہوں گا جب تک مجھ سے پوچھ گچھ نہیں کی جائے گی۔" یہ کہہ کے وہ اپنی جگہ جم کر کھڑا ہو گیا۔

میز کے پیچھے بیٹھے افسر نے اپنی زبان میں پہرے داروں سے کچھ کہا۔ وہ خاموشی سے دروازے کے پاس' اپنی جگہ پر جا کر کھڑے ہو گئے۔ ان پر جھپٹنا یا دروازے سے گزرنے کی کوشش کرنا خودکشی کے مترادف تھا۔ اسے شوٹ کرنے کے لئے شائید انہیں معمولی سے ایک بہانے کی ضرورت تھی۔

وہ کھڑا رہا۔ کسی نے اس کی طرف ذرا بھی توجہ نہیں دی۔ لوگ یوں آ جا رہے تھے جیسے اس کا وجود ہی نہ ہو۔ پہلے تو وہ خود کو بے وقوف سمجھتا رہا پھر اس کے وجود میں ایک تند لہر ابھری۔ اس کے اندر غصے سے چیخنے کی' ریلنگ توڑ دینے کی' افسروں کو گردن سے پکڑ کر مارنے اور حلق پھاڑ کر چلانے کی دیوانی خواہشیں مچلنے لگیں۔

اس نے بروقت خود کو سنبھالا۔ "تیمور بیٹے......... اتنا آسان ہدف نہ بنو۔ سمجھنے کی کوشش کرو۔" اس نے خود سے کہا۔ "یہ تو پہلا مرحلہ ہے۔ وہ تو چاہتے ہی یہی ہیں کہ تم ہوش و حواس سے عاری ہو جاؤ' عقل کو خیرباد کہہ دو۔ خود کو سنبھالو۔ ان کے چکر میں نہ آؤ۔" وہ دوبارہ بینچ پر جا بیٹھا۔

اس نے خود پر اور ان پر جو فتح پائی تھی' اس نے اس کا حوصلہ بلند کر دیا۔ اپنی جسمانی اور دماغی اہلیت پر اس کا اعتماد مستحکم ہو گیا۔ اسے یہ احساس ہو گیا کہ اسے دماغی

طور پر بہت چوکنا رہنا ہو گا۔ وہ اس کے ساتھ بلی اور چوہے والا کھیل کھیل رہے تھے۔ اسے بس صبر و تحمل کا مظاہرہ کرنا تھا۔ بالآخر انہیں اس سے بات کرنی پڑے گی.......... اردو میں۔

اس کے باوجود جب بھی دروازہ کھلتا اور کوئی سرکاری آدمی اندر آتا' وہ خود کو متوقع نظروں سے اس کی طرف دیکھنے سے باز نہ رکھ پاتا۔ وہ جو زبان بول رہے تھے' وہ اب بھی اس کے لئے اتنی ہی نامانوس تھی جتنی پہلے دن تھی۔ اب تو اسے شبہ ہونے لگا تھا وہ سرے سے کوئی زبان ہی نہیں ہے کیونکہ آج تک ایک لفظ بھی اس کے پلے نہیں پڑا تھا۔ یہ بات اب اس کے اعصاب پر بری طرح اثرانداز ہو رہی تھی اور وہ اس بے معنی گفتگو کو اپنی سماعت تک پہنچنے سے کسی بھی طرح نہیں روک سکتا تھا۔

وہ اسے دوبارہ اس کی کوٹھری میں چھوڑ گئے۔ اس بار تنہائی میں اس کا تخیل پوری طرح متحرک ہو گیا۔ وہ اپنی اصل حالت سے.......... اپنی ابتلا سے بڑی حد تک بے نیاز ہو گیا تھا۔ وہ عمر اور تسکین کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اب تک انہیں علم ہو چکا ہو گا کہ وہ کیسا احمق تھا۔ وہ خود کو عظیم رپورٹر سمجھتا تھا اور کتنی آسانی سے جال میں جا پھنسا تھا۔ بھارتیوں نے یقیناً" اس کی گرفتاری کی خبر نشر کر دی ہو گی۔ اس نے تصور میں عمر کے چہرے پر حقارت اور بدمزگی کا تاثر دیکھا۔ اسے یقین تھا کہ تسکین اس حماقت کی اصل وجہ سمجھتی ہے اور وہ اسے اس کے حوصلے پر سراہ رہی ہو گی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اب تک تو شاید حکومت پاکستان نے اس کی رہائی کے لئے سفارتی کوششیں شروع کر دی ہو گی۔ بالآخر وہ رہا ہو گا اور یہ تہلکہ خیز اسٹوری شائع ہو گی کہ بھارتی کس طرح معصوم لوگوں سے اعتراف جرم کراتے ہیں۔ ہاں.......... وہ پہلے اسے ڈرانے کی کوشش کریں گے لیکن آخر میں انہیں اس کو رہا کرنا ہو گا کیونکہ اس نے کوئی بہت بڑا جرم تو نہیں کیا ہے۔ وہ اسے سرحد پار دھکیل دیں گے اور پھر وہ آزاد ہو گا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کیا اس میں اتنا حوصلہ ہو گا کہ وہ پیرس جا کر ان سب کا سامنا کرے۔ اسے احساس بھی نہیں ہوا کہ اس کی سوچیں متضاد ہیں۔ ایک طرف تو وہ اپنی دانست میں ایک عظیم اسٹوری لے کر جا رہا ہے.......... اور دوسری طرف وہ شرمندہ ہے۔

پھر وقتاً" فوقتاً" اس کے ذہن میں ایک اندیشہ سر اٹھانے لگا۔ اگر کسی نے میری

رہائی کے لئے کوشش نہیں کی تو کیا ہو گا؟ اگر انہوں نے مجھے یہاں سڑنے اور اور مرنے کے لئے چھوڑ دیا تو؟ اگر میں پاگل ہو گیا تو دیواروں سے سر پھوڑتا رہ جاؤں گا!

اس کے ذہن میں ایک بار بھی یہ خیال نہیں آیا کہ وہ ایک اور نواز علی بھی ثابت ہو سکتا ہے.......... بے قصور نواز علی جس سے ان جرائم کا اعتراف بھی کرا لیا گیا تھا جو اس سے سرزد نہیں ہوئے تھے۔ اسے یہ خیال بھی نہیں آیا کہ وہ یہی سوچ کر کشمیر آیا تھا کہ ان ہتھکنڈوں کے بارے میں معلوم کرے گا جنہیں استعمال کر کے معصوم لوگوں کو ان کے اپنے منہ سے مجرم ثابت کرایا جاتا ہے۔ وہ تو ناقابل تسخیر تیمور حسین تھا۔ جس نے بصد شوق خود کو ایک مصیبت میں پھنسایا تھا جسے بہرحال اس مصیبت سے رہائی ملنا تھی۔ دیر صرف اس بات کی تھی کہ اسے کوئی اردو یا انگلش بولنے اور سمجھنے والا مل جائے۔ وہ اس سے پہلے بھی دشواریوں میں پڑ چکا تھا مگر اس میں بچ نکلنے کی غیر معمولی صلاحیت بھی تو تھی اور وہ ایک بار پھر بچ نکلے گا!

پھر وہ اپنے طور پر حکومت پاکستان کے لئے عذر تراشنے لگا۔ نواز علی کے سلسلے میں انہوں نے کچھ نہیں کیا تھا لیکن اس کے معاملے میں ایسا نہیں ہو گا۔ وہ مختلف آدمی ہے۔ وہ صحافی تیمور حسین ہے۔ جس کی کوئی اہمیت ہے۔ نواز علی کو نہیں بچایا جا سکا یا اسے بچانے کی کوشش نہیں کی گئی تو اس کا کوئی سبب بھی ہو گا اور ویسے بھی اخبارات بہت بڑی قوت ہوتے ہیں۔

اس کے اندازے کے مطابق گرفتاری کے نویں دن دو پہرے دار آئے اور اسے مارچ کراتے لے کر چلے۔ اس بار سمت مخالف تھی۔ وہ اسے ایک دفتر میں لے گئے۔ وہاں ایک بہت بڑی میز پر کاغذات کا انبار تھا۔ میز کے پیچھے ایک شخص بیٹھا تھا جس کا سر کارتوس کی شکل کا تھا اور دانت خراب تھے.......... پیلے اور ناہموار۔ اس کی قمیض میلی تھی اور ناخن بڑے بڑے۔ تیمور وہاں پہنچا تو وہ بیٹھا کچھ لکھ رہا تھا۔ تیمور میز کے پاس جا کھڑا ہوا۔ وہ شخص بدستور لکھتا رہا۔ کئی منٹ تک اس نے نظر اٹھا کر تیمور کو نہیں دیکھا۔ دونوں پہرے دار دروازے کے دونوں طرف اٹین شن کھڑے تھے۔

بالآخر اس شخص نے نظریں اٹھائیں۔ اس کی آنکھوں میں تیمور کو غیر معمولی چمک اور چوکنا پن نظر آیا پھر اس شخص نے شستہ انگریزی میں کہا۔ "ارے ہاں.......... تم مسٹر

تیمور حسین ہو......... پاکستانی جاسوس جسے پچھلے ہفتے گرفتار کیا گیا تھا۔ مجھے افسوس ہے کہ اتنے دن تمہارے کیس پر توجہ نہ دی جا سکی۔ پلیز سٹ ڈاؤن۔" اس نے سامنے رکھی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

"میری بات سنو۔" تیمور نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ "یہ بات شروع ہی میں سمجھ لو کہ میں جاسوس نہیں ہوں۔ میں ایک پاکستانی اخبار کا رپورٹر ہوں اور اپنے کام کے سلسلے میں یہاں آیا ہوں۔ یہ درست ہے کہ میں ناجائز طور پر یہاں آیا ہوں لیکن امریکا میں کسی اہم اسٹوری پر کام کرتے ہوئے ایسے خطرات مول لینا پڑتے ہیں۔ میں امریکا میں بھی کام کر چکا ہوں۔ میں تم سے ہر طرح کے تعاون کے لئے تیار ہوں لیکن یہ جاسوس والا ڈراما چھوڑ دو۔"

اس شخص نے سر کو تفہیمی جنبش دی اور مسکرایا۔ "قدرتی بات ہے ابھی تم جاسوس ہونے کا اعتراف کرنے پر آمادہ نہیں ہو لیکن ہم جانتے ہیں مسٹر تیمور کہ تم جاسوس ہو۔ بہرحال اس پر بعد میں تبادلۂ خیال کریں گے۔" اس نے ایک کاغذ پر نظر ڈالی اور بولا۔ "مجھے افسوس ہے کہ تمہیں مناسب جگہ نہیں رکھا جا سکا لیکن کیا کریں، یہاں قیدی اتنے زیادہ ہیں، اس سے بہتر اقامت ہم تمہیں نہیں دے سکتے۔"

تیمور نے سوچا......... یہ تو بالکل کسی ہوٹل کے مینجر کے سے انداز میں گفتگو کر رہا ہے۔

"مجھے تو تعجب ہے ہوتا ہے کہ ریاست کے بارے میں کتنی سازشیں ہو رہی ہیں۔" کارتوس نما سر والے نے اپنی بات جاری رکھی۔ "اور اس سے زیادہ حیرت اس پر ہوتی ہے کہ ان سازشوں میں کیسے کیسے لوگ شریک ہیں۔ ایسے لوگ جن کے لئے ہم بہت کچھ کر رہے ہیں۔ اسی لئے ہم اتنے مصروف ہیں کہ تمہارے کیس پر بھی توجہ نہیں دے سکتے۔ بہرکیف میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ اس جیل میں تمہاری کوٹھری سے کہیں بدتر مقامات موجود ہیں۔ میں بس یہ خواہش ہی کر سکتا ہوں کہ کاش تمہارا وہاں سے گزر بھی نہ ہو۔"

تیمور کو ایک چیز نے ہلا کر رکھ دیا اور وہ بے حد عجیب، بے حد غیر یقینی لگ رہی تھی۔ وہ شخص جو کچھ کہہ رہا تھا، پورے خلوص اور سچائی کے ساتھ کہہ رہا تھا۔ وہ اپنی

جگہ اتنا ہی سچا، اتنا ہی کھرا تھا جتنا تیمور تھا۔ وہ جو کچھ کہہ رہا تھا اس پر اسے پورا یقین تھا۔ اسے یقین تھا کہ تیمور جاسوس ہے۔ اسے یقین تھا کہ ہر وہ شخص جسے اس کے مکان سے گھسیٹ کر جیل لایا جا رہا ہے، ریاست کے خلاف کسی نہ کسی سازش میں شریک رہا ہے۔ ایک اور بات جس نے تیمور کو حیران کیا وہ اس شخص کی نرمی اور نرم گفتاری تھی۔ اس کا انداز گفتگو بھی معاندانہ نہیں تھا ایسا ہرگز نہیں تھا کہ وہ اپنے کسی دشمن سے تبادلہ خیال کر رہا ہے۔

وہ شخص میز پر کاغذات کے درمیان کچھ تلاش کر رہا تھا پھر اسے وہ چیز مل گئی۔ "یہ مجھے تمہارے ملک کے سفیر کی طرف سے ملا ہے۔" اس نے وہ خط تیمور کی طرف بڑھا دیا۔

تیمور نے بے تابی سے وہ خط لیا۔ وہ اپنی بے تابی کوشش کے باوجود نہیں چھپا سکا۔ وجہ یہ تھی کہ وہ بے حد غیر متوقع طور پر اس کے سامنے آیا تھا اور اسے بہت زیادہ خوش آئند معلوم ہوا تھا اور وہ خط حقیقی تھا۔ خط سفارت خانے کے لیٹر ہیڈ پر ٹائپ کیا گیا تھا، اس میں ایک پاکستانی شہری تیمور حسین کی گرفتاری پر احتجاج کرتے ہوئے اس بات کی تردید کی گئی تھی کہ تیمور کا کشمیر آنے کا مقصد جاسوسی اور دہشت گردی کی کوئی کارروائی کرنا ہے۔ اس میں بھارتی حکومت کو سفارت خانے کے سفارتی حق کا حوالہ دیتے ہوئے اس بات کی درخواست کی گئی تھی کہ سفارت خانے کے ایک نمائندے کو ملزم تیمور حسین سے ملنے کی اجازت دی جائے۔

وہ خط اس بات کا ثبوت تھا کہ اس کا ملک واقف ہے کہ وہ کس مصیبت میں پھنسا ہوا ہے۔ یہی نہیں، انہوں نے اسے اس مصیبت سے نکالنے کے سلسلے میں عملی قدم اٹھایا ہے......... جیل کے اس افسر سے رابطہ کیا ہے جس کے پاس اس کا کیس ہے اور یہ احساس بے حد طمانیت بخش اور حوصلہ افزا تھا کہ اس کے لوگ اس کی طرف بے خبر اور بے نیاز نہیں ہیں۔ اسے ایک لمحے کو بھی یہ خیال نہیں آیا کہ یہ اس سے تفتیش کا آغاز بھی ہو سکتا ہے۔ اسے تو اس وقت اسلامی جمہوریہ پاکستان کی اس مہر پر پیار آ رہا تھا جو لیٹر ہیڈ پر چھپی ہوئی تھی۔

وہ افسر اسے بہت غور سے دیکھ رہا تھا۔ "مسٹر تیمور، آپ اپنے سفیر کو خط لکھنا

پسند کریں گے؟" اس نے پوچھا۔

"لکھوں گا۔ ضرور لکھوں گا۔" تیمور نے جواب دیا۔

"بہت خوب! تو پھر لکھو نا۔" یہ کہتے ہوئے اس نے تیمور کی طرف ایک رائٹنگ پیڈ اور قلم بڑھا دیا۔

تیمور نے لکھنا شروع کر دیا اور بڑی روانی سے لکھتا گیا۔ اس وقت وہ احساس طمانیت سے سرشار تھا۔ اس نے پوری سچائی کے ساتھ تحریر کیا کہ وہ کن حالات میں گرفتار کیا گیا۔ اس نے خود کو ذمے دار ٹھہرایا اور درخواست کی کہ سفارت خانہ اس کی نمائندگی کرے۔ اس نے لکھا کہ جیل میں اس کے ساتھ برا برتاؤ نہیں کیا گیا ہے لیکن وہ مجرم نہیں ہے اس لئے اس کے لئے یہ بھی بہت ہے۔ سفارت خانے کو اس معاملے میں بھارتی حکومت سے مضبوطی اور سختی سے بات کرنی چاہئے۔ اس سلسلے میں اس کا اخبار بھی اس کا ساتھ دے گا۔ اس لئے کہ وہ پیشہ ورانہ فرائض کی ادائیگی کے سلسلے میں آیا تھا۔

تین صفحات پر مشتمل وہ خط لکھ کر اس نے افسر کی طرف بڑھایا۔ افسر نے بڑی سنجیدگی سے وہ خط اس سے لیا اور پھر پوچھا۔ "میں یہ پڑھ سکتا ہوں؟"

تیمور مسکرانے لگا۔ "میں اجازت نہیں دوں گا تب بھی آپ پڑھ ہی لیں گے۔"

افسر مسکرایا دیا اور خط پڑھنے لگا۔ پڑھتے ہوئے کئی بار اس نے دھیرے سے اثبات میں سر ہلایا جیسے خط کے مضمون سے متفق ہو۔ خط پڑھنے کے بعد اس نے نظریں اٹھا کر تیمور کو دیکھا اور ستائشی لہجے میں بولا۔ "بہت خوب مسٹر تیمور! آپ غضب کا لکھتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ اس میں بیشتر باتیں سفید جھوٹ ہیں۔" یہ کہہ کر اس نے بڑے خوشگوار انداز میں خط کے دو، پھر چار، پھر آٹھ اور پھر سوالہ ٹکرے کر دیئے۔

تیمور کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ وہ آگے کی طرف جھکا۔ دروازے پر موجود دونوں پہرے دار چوکنے ہو گئے۔ تیمور نے حلق کے بل چلاتے ہوئے کہا۔ "یہ کیا حرکت ہے؟ تم نے خود مجھ سے کہا تھا کہ میں اپنے ملک کے سفیر کو خط لکھ سکتا ہوں۔"

افسر اسے سرد اور چوکنا نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر پاکستانی سفارت خانے سے آیا ہوا خط اٹھایا اور اسی سکون اور سردمہری کے ساتھ اس خط کے پرزے پرزے کر دیئے۔ اس کام سے نمٹ کر اس نے دونوں خطوں کے پرزے سمیٹے اور

انہیں بڑی آہستگی سے ردی کی ٹوکری میں گرا دیا۔ پھر اس نے نرم لہجے میں کہا۔ "یہ ایک چھوٹا سا سبق ہے مسٹر تیمور اور مجھے ڈر ہے کہ اگر تم کشمیر میں اپنی آمد کا سبب اور اپنا مشن بیان کرنے کے سلسلے میں ایسے ہی جھوٹ اور ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرو گے تو ہر اگلا سبق پہلے سے زیادہ تند ہوتا جائے گا۔ میں تمہیں یہ بھی یاد دلانا چاہتا ہوں کہ حکومت پاکستان کشمیر میں داخل ہو سکتی ہے، نہ اس جیل میں۔ اور کبھی بھی داخل نہیں ہو سکے گی اور یہ دیواریں صرف سچ سننے کی عادی ہیں۔ اب تم جا سکتے ہو مسٹر تیمور۔" پھر اس نے اپنی زبان میں پہرے داروں سے کچھ کہا۔

☆------------☆------------☆

وقار ادارتی کمرے میں داخل ہوا تو ہر شخص اپنا کام چھوڑ کر متوقع نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔ اس کی ڈیوٹی پاکستانی سفارت خانے پر لگا دی گئی تھی کہ وہ تیمور کیس کے متعلق تازہ ترین معلومات حاصل کرتا رہے۔

"کہو......... سفیر صاحب سے ملاقات ہوئی؟" صدیق نے پوچھا۔

"نہیں۔ وہ کسی تقریب میں گئے ہوئے ہیں۔" وقار نے بتایا۔ "لیکن ان کے سیکریٹری نے نئی دہلی فون کیا تھا۔ بھارت میں پاکستان کے سفیر نے تیسرا احتجاج کیا ہے لیکن بھارتی حکومت نے اسے نظرانداز کر دیا ہے۔ ابھی تک بھارت میں پاکستانی سفیر اس سلسلے میں کسی اہم شخصیت سے ملنے میں کامیاب نہیں ہو سکے ہیں۔ یعنی صورت حال پہلے جیسی ہی ہے۔"

نیلوفر فائلنگ کیبنٹ سے ہٹ آئی اور تھائرا ایڈی سن کی میز کے پاس کھڑی ہو گئی۔ اس نے اپنا دکھ کسی سے نہیں کہا تھا۔ اندر ہی اندر سلگ رہی تھی۔ اس کا اظہار اس کی شکل سے ہو رہا تھا۔ وہ اور زیادہ دبلی، کمزور اور تھکی ہوئی لگ رہی تھی۔ تیمور کی گرفتاری کے اعلان کو دس دن ہو چکے تھے اور ان دس دنوں میں ایک لمحہ بھی ایسا نہیں تھا جب اس نے خود کو تیمور کی تباہی کا ذمے دار نہ ٹھہرایا ہو۔

"اب کیا ہو گا؟" اکبر نے پوچھا۔ "کیا اب ہمیں سری نگر پر ایٹم بم گرانا پڑے گا.........؟"

"مذاق کر رہے ہو.........!" زبیر نے اس پر آنکھیں نکالیں۔

اکبر کے نتھنے پھولنے پچکنے لگے۔ "اور کیا کروں۔ کیا تیمور جیسے بے حس آدمی کے لئے اعلان جنگ کراؤں گا سچ مچ........"

زبیر نے اپنا آرٹیکل اکبر کی طرف بڑھایا۔ "یہ لو تین سو الفاظ........" اس نے دفتری انداز میں کہا اور پھر ذاتی انداز میں بولا۔ "دیکھو.......... اگر تیمور زندہ سلامت آگیا تو ایک قومی ہیرو ہو گا۔ اس نے بہرحال کوئی قدم تو اٹھایا۔ خود کو حوصلہ مند اور دردمند تو ثابت کیا۔"

نادر کریم جس کی نظریں کاپی کے پروف پر جمی ہوئی تھی لیکن کان اس گفتگو پر لگے تھے۔ صدیق بھی اس گفتگو میں شامل ہو گیا۔ "تیمور کو حق حاصل تھا کہ وہ اپنی گردن کہیں بھی پھنساتا۔" صدیق نے کہا۔ "لیکن یہاں تو آخر میں عمر صاحب کی گردن پھنستی نظر آ رہی ہے۔"

"وہ کیسے؟" نادر نے کہا۔ "میری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ کسی ماتحت کی حماقت........ اور وہ بھی اس طرح کی حماقت چیف ایڈیٹر کے کھاتے میں کیسے جا سکتی ہے۔ ہاں، چھپی ہوئی ہر حماقت کے ذمے دار عمر صاحب ہوں گے۔ وہ ایڈیٹر ان چیف ہیں، کمانڈر ان چیف نہیں۔"

"یہ تم لوگوں کا خیال ہے۔ ہر بات کے ذمے دار عمر صاحب ہیں۔ یہ ان کا کام ہے کہ اپنے ماتحتوں کو پہچانیں۔" صدیق نے منہ بنا کر کہا۔ "انہیں سمجھ لینا چاہئے تھا کہ تیمور بدبودار آدمی ہے۔ انہیں اسے خطرناک حدود سے دور رکھنا چاہئے تھا۔ یہ بات تو میں بھی سمجھ گیا تھا، میں بھی بتا سکتا تھا انہیں۔"

وقار نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ "تو بتائی کیوں نہیں۔ یہ بتاؤ، اب عمر صاحب کا کیا بنے گا؟"

فرید تجربے کار آدمی تھا۔ اس نے کہا۔ "فی الحال تو پبلشرز عمر صاحب کو........ تم فکر نہ کرو۔ ہم تمہارے ساتھ ہیں........ ٹائپ کے پیغامات بھیج رہے ہیں لیکن کیس کا فیصلہ ہوتے ہی وہ انہیں کراچی بلا بھیجیں گے۔ پھر یا تو انہیں بچوں کے صفحے کا انچارج بنا دیا جائے گا یا بالکل ہی چھٹی کر دی جائے گی ان کی۔ اخبار کو کسی دشواری میں پھنسانے والوں کو وہ کبھی معاف نہیں کرتے۔ میں بتا دوں، اگر کسی طرح عمر صاحب تیمور کو بچا لیں تبھی

ان کی اپنی بچت ممکن ہے ورنہ تو انہیں بے روزگار ہی سمجھو اور اس واقعے کے بعد تو کوئی اخبار بھی انہیں قبول نہیں کرے گا۔"

زبیر نے جھنجلا کر کہا۔ "عمر صاحب کی فکر چھوڑو۔ جیل میں تیمور سڑ رہا ہے بے چارہ۔ اس کے بارے میں سوچو۔"

اب نواب کے لئے اسٹیج تیار ہو چکا تھا۔ وہ ہمیشہ ایسے ہی موقعوں پر میدان میں اترتا تھا........ اپنے مخصوص ڈرامائی انداز کے ساتھ۔ "ایک بات تو یہ ہے کہ ہمیں معلوم ہو جائے گا کہ تیمور کتنا سخت جان ہے۔ اس کا اندازہ اس عرصے کی طوالت یا اختصار سے ہو گا جس میں وہ اعتراف جرم کرے گا۔ ہمیں اس کا پتہ چل جائے گا۔ وہ اس وقت تک اس پر مقدمہ نہیں چلائیں گے جب تک انہیں یہ یقین نہ ہو جائے کہ وہ اسے اس حد تک توڑ چکے ہیں کہ وہ ہنسی خوشی ان کی مرضی کا بیان دے گا۔ تیمور جاننا چاہتا تھا کہ آخر بے قصور لوگ خواہ مخواہ اعتراف جرم کیسے کر لیتے ہیں۔ اب اسے معلوم ہو رہا ہو گا۔ میں دعوے سے کہتا ہوں کہ اس کی بہت اچھی طرح خبر لی جا رہی ہو گی۔ اسے گرفتار ہوئے دس دن ہو چکے ہیں۔ آدمی سخت جان بھی ہے اور خود سر بھی اس لئے شاید وہ دو ہفتے اور جھیل جائے لیکن کچھ بھروسا بھی نہیں۔ یہ طاقتور لوگ اندر سے بہت کمزور نکلتے ہیں اکثر۔ بہرکیف جب وہ مقدمے کی تاریخ کا اعلان کریں گے تو ہمیں معلوم ہو جائے گا کہ اب تیمور ٹوٹ چکا ہے۔ مرد میدان نہیں رہا وہ۔ اور وہ اسے خوب سجا سنوار کر عدالت میں لائیں گے۔ اس کے جسم پر اور چہرے پر مار پیٹ کا کوئی نشان نہیں ہو گا اور اگر وہ اس سے فرمائش کریں گے کہ ناچ ناچ کر اقبال جرم کرو تو وہ بھری عدالت میں کتھا کلی بھی پیش کر دے گا۔ پھر فیصلہ سنایا جائے گا اور چند روز بعد اسے پھانسی کے تختے پر پہنچا دیں گے۔ اس کے گلے میں پھندا ڈالا جائے گا اور چہرے پر سیاہ ٹوپی چڑھائی جائے گی اور........"

نیلوفر کی چیخ نے کمرے کے سناٹے کو تار تار کر دیا۔ "چپ ہو جاؤ۔ خدا کے لئے........ خاموش ہو جاؤ۔" وہ دونوں کانوں پر ہاتھ رکھ کر چلائی۔ پھر وہ بھاگتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

نواب نے حیرت سے کہا۔ "ارے اس چوہیا کو کیا ہو گیا؟"

"پیارے بھائی......... تمہارا انداز بیان ڈرامائی ہے۔" اکبر بولا۔ "تم باصلاحیت آدمی ہو۔ قصہ خوانی بازار میں ہوتے تو تہلکہ مچا دیتے لیکن انسانی جذبات تمہاری سمجھ سے باہر ہیں۔ بے چاری نیلوفر اسی روز تیمور پر مر مٹی تھی جب اس نے پہلی بار یہاں قدم رکھا تھا۔"

☆============☆============☆

رات کے پونے دو بج رہے تھے۔ عمر اور تسکین چیمپس ایلی سیز کے فرد کیٹس ریسٹورنٹ میں بیٹھے تھے۔ تسکین جوس کے گھونٹ لے رہی تھی جبکہ عمر نروس انداز میں سگریٹ پھونکے جا رہا تھا۔ وہ دونوں ہی گھر نہیں جانا چاہتے تھے۔

پچھلے کچھ دنوں سے ان کے درمیان وہ انڈر اسٹینڈنگ مفقود ہو گئی تھی جس کی مدد سے وہ ماضی میں پیچیدہ مسائل حل کرتے رہے تھے۔ عمر کا مسئلہ یہ تھا کہ اس کے ذہن میں یہ خیال پوری طرح جڑ پکڑ چکا تھا کہ تسکین کے لئے تیمور کی گرفتاری ایک ذاتی اور جذباتی مسئلہ ہے۔ بہت کوشش کے باوجود وہ اس خیال کو ذہن سے نہیں جھٹک پا رہا تھا۔ دوسری طرف تسکین اس صورت حال میں یہ چاہتی تھی کہ شوہر کی انا کو مجروح کئے بغیر اظہار ہمدردی کرے لیکن یہ ناممکن تھا۔

تسکین نے خود کو کبھی اتنا بے بس محسوس نہیں کیا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اس کا شوہر چاروں طرف سے گھر چکا ہے۔ تیمور کو سزائے موت ہو گئی تو عمر کا صحافتی کیریئر یقینی طور پر ختم ہو جائے گا لیکن بے حد متوازن انداز میں اسے یہ احساس بھی تھا کہ اس صورت میں تیمور کے لئے تو سبھی کچھ ختم ہو جائے گا۔ وہ زندگی سے ہی محروم ہو جائے گا اور تیمور انہی لوگوں میں سے تھا۔ وہ اس اخباری فیملی کا ایک فرد تھا۔ اسے وہ اس کے حوصلے، اولوالعزمی اور شدت کے حوالے سے پہچانتے اور پسند کرتے تھے۔ زندگی سے بھرپور ایسا آدمی اتنی آسانی سے "ختم کر دیا جائے گا" یہ خیال ہی بے حد روح فرسا تھا۔ تیمور اپنی تمام تر کمزوریوں کے باوجود ایک بے حد سراہا جانے والا آدمی تھا۔

تسکین نے بنگلہ دیش میں خاصا عرصہ گزارا تھا......... ایسے حالات میں جن میں زندہ رہنے کو بھی ایک معجزہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس لئے وہ ایکشن پسند ہو گئی تھی۔ تیمور بھی ایکشن پسند تھا۔ اب وہ مقبوضہ کشمیر قید میں تھا......... اور یہ ایسا تھا جیسے کسی نے اسے

چاند پر قیدی بنا لیا ہو اور تسکین جانتی تھی کہ اس کی رہائی کے لئے جو کوششیں کی جا رہی ہیں وہ بے حد غیر مئوثر ہیں۔ کم از کم ان کے زور پر تیمور کی رہائی کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔

بالآخر وہ اپنی ان گہری سوچوں سے ابھری۔ اس نے ایک سرد آہ بھرتے ہوئے عمر سے پوچھا۔ "عمر......... کیا یہ سچ ہے کہ تیمور کو پھانسی پر لٹکا دیا جائے گا اور ہماری حکومت بے بس تماشائی بنی رہے گی؟ عمر......... ہمیں کیا کرنا چاہئے......... کیا کر سکتے ہیں ہم؟"

عمر نے دھندلائی ہوئی نظروں سے اسے دیکھا۔ وہ بے حد تھکا ہوا لگ رہا تھا۔ ایسا شخص جو حوصلہ ہار چکا ہو اور جذباتی طور پر بھی جس میں متلون مزاجی آ گئی ہو۔ وہ سوچ میں پڑ گیا۔ یہ وہ تسکین ہے جس سے میں محبت کرتا ہوں اور جو مجھ سے محبت کرتی تھی۔ یا یہ نئی تسکین ہے جو مجھ سے اپنے محبوب کو بچانے کی اپیل کر رہی ہے۔ اس نے بجھے بجھے لہجے میں کہا۔ "میری طرح تم بھی جانتی ہو کہ حکومت پاکستان تیمور پر فاتحہ پڑھ چکی ہے۔ ویسے بھی تیمور ان کا درد سر نہیں، میرا ہے۔ وہ سفارتی سطح پر احتجاج کرتے رہیں گے لیکن کوئی شنوائی نہیں ہو گی۔ عملاً ہماری حکومت کچھ نہیں کرے گی۔ جو کچھ کرنا ہے مجھے کرنا ہے اور میرے پاس فوج نہیں ہے۔"

تسکین ایک لمحے کو ہچکچائی پھر اس نے عمر کو بتا دینے کا فیصلہ کیا۔ "عمر......... آج شام دفتر کے کچھ لوگ اس سلسلے میں باتیں کر رہے تھے۔ صدیق، نواب، اکبر، زبیر وغیرہ۔ وہ لوگ سابق فوجی ہیں۔ کچھ ان کے دوست بھی ہیں۔ وہ لوگ گوریلا طرز کا ایک گروپ تشکیل دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اگر کوئی کچھ نہیں کرے گا تو وہ خود کشمیر میں گھس کر تیمور کو آزاد کرانے کی کوشش کریں گے......... میرا خیال ہے........."

"خدا کی پناہ!" عمر غصے سے ابلنے لگا۔ "تمہارا کیا خیال ہے؟ تم نے کیا سوچا؟ تم نے سوچا کہ یہ ممکن ہے۔ مائی گاڈ......... کیا میں بچوں میں گھرا بیٹھا ہوں یہاں۔ کیا میرے ساتھیوں میں کوئی ایک بالغ آدمی بھی نہیں۔ ارے، یہ نہ کوئی فلم ہے نہ ناول۔ یہ حقیقی زندگی کا ایک سنگین مسئلہ ہے۔"

اس بار تسکین، عمر کے اٹیک کے سامنے سرنگوں نہیں ہوئی۔ اس نے گمبھیر لہجے

میں کہا۔ "یہ میں بھی جانتی ہوں لیکن خوشی کی بات یہ ہے کہ وہ لوگ کم از کم کچھ کرنا تو چاہتے ہیں۔ تم اس بات پر ان سے ناراض نہ ہو۔"

عمر نے محسوس کیا کہ وہ ٹھیک کہہ رہی ہے لیکن وہ اپنی تلخی کو نہ دبا سکا۔ وہ اور ابھر آئی تھی۔ فرق وہی پرانا تھا۔ ان لوگوں کے خون میں گرمی تھی۔ جبکہ اس کی رگوں میں دوڑنے والا خون سرد پڑ چکا تھا۔ وہ عمر کے اس حصے میں نہیں تھا جہاں ناممکن کو ناممکن سمجھنے کے باوجود ممکن بنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس کے اندر برہمی ابلنے لگی۔ اپنی نااہلی کا احساس ستانے لگا۔ اس نے سوچا' جب آدمی عملاً کچھ کرنے کے قابل نہیں رہتا تو وہ اس کمی کو عقل اور تجربے سے ٹھنڈے دماغ کے ساتھ پورا کرنے کی کوشش کرتا ہے' ذہانت کو صحیح طور پر استعمال کیا جائے تو کون سا ایسا مسئلہ ہے جسے آدمی بیٹھے بیٹھے ہاتھ پاؤں ہلائے بغیر حل نہ کر سکے۔

یہ سوچتے سوچتے عمر کی زبان کا ذائقہ تلخ ہو گیا۔ وہ تسکین کے دل میں اپنی ستائش جگانے کے لئے ذہنی ہیرو ازم کے خوب صورت ہوائی قلعے تعمیر کر رہا تھا۔ یہ حقیقت چھپانے کی کوشش کر رہا تھا کہ اب وہ جوان نہیں رہا۔ اب اس میں معاملات کو سنبھالنے کی اہلیت بھی نہیں رہی تھی۔ اب اس کا ذہن بس زندگی کے خشک حقائق کی چھان پھٹک کر سکتا ہے۔ دوسری طرف تیمور تھا جو اپنے پیشے سے مخلص ہونے کے ناتے اندھا دھند ایک مصیبت میں جا پھنسا تھا۔ وہ لوگ تھے جو ایک موہوم سے امکان کی خاطر سر دھڑ کی بازی لگانے کو تیار ہو گئے تھے۔ ان تمام باتوں میں بے کار سہی لیکن ایک خوبصورتی اور کشش بہر حال تھی جو عورتوں کے لئے خاصی اپیل رکھتی ہے اور اس شعبے میں وہ خود ناکام تھا۔ کسی مسئلے کے دونوں رخوں کو دیکھنے میں کوئی حسن نہیں۔ عمر کو احساس ہو رہا تھا کہ وہ دھیرے دھیرے تسکین کو کھو رہا ہے.........اور اس میں اس بات کا غم برداشت کرنے کی سکت بھی نہیں ہے۔

"میں جانتا ہوں۔" اس نے تسکین سے کہا۔ "وہ اچھے لوگ ہیں جو اس انداز میں سوچ رہے ہیں لیکن یہ اس مسئلے کا حقیقت پسندانہ حل نہیں ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ میرا لہجہ خراب تھا لیکن در حقیقت میرے اعصاب جواب دینے لگے ہیں۔" اس نے سگریٹ سے ایک اور سگریٹ سلگا لی۔ "میں کب سے جاگ رہا ہوں نیند بھی آ رہی ہے

لیکن مجھ میں اتنی ہمت نہیں کہ گھر جا کر بستر پر لیٹوں اور روشنی گل کر دوں۔ سنو.........ایسا کرتے ہیں دفتر چلتے ہیں۔"

تسکین نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔

☆==========☆==========☆

عمر نے دفتر کھولا اور روشنی کے لئے سوئچ آن کر دیئے۔ عمر کی میز پر فائنل ایڈیشن کی چند کاپیاں رکھ دی گئی تھیں۔ عادت کے مطابق ان دونوں نے ایک ایک کاپی اٹھائی اور خود کار انداز میں اس کا جائزہ لینے لگے۔ تسکین اپنے ایڈیٹوریل پیج کو دیکھ رہی تھی۔ عمر فرنٹ پیج کا جائزہ لے رہا تھا۔ ابتدا میں تو ان دونوں کے ہاتھوں سے پھسلتے ہوئے اخبار کی سرسراہٹ کے سوا کوئی آواز نہیں تھی مگر پھر انہوں نے واضح طور پر ایک آواز سنی۔

پہلے تسکین نے اخبار سے نظریں ہٹا کر دیکھا جیسے غور سے کچھ سننے کی کوشش کر رہی ہو۔ اسی وقت عمر نے مستفسرانہ نظروں سے اسے دیکھا۔ "لگتا ہے' کوئی رو رہا ہو لیکن سمجھ میں نہیں آتا.........." پھر اچانک ہی اس کے حساس کانوں کو احساس ہو گیا کہ آواز کہاں سے آ رہی ہے۔ "..........اوہ' وہاں سے آ رہی ہے آواز........."

دونوں کی نظریں ایک ساتھ چھت کے نیچے روشن دان کی طرف اٹھیں۔ عمر نے پوچھا "یہ کہاں کھلتا ہے؟"

"ادارتی کمرے میں۔" تسکین نے جواب دیا۔ "وہاں کوئی ہے۔"

عمر اتنی دیر میں کرسی سے اٹھ چکا تھا۔ وہ ادارتی کمرے کی طرف بڑھا۔ تسکین اس کے پیچھے تھی۔ رونے کی آواز اور واضح ہو گئی تھی۔ آواز نسوانی تھی۔

اندر اندھیرا تھا۔ عمر نے لائٹ آن کر دی۔ کمرے کے اس حصے میں روشنی ہو گئی جہاں فائلنگ کیبنٹ رکھی تھیں۔ اس ناکافی روشنی میں تیمور کی میز پر دونوں بازوؤں پر سر رکھے روتی ہوئی نیلوفر ایک بھوت کی طرح دکھائی دی۔ عمر نے ایک اور لائٹ آن کی تو نیلوفر نے چونک کر سر اٹھایا۔ اس کا چہرہ اور آنکھیں مسلسل رونے سے سوج گئی تھیں۔ ہونٹ متورم ہو رہے تھے اور بال الجھ گئے تھے۔ رخساروں پر آنسوؤں کی لکیروں نے نشان ڈال دیئے تھے۔

عمر نے پوچھا۔ "کیا بات ہے نیلو؟ تم اتنی رات گئے یہاں؟ گھر کیوں نہیں گئیں؟"

تسکین تیزی سے بڑھی اور اپنی بانہیں اس کی گردن میں حمائل کر دیں۔ اس لمس نے نیلوفر کو اس کے وجود کا احساس دلایا۔ اس نے اپنا آنسوؤں سے تر چہرہ پونچھا۔ "آئی ایم سوری۔" وہ بولی تو اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ "نیند نہیں آ رہی تھی۔ میں یہ سوچ کر یہاں آ گئی کہ کچھ کام ہی کر لوں گی۔ اس کی میز دیکھ کر مجھے سب کچھ یاد آ گیا۔ کیسے وہ یہاں بیٹھتا تھا' کیسے کام کرتا تھا' کیسے بحث کرتا تھا۔ کمرا اس کے وجود سے بھرا ہوا تھا۔ کیسا ناقابل تسخیر لگتا تھا........"

عمر کو احساس ہوا کہ اس کے اپنے ذہن میں تیمور کی ایسی ہی تصویر نقش تھی........ توانائی سے بھرا ہوا دیو قامت انسان........ ناقابل تسخیر!

"پھر مجھے یاد آیا کہ جو کچھ ہوا' صرف میری وجہ سے ہوا۔" نیلوفر کہہ رہی تھی۔ "اس نے مجھ سے وعدہ لیا کہ میں کسی سے کچھ نہیں کہوں گی........ اور میں نے اس کی بات مان لی۔ میں نے یقین کر لیا اس کی بات پر جبکہ اپنے دل میں مجھے معلوم تھا کہ وہ کوئی بچکانہ اور خطرناک حرکت کرنے والا ہے۔"

عمر نے بڑھ کر نرمی سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ "میں جانتا ہوں۔ اس معاملے میں ہم سبھی قصور وار ہیں کسی نہ کسی طرح۔"

اس نے نظریں اٹھا کر حیرت سے اسے دیکھا کہ وہ بھی خود کو قصور وار ٹھہرا رہا ہے۔ وہ جانتی تھی کہ عمر کو احساس جرم کیوں ستا رہا ہے۔ یہ تو خود عمر ہی جانتا تھا کہ تیمور کو اسلام آباد بھیجنے کے فیصلے کے پیچھے کس قدر مشکوک نوعیت کے محرکات تھے۔

ان دونوں کی موجودگی نیلوفر کے لئے طمانیت کا باعث تھی۔ وہ بڑی حد تک پُرسکون ہو گئی۔ عمر اس کے نزدیک ذہانت اور طاقت کا مظہر تھا۔ اسے مسکراتے دیکھ کر اس کے دل میں امید جاگ اٹھی۔ وہ بولی تو اس کی آواز بمشکل سرگوشی جیسی تھی۔ "پلیز عمر صاحب' اسے بچا لیجئے۔ آپ اسے بچا سکتے ہیں۔"

عمر نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ "یہ تم کس بنا پر کہہ رہی ہو؟"

نیلوفر کے لہجے میں عجیب سا اعتقاد تھا۔ "آپ سب کچھ کر سکتے ہیں........ اللہ کی تائید سے۔"

تسکین نے نیلوفر کی تائید کی۔ "ہاں عمر........ تم اس کی مدد کر سکتے ہو۔"

عمر نے ان دونوں کو حیرت سے دیکھا۔ اس کی اپنی سوچ تو پچھلے کچھ عرصے سے ں کے برعکس ہو گئی تھی۔ وہ حیران تھا کہ بیک وقت دو عورتیں اس پر یہ یقین ظاہر کر ہی تھیں کہ وہ کچھ بھی کرنے کی اہلیت رکھتا ہے........ ناممکن کو ممکن بنا سکتا ہے۔ اس نے غور سے انہیں دیکھا کہ کہیں وہ مذاق تو نہیں اڑا رہی ہیں لیکن اسے ایسی کوئی بات ظر نہیں آئی۔ نیلوفر کی نگاہوں میں ایک تند التجا تڑپتی نظر آئی اور تسکین؟ تسکین کی گاہوں میں اعتماد تھا۔ وہ پھر ایک تکلیف دہ سوچ میں الجھ گیا۔ کیا ان دونوں عورتوں کو یک مشترکہ دکھ نے ایک کر دیا ہے؟

عمر نے ان کی طرف سے منہ پھیرا اور کمرے کا جائزہ لیا۔ بلیٹن بورڈ' کاپی ڈیسک' ں پر دیر سے آنے والی خبریں رکھی تھیں۔ فائلنگ کیبنٹ کی قطار جو ایک اعتبار سے بریری تھی۔ پھر فائلوں کا انبار جن میں دوسرے اخباروں کے تراشے تھے۔ ایک طرف ود انقلاب پیرس کے شماروں کا مرتب ڈھیر رکھا تھا۔

اس کے اندر اچانک ایک انقلاب برپا ہو گیا تھا۔ اسے طمانیت اور طاقت کا حساس ہو رہا تھا۔ جو توقع وہ اس سے کر رہی تھیں جیسے وہ اس توقع کو بہ آسانی پورا کر کتا ہو اور وہ آئیڈیا جو گزشتہ کئی دن سے اس کے ذہن میں چبھ رہا تھا' وہ بے چہرہ آئیڈیا چانک سطح شعور تک آ پہنچا تھا۔ بس اسے اپنے شعور پر سے چڑ چڑے پن اور شکوک و بہات کی وہ تہیں ہٹانا تھیں جو واضح طور پر سوچنے نہیں دے رہی تھیں۔ بلکہ انہی کی وجہ سے وہ اب تک اس پر عمل نہیں کر سکا تھا۔

وہ چند لمحے کیبنٹ کو دیکھتا رہا پھر اچانک وہ مڑا اور تسکین اور نیلوفر کو دیکھنے لگا۔ ہ سحرزدہ سی وہیں بیٹھی تھیں جہاں اس نے انہیں چھوڑا تھا اور وہ اسے ہی تک رہی تھیں۔ تسکین کی نظروں میں اس کے لئے محبت اور پرستش تھی جیسے وہ اس کی قوتوں پر دوبارہ یقین کرنے لگی ہو۔

وہ بہت تیزی سے دل ہی دل میں اس آئیڈیے کے خدوخال اجاگر کرتا رہا۔ وہ بظاہر اسے ناقص بیج معلوم ہو رہا تھا جس سے امید کا پودا بھی نہیں پھوٹے گا۔ ایک لمحے کو اس نے سوچا کہ اس آئیڈے سے دستبردار ہو جائے لیکن اگلے ہی لمحے اسے احساس ہو گیا

کہ اسے ڈیولپ کر کے اس سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ اس وقت اس کے وجود میں بھی جیسے پرانی توانائیاں مچل رہی تھیں۔ ان کی مدد سے اس منصوبے کی ناکامی کا ہر امکان ختم کیا جا سکتا تھا۔

وہ تیز آواز میں چیخا۔ "چلو نیلوفر' ادھر آؤ۔ مصروف ہو جاؤ۔ مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ بھارت اور مقبوضہ کشمیر کے وزرأ اور اہم لوگوں کے متعلق فائلیں نکالو۔ ان لوگوں کے متعلق جو اس وقت اقتدار میں ہیں۔ تازہ فائلیں بھی نکالو اور کراس فائلیں بھی۔ چلو.......... جلدی کرو۔"

اس کے لہجے کی تیزی نے نیلوفر کو ہسٹریا جیسی کیفیت سے دوچار کر دیا۔ وہ اٹھی اور فائلوں کی طرف چلی گئی۔ پہلے مرحلے میں وہ بھارتی اور کشمیری حکومت کے اہم لوگوں کے ناموں کی فہرست بنانے لگی۔ تسکین بھی آگے آ گئی۔ اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ "کرنا کیا ہے عمر؟" اس نے پوچھا۔ حالانکہ وہ جانتی تھی کہ وہ کیا کرنا چاہ رہا ہے۔

"بلیک میلنگ۔" عمر نے کہا۔ "ہمیں کسی نہ کسی نوع کا پریشر ڈیولپ کرنا ہے اور جن لوگوں سے سابقہ پڑا ہے' وہ صرف مجرمانہ زبان سمجھتے ہیں۔ کسی کے پاس کسی کے خلاف کس نوعیت کا مواد ہے۔ کون کس کو سیاسی طور پر تباہ کر سکتا ہے۔ ہمیں بھی ایسی ہی معلومات ڈھونڈنی ہیں۔"

نیلوفر نے اس کی طرف سوانحی خاکوں کے لفافے بڑھائے۔ وہ مسکرایا کیونکہ لفافے ضخیم تھے۔ ابتدا ہی میں اس نے لائبریری پر بہت زور دیا تھا اور اس سلسلے میں پبلشر کا بڑا پیسہ خرچ کرایا تھا۔ وہ اب کام آ رہا تھا۔ لفافوں میں صرف انگریزی زبان کے اخباروں کے تراشے نہیں تھے بلکہ فرانسیسی اخباروں سے بھی متعلقہ مواد حاصل کیا گیا تھا۔ اس کے لئے اس نے فرانس میں ایک ایسے انگریزی اخبار کی لائبریری بھی خرید لی تھی جو بند ہو رہا تھا۔ عمر' ان ایڈیٹروں میں سے تھا جو ریسرچ اور ریفرینس میٹریل کو اخبار کی ریڑھ کی ہڈی تصور کرتے ہیں۔

عمر نے آدھے لفافے تسکین کی طرف بڑھا دیئے۔ وہ اب لائبریری کی بڑی میز کے سامنے بیٹھے تھے۔ "میری بات سمجھ رہی ہو نا!" عمر نے کہا۔ "یہ ایک درجن افراد کے متعلق معلومات ہیں اور یہ نقطۂ آغاز ہے۔ ان میں سے کوئی بدمعاش ثابت ہو سکتا ہے۔

کسی کے متعلق ایسی کوئی بات معلوم ہو سکتی ہے جسے چھپانا اس کے لئے ضروری ہو۔ سب سے پہلے ان بارہ افراد میں سے کوئی ایک ہدف منتخب کرنا ہے۔" نیلوفر کھڑی اسے تک رہی تھی۔ وہ پلٹ کر اس پر چلایا۔ "جاؤ.......... جا کر کافی بناؤ۔ ہمارے لئے بھی اور اپنے لئے بھی۔ آج تو یوں لگتا ہے' صبح نہیں ہو گی۔ جلدی کرو میری بہن۔" وہ یہ بھی چاہتا تھا کہ نیلوفر مصروف رہے۔

ان لفافوں میں موجود مواد کو پڑھنا شروع کر دیا گیا۔ ہر اہم بات نوٹ کی جا رہی تھی۔

"جمنا پرشاد ایک بار گرفتار ہوا تھا.......... غبن کے الزام میں۔" تسکین نے کہا۔

"اور اسے سزا بھی ہوئی تھی۔"

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ سزا کاٹ چکا ہے۔ اس کی بنیاد پر وہ بلیک میل نہیں ہو سکتا۔" عمر بولا۔ "ہمیں کسی ڈھکی چھپی بات کی تلاش ہے۔ یہ بات ذہن میں رکھو۔ وہ کوئی کھلی بات نہیں ہو گی۔ اخبار میں تو شاید اس کا بس کوئی موہوم سا اشارہ ہو گا۔ ایسی کوئی بات پکڑ کر ہم ریسرچ کریں گے۔ سمجھیں۔"

وہ پھر لفافوں پر جھک گئے۔ ذرا دیر بعد عمر نے بے ساختہ کہا۔

"اوہ.......... اوہ.........."

تسکین نے چونک کر اسے دیکھا۔ کچھ مل گیا تمہیں؟"

اسی وقت نیلوفر کافی لے آئی۔

عمر بولا تو اس کے لہجے میں سنسنی تھی۔ "یہ میں بھارت کے موجودہ وزیر داخلہ خواجہ مقصود کو چیک کر رہا ہوں۔ یہ وہ شخص ہے جس نے کہا تھا کہ اب کشمیر میں پکڑے جانے والے ہر پاکستانی کو پھانسی پر لٹکا دیا جائے گا۔ اس شخص میں آگے ہی آگے بڑھنے کی خواہش بے حد شدید ہے۔ یہ پہلے دائیں بازو میں تھا پھر کیمونسٹوں میں گھسا اور آخر میں سیکولر ہو گیا۔ اس کا ریکارڈ سنو' خواجہ مقصود کشمیر کے ایک زمیندار کا بیٹا۔ وکالت شروع کی۔ مسلم لیگ میں شامل ہوا۔ پھر کانگریس میں چلا گیا۔ تقسیم ہند کے بعد کیمونسٹ پارٹی میں شمولیت اختیار کی مگر ایک سال بعد دوبارہ کانگریس میں واپس آ گیا۔ ۴۸ء تک کشمیر کا وزیر داخلہ رہا۔ اس کے بعد کچھ عرصے حکومت سے باہر رہا۔ ۴۹ء میں بھارتی کابینہ میں

نائب وزیر کی حیثیت سے شامل ہوا۔ تب سے کانگریس ہی میں ہے اور ہمیشہ کوئی نہ کوئی وزارت اس کے پاس رہی ہے۔" عمر نے کچھ توقف کیا اور گہری سانس لی۔ "جس شخص نے وفاداریاں اتنی بار تبدیل کی ہوں' اس کے پاس یقیناً کوئی ایسی بات تو ہو گی جسے چھپانا ضروری ہو۔ سنو نیلو......... تم مجھے خواجہ مقصود کے متعلق جو کچھ بھی فراہم کر سکتی ہو' دے دو۔ مجھے تصویریں بھی چاہئیں۔ بعض اوقات تصویر کا کیپشن وہ کچھ بتا دیتا ہے جو دو کالمی خبر بھی نہیں بتا سکتی۔ مجھے ان تمام لوگوں کے فوٹوگراف دو۔ اگر کوئی شخص کوئی بات چھپا رہا ہوتا ہے تو یہ بھی ہوتا ہے کہ کسی نہ کسی کو اس کے بارے میں معلومات ہوتی ہیں اور ایسی معلومات خریدی بھی جا سکتی ہیں........."

"مگر اتنی بھاری قیمت پر کہ تم ادا نہیں کر سکتے۔" تسکین نے اس کی بات کاٹ دی۔ "تم کہاں سے ادا کرو گے وہ قیمت؟"

"تم اس کی فکر نہ کرو۔" عمر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "ہمارا پبلشر ارب پتی آدمی ہے وہ جانتا ہے کہ اگر ہم نے کسی طرح تیمور کو بچا لیا تو ہمارے اخبار کا دنیا بھر میں شہرہ ہو گا۔ وہ اس سلسلے میں بڑی سے بڑی رقم ادا کرنے کو تیار ہے۔"

"اوہ........." تسکین نے کہا اور سامنے رکھے لفافے پر جھک گئی۔ وہ مشینی انداز میں کام کر رہی تھی۔ پھر بھی عمر' یہ تو بتاؤ کہ ہمیں کس قسم کی معلومات کی تلاش ہے؟"

"یہ تو میں نہیں کہہ سکتا۔" عمر نے جواب دیا۔ "جانتا ہوں لیکن نہیں جانتا۔ یہ بات طے ہے کہ خواجہ مقصود موقع پرست بدمعاش ہے۔ ہمیں اس کے متعلق وہ بات جاننی ہے جو وہ ہر قیمت پر چھپانا چاہتا ہے۔ ہم موجودہ وقت سے لے کر پیچھے تک اسے وقت کے حوالے سے ٹٹولیں گے۔ کس سال وہ کہاں تھا' کب تھا اور کیوں تھا۔ شاید اس طرح کوئی سراغ مل جائے کسی اہم بات کا۔ سوچتا ہوں' ڈیڈ یہاں ہوتا تو بڑی مدد ملتی۔ اس کی یادداشت........."

دروازے پر کھڑے ڈیڈ لیپ ہام نے کہا۔ "یہ صبح کے پونے تین بجے مجھے کون یاد کر رہا ہے اور کیوں؟"

"ڈیڈ......... تم اور اس وقت یہاں۔" عمر خوشی سے چیخ اٹھا۔ "یعنی شیطان کو یاد کرو اور شیطان حاضر۔ میں سمجھ گیا۔ ہم لوگوں کی طرح تمہیں بھی نیند نہیں آ رہی تھی۔

ہمیں تمہاری ضرورت ہے ڈیڈ۔"

ڈیڈ نے حیرت سے ان کے سامنے رکھے لفافوں اور تراشوں کو دیکھا۔ "یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ یہ کس قسم کا رت جگا منا رہے ہو تم لوگ؟"

تسکین نے بے حد یقین سے کہا۔ "عمر' تیمور کو بھارتیوں کے چنگل سے رہا کرانے کا ارادہ کر چکا ہے۔" اس کے لہجے میں قطعیت تھی۔

عمر نے چونک کر تسکین کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر اور آنکھوں میں اسے جو کچھ نظر آیا' اس نے اس کا دل بڑا کر دیا۔ "ڈیڈ......... ہمیں خواجہ مقصود......... بھارتی وزیر داخلہ کے متعلق معلومات درکار ہیں' ہر طرح کی معلومات۔ جو بھی تمہیں یاد ہو بتاؤ۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ کون سی بات ہمارے کام کی ہو گی۔"

تسکین ناموں اور تاریخوں کے حوالے سے خواجہ مقصود کی نقل و حرکت نوٹ کر رہی تھی۔ اس سلسلے میں بھارتی اخبارات کا ریکارڈ کام آ رہا تھا۔ عمر اور ڈیڈ تراشوں اور تصویروں سے حاصل ہونے والی معلومات اسے نوٹ کرا رہے تھے۔ نیلوفر' جس کے چہرے پر اب پھر رنگ دوڑ رہا تھا' مزید تراشے اور فوٹوگراف ان کی طرف بڑھا رہی تھی۔ اس تلاش میں اسے بار بار کیبنٹ سے فائلوں تک اور فائلوں سے کیبنٹ تک حرکت کرنی پڑ رہی تھی۔ درمیان میں موقع نکال کر وہ سب کو کافی بھی پیش کرتی۔ تسکین' عمر کے سامنے اپنے نوٹس پھیلاتی جا رہی تھی۔ کبھی عمر تراشوں اور فوٹوگرافس سے نظریں اٹھا کر ان نوٹس کو دیکھتا۔

اچانک عمر نے سامنے رکھے ہوئے تراشے اور فولڈرز ایک طرف ہٹائے اور میز پر گھونسا مارا۔ "اے تسکین......... ڈیڈ......... واہ......... کام بنتا نظر آ رہا ہے۔"

وہ سب مستفسرانہ نظروں سے اسے دیکھنے لگے۔

"یہ دیکھو........." عمر نے آخری صفحے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ تو بالکل واضح ہے۔ ہر ماہ اس کے......... اس کی مصروفیت کے متعلق کچھ نہ کچھ شائع ہوا ہے لیکن ۴۸ء کی دوسری سہ ماہی سے ۴۹ء کے اوائل تک وہ خبروں سے غائب رہا ہے۔ تقریباً نو ماہ کا عرصہ ہے یہ۔ اس دوران وہ کہاں رہا آخر؟"

وہ تینوں سر جوڑ کر بیٹھ گئے اور نوٹس کے آخری صفحے کا جائزہ لینے لگے۔ عمر نے

درست کہا تھا۔ اس کے بتائے ہوئے عرصے میں خواجہ مقصود خبروں سے غائب رہا تھا۔ پھر جنوری ۴۹ء میں لندن سے اس کے متعلق ایک خبر شائع ہوئی تھی۔ وہ وہاں ایک اسپتال میں داخل تھا جہاں اس کی طبیعت خاصی سنبھل گئی تھی۔

"طبیعت خراب؟ اس کی بیماری کی نوعیت کیا تھی؟" عمر نے سوال اٹھایا۔ "اور خبر اسی وقت شائع کیوں نہیں ہوئی۔ میرے خیال میں وہ بیماری سیاسی نوعیت کی ہو گی۔"

"یہ تو ٹھیک ہے لیکن اس عرصے میں وہ کہاں رہا ہو گا؟" ڈیڈ نے خود کلامی کے انداز سے کہا۔

"یہی تو مسئلہ ہے۔" تسکین بولی۔ "اور یہ عرصہ میری تو پیدائش سے بھی پہلے کا ہے۔"

"ان دنوں میں بھی چھوٹا سا بچہ تھا۔" عمر نے کہا۔

"اور میں امریکا میں تھا۔" ڈیڈ بولا۔ "اور تمہارے خطے کے متعلق میں زیادہ کچھ نہیں جانتا۔"

وہ لوگ پھر تراشوں اور تصویروں پر جھک گئے۔ اب وہ صرف اپریل ۴۸ء کے عرصے پر زور دے رہے تھے لیکن اس عرصے میں خواجہ مقصود کے بارے میں کوئی خبر چھپی ہی نہیں تھی۔ وہ تینوں ہی فرسٹریشن کا شکار ہونے لگے۔

"اگر وہ اس عرصے میں غائب رہا ہے تو اس عرصے کی کوئی خاص اہمیت بھی ہو گی۔" عمر بڑبڑایا۔ "کوئی بہت اہم بات بھی ہوئی ہو گی اس عرصے میں۔"

"یہ تو ہے۔" تسکین نے تائید کی۔

ڈیڈ کسی سوچ میں گم تھا۔ اچانک اس نے سر اٹھا کر کہا "اس عرصے میں جنگ ہوئی تھی کشمیر میں۔"

اور عمر کا ذہن جیسے روشن ہو گیا۔ "ہاں.......... یہ ہوئی نا بات.........." اس نے پُرجوش لہجے میں کہا۔ "حیرت ہے کہ مجھے پہلے ہی یاد کیوں نہیں آیا۔ یہ وہی جنگ ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ پاکستانی فوج کو صرف ۲۴ گھنٹے کی مزید مہلت مل جاتی تو پورا کشمیر آزاد کرا لیا گیا ہوتا.........."

"لیکن امریکا نے پاکستان پر زبردست دباؤ ڈال کر جنگ بند کرا دی۔" ڈیڈ نے کہا۔

"پاکستان اس وقت ایک نوزائیدہ اور بے سروساماں ملک تھا اور ہر طرح کے بحرانوں سے دوچار تھا۔ پاکستان کو امریکی دباؤ کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پڑے۔"

"اور اسی کے نتیجے میں مسئلہ کشمیر ابھی تک لاینحل ہے۔" عمر بولا۔

"مگر مسئلہ تو اب بھی وہیں ہے۔" تسکین نے انہیں یاد دلایا۔ "خواجہ مقصود اس عرصے میں کہاں تھا؟"

عمر کا ذہن اب بہت تیزی سے کام کر رہا تھا۔ اس نے کہا۔ "اب ہمیں مفروضے قائم کرنا پڑیں گے اور اس کے لئے ہمیں خواجہ مقصود کی نفسیات کو پیشِ نظر رکھنا ہو گا۔"

"لیکن مفروضوں کے لئے بھی تو بنیاد کی ضرورت ہوتی ہے۔" تسکین نے اعتراض کیا۔

"بنیاد تو ہے ہمارے پاس۔" عمر نے کہا۔ ڈیڈ اس کی بات بڑی توجہ سے سن رہا تھا۔ "بنیاد ہے کشمیر کی جنگ اور خواجہ مقصود کی فطرت۔ ہم جانتے ہیں کہ وہ موقع پرست اور ابن الوقت ہے۔ اس کا کوئی اصول نہیں جس کا وہ پابند ہو۔ وہ حصولِ اقتدار کے لئے.......... آگے بڑھنے کے لئے کچھ بھی کر سکتا ہے۔ ہم کچھ دیر کے لئے خود کو ۴۸ء کا خواجہ مقصود سمجھ کر سوچیں تو بات بن جائے گی۔ میں فرض کرتا ہوں کہ میں موقع پرست خواجہ مقصود ہوں۔ میں مقبوضہ کشمیر کا وزیرِ داخلہ ہوں۔ بھارت نے خود کشمیر میں جنگ چھیڑی ہے لیکن مقبوضہ کشمیر کے ایک تہائی حصے کو پاکستان نے آزاد کرا لیا ہے۔ اب سوچو کہ اس پر اقتدار کے بھوکے کسی شخص کا کیا ردعمل ہو سکتا ہے؟"

"ایسا شخص وفاداری تبدیل کر کے فوری طور پر جیتنے والوں سے رابطہ کرے گا۔" تسکین نے چند لمحے سوچنے کے بعد کہا۔

"بالکل درست ہے۔" عمر کا لہجہ پُرجوش ہو گیا۔ "اگر میں اس کی جگہ ہوتا اور خدانخواستہ اس جیسی ہی فطرت ہوتی میری تو میں اس موقعے پر آزاد کشمیر کا.......... پاکستان کا رخ کرتا اور کسی طرح پاکستان سے رشتہ وفاداری استوار کرتا۔ مسلمان ہونے کے ناتے یہ کام اتنا دشوار بھی نہ ہوتا لیکن ظاہر ہے کہ یہ رابطہ' یہ سفر خفیہ ہوتا۔ اخبار والوں کو اس کی بھنک بھی نہ پڑنے دیتا میں۔" اس نے توقف کیا اور ایک گہری سانس لی۔ "خواجہ مقصود نے تو اپنی دانست میں عقل مندی کی تھی اور جیتنے والوں کی طرف چلا گیا تھا مگر

بد قسمتی سے امریکا بہادر کے بیچ میں کودنے کی وجہ سے کھیل بگڑ گیا۔ اب سوچو کہ اس مرحلے پر خواجہ مقصود جیسے ابن الوقت کا کیا حال ہوا ہو گا۔ کشمیر اور بھارت واپس جانے میں یہ ڈر تھا کہ بھارتیوں کو کسی طرح معلوم ہو گیا ہو گا کہ اس نے ان سے غداری کی ہے۔ ظاہر ہے' جس کے دل میں چور ہو گا وہ تو ڈرے گا ہی۔ ممکن ہے' بھارت والوں کو اس کی تبدیلی کا علم ہی نہ ہوا ہو لیکن خواجہ بہرحال خوفزدہ ہو گیا تھا۔ اپنی دانست میں وہ نہ ادھر کا رہا تھا نہ ادھر کا۔ ایسے میں وہ کہاں کا رخ کرتا' کس سے سفارش کراتا' اپنے کشمیر سے غائب ہونے کا کیا عذر پیش کرتا۔ یہ وہ وقت تھا جب آزادی کو صرف ایک سال گزارا تھا.......... اور انگریز ہی ایسے لوگوں کے آقا تھے۔ چنانچہ وہ انگلینڈ بھاگا ہو گا۔ وہاں وہ اسپتال میں بھی داخل ہوا۔ گویا غیر حاضری کا جواز پیدا کیا پھر ممکن ہے اس نے انگریزوں سے سفارش کرائی ہو کیونکہ بھارت واپس پہنچتے ہی اسے بھارتی کابینہ میں نائب وزیر کی حیثیت سے شامل کر لیا گیا۔" عمر نے میز پر گھونسا مارا۔ "مجھے یقین ہے کہ سب کچھ یونہی ہوا ہو گا۔"

"لیکن پاکستان کے لئے ایک ایسا شخص قابل قبول کیسے ہوا ہو گا؟ وہ جانتے تھے کہ وہ تھالی کا بینگن ہے۔" تسکین نے اعتراض کیا۔

"ممکن ہے' پاکستان نے اسے قبول ہی نہیں کیا ہو۔ یہ حقائق تو معلوم نہیں کئے جا سکتے۔ کیونکہ میرا خیال ہے' اس وقت کے پاکستانی ارباب اقتدار میں سے کوئی بھی زندہ نہیں لیکن ٹھہرو.........." عمر کو ایک خیال نے چونکا دیا۔ اس نے چند لمحہ اس پر غور کیا پھر بولا۔ "یہ بھی ممکن ہے کہ خواجہ نے خود کو پاکستان کے لئے قابلِ قبول بنا لیا ہو۔"

"کیسے؟" ڈیڈ لیپ ہام نے کہا۔

"یہ خود سوچو۔ یہ ناممکن تو نہیں۔"

تسکین نے چند لمحے سوچنے کے بعد کہا۔ "ممکن ہے' وہ اپنے ساتھ اہم نوعیت کی معلومات اور دستاویزات لایا ہو۔"

"ایگزیکٹلی۔" عمر نے میز پر گھونسا مارتے ہوئے کہا۔ "میرا خیال ہے' یہی کچھ ہوا ہو گا۔ ہم نے اپنے طور پر یہ تصویر مکمل کر لی ہے۔"

نیلوفر اسے ستائشی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ تسکین کی آنکھوں میں چمک تھی

لیکن ڈیڈ لیپ ہام کسی گہری سوچ میں گم تھا۔ بالآخر اس نے سر اٹھایا۔ "فرض کر لو کہ یہ درست ہے۔" اس نے کہا۔ "لیکن ہم اس سے کیسے فائدہ اٹھا سکتے ہیں؟ ان مفروضوں کی بنیاد پر ہم خواجہ مقصود پر دباؤ تو نہیں ڈال سکتے۔"

"خواجہ مقصود کو جہنم میں جھونکو۔ ہمیں اس دوسرے شخص کو تلاش کرنا ہے۔" عمر نے کہا۔

"دوسرا شخص؟ کون دوسرا شخص؟"

"وہ جو اس تمام عرصے میں خواجہ مقصود کے ساتھ ہو گا۔ کمرے میں موجود تمام لوگ عمر کو حیرت سے دیکھنے لگے۔ "کیا مطلب؟" ڈیڈ نے کہا۔

"چلو.......... تھوڑی دیر کے لئے اس دوسرے شخص کو میرے ذہن کی اختراع سمجھ لو۔" عمر بولا۔ "لیکن مجھے یقین ہے اس کا وجود ہے۔ اس طرح کے معاملات میں دوسرا آدمی ہمیشہ موجود ہوتا ہے۔ کوئی سیکریٹری' کوئی دوست' کوئی خفیہ مشیر.......... کوئی نہ کوئی تو ہو گا۔ خواجہ ایسا آدمی نہیں کہ بغیر کسی گواہ کے سیاسی سودے بازی کرے جس میں دوسرے فریق کے مکر جانے کا خدشہ موجود ہو۔ میرا خیال ہے وفادار سیکریٹری زیادہ قابلِ اعتبار ہوتا ہے۔ ایک آدمی کا کنٹرول کم ہی ہوتا ہے۔ کیا خیال ہے تم لوگوں کا؟"

نیلوفر شدت سے نفی میں سر ہلا رہی تھی۔ تسکین نے کہا "ممکن ہے' لیکن.........."

ڈیڈ کو اپنے لئے آئینہ دکھانے والے کا اور خواب دیکھنے والوں کے سر پر یخ پانی کی بالٹی انڈیلنے والے کا رول اچھا نہیں لگ رہا تھا لیکن کسی نہ کسی کو تو یہ رول کرنا ہی تھا۔ اس نے کہا۔ "خواجہ کی نقل و حرکت کی خبروں میں نہ کسی سیکریٹری کا تذکرہ ہے' نہ دوست کا۔ اگر کوئی اس کے ساتھ ہوتا تو خبروں میں بھی اس کا تذکرہ ہوتا۔ بہرحال ہمیں اور چیک کرنا.........."

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو ڈیڈ۔" عمر نے اس کی بات کاٹ دی۔ "لیکن پہلے اس مفروضے پر تو اچھی طرح کام کر لیا جائے۔ فرض کرو' معاملات بگڑنے کے بعد خواجہ تو لندن بھاگ لیا اور دوسرا شخص واپس چلا گیا.......... کشمیر یا بھارت.........."

"کاش یہ حقیقت ہو عمر۔" تسکین نے آہ بھر کے کہا۔ "کاش ایسا ہی ہوا ہو۔ کاش

وہ دوسرا شخص محض تصوراتی نہ.........."

"مجھے یقین ہے کہ دوسرے شخص کا وجود ہے۔" عمر نے ہٹ دھرمی سے کہا۔

"اے اللہ .... ایسا ہی ہو جائے.........." نیلوفر نے دعا مانگنے والے انداز میں کہا۔

"ہم اس شخص کو ڈھونڈیں گے کیسے؟" ڈیڈ نے سوال اٹھایا۔

عمر نے اسے دیکھ کر پلکیں جھپکائیں۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ کوئی چیز اس کے سامنے سے اڑتی ہوئی گزر رہی ہے۔ اگر اس نے اسے فوری طور پر گرفت میں نہیں لیا تو وہ اس کے ہاتھ سے نکل جائے گی۔ اسے اپنے تخیل کو پوری قوت اور توانائی کے ساتھ استعمال کرنا تھا۔ وہ لمحاتی جادو کمزور دھاگے جیسا تھا جو کسی بھی وقت ٹوٹ سکتا تھا اور تیمور کی زندگی اسی کمزور دھاگے سے بندھی ہوئی تھی۔ اس نے سوچا' میں اس دھاگے کو ٹوٹنے نہیں دوں گا۔ میں اس دھاگے کو پکڑ کر چلتا رہوں گا.......... اس یقین کے ساتھ کہ یہ مجھے وہاں پہنچا دے گا جہاں میں پہنچنا چاہتا ہوں۔

اس نے ریسیور اٹھایا اور آپریٹر سے کہا۔ "پائرے.......... میں عمر جاوید بول رہا ہوں۔ سنو' نئی دہلی فون ملاؤ۔ میں بھارت کے وزیر مواصلات سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ ہر قیمت پر۔ چاہو تو کوئی بھی جھوٹ بول دو۔ باقی میں دیکھ لوں گا' سمجھے۔ میں کال ملنے کا انتظار کر رہا ہوں.........." ریسیور رکھ کر وہ مسکراتے ہوئے ان لوگوں کی طرف پلٹا۔

"وزیر مواصلات جسونت سنگھ سے میری پرانی دوستی ہے۔ دوستی کیا کبھی میں بھی بہت آڑے وقت میں اس کے کام آیا تھا۔ وہ اس احسان کا بدلہ تو نہیں اتارنا چاہے گا لیکن اسے سوتے سے اٹھایا جائے گا.......... اور ایسے میں انسان اتنی اچھی طرح سوچنے کے قابل نہیں ہوتا۔ ہمیں اس سے کام کی کوئی بات معلوم ہو سکتی ہے۔"

اب وہ سب خاموشی سے کال ملنے کے منتظر تھے۔ اپنے بکھرے ہوئے اعصاب کو سمیٹنے کی خاطر نیلوفر نے خود کو مصروف کر لیا تھا۔ وہ ان لفافوں کو سمیٹنے لگی جنہیں نمٹایا جا چکا تھا۔ پھر وہ کافی بنانے چلی گئی۔ ڈیڈ بے مقصد' فائلوں کی ورق گردانی کر رہا تھا۔ تسکین' خواجہ کی نقل و حرکت کے چارٹ پر کام کر رہی تھی۔ عمر مضطربانہ انداز میں اِدھر اُدھر ٹہل رہا تھا۔

بیس منٹ بعد ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ انسٹرومنٹ سے قریب ترین نیلوفر تھی۔ اس نے ریسیور اٹھا کر عمر کی طرف بڑھا دیا۔ "ہیلو جسونت سنگھ جی' میں عمر بول رہا ہوں.......... عمر جاوید۔ مجھے افسوس ہے کہ آپ کی نیند خراب کی لیکن یہ بہت اہم معاملہ ہے۔ مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔ میں آپ کے وزیر داخلہ خواجہ مقصود کے متعلق کچھ معلومات چاہتا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ ۴۹ء کے اوائل میں وہ لندن کے ایک اسپتال میں ایڈمٹ تھا اور اس سے پہلے.......... تقریباً چھ ماہ پہلے وہ کشمیر کا نائب وزیر ہونے کے باوجود منظر عام سے اوجھل رہا تھا.......... نہیں' میں شائع کچھ نہیں کروں گا اس سلسلے میں۔ یہ سو فیصد آف دی ریکارڈ ہو گا۔ دراصل ایک ساتھی سے شرط لگ گئی ہے اس سلسلے میں.......... جی.......... جی ہاں.......... میں سمجھتا ہوں یہ بات۔ میرا کہنا ہے کہ وہ اس عرصے مین پاکستان میں رہا یا آزاد کشمیر میں.......... جی.......... جی ہاں.......... آپ بے فکر رہیں۔ یہ شائع کرنے والی بات ہی نہیں۔ جی ...." اس نے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھتے ہوئے ڈیڈ کو بتایا۔ "کام بن گیا ڈیڈ وہ پاکستان میں ہی تھا۔" پھر وہ فون پر بات کرنے لگا۔

".......... مجھے معلوم ہے' وہ بات بنی نہیں تھی۔ بساط الٹ دی گئی تھی لیکن اس کی پوزیشن تو خراب ہو گئی تھی۔ میں دراصل یہ جاننا چاہتا ہوں کہ اس سفر میں اس کے ساتھ کون تھا.......... جی.......... اوہ سیکریٹری تھا۔"

"کچھ یاد ہے' ان کے درمیان کچھ اختلاف بھی ہوا تھا؟" عمر' جسونت سے پوچھ رہا تھا۔ "او.......... اچھا' ہاں.......... جی میں سمجھ گیا۔ آپ کو اس کا نام یاد ہے جناب..........؟ جی.......... جی میں سمجھ رہا ہوں آپ کی بات۔ بہت پرانی بات ہے وہ۔ یہ بتائیں' دیکھنے میں کیسا تھا وہ۔ جی ہاں' یہ تو ہمیں معلوم ہے کہ وہاں سے خواجہ لندن چلا گیا تھا مگر سیکریٹری کے متعلق.......... نہیں جناب' میں قسم کھا سکتا ہوں کہ اس کے متعلق کچھ معلوم نہیں۔ شکریہ جناب۔ اگر کبھی آپ کو میری یا میرے اخبار کی مدد کی ضرورت ہو تو ہم حاضر ہیں۔ گڈبائی سر۔"

اس نے ریسیور کریڈل پر رکھا اور انہیں فاتحانہ نظروں سے دیکھا۔ مکڑی کا جو جال وہ بُن رہا تھا' وہ کچھ اور دبیز ہو گیا تھا۔ "یہ خوش قسمتی ہے ہماری۔ خواجہ کے ساتھ ایک اور شخص تھا جسے خواجہ کے تمام معاملات کا علم تھا۔ شاید اس کے پاس ثبوت بھی ہیں

خواجہ کی غداری کے۔ ایک دن وہ تمام کاغذات لے کر چپکے سے نکل لیا تھا۔ اس کے بعد خواجہ اور زیادہ خوفزدہ ہو گیا..........“

”سیکریٹری کا نام کیا تھا اور وہ چلا کہاں گیا؟“

”جسونت سنگھ کو اس کا نام یاد نہیں۔ ویسے بھی وہ غیر اہم سا آدمی تھا۔ وہ شاید دوبارہ کشمیر چلا گیا تھا۔ بعد میں خواجہ بھی واپس چلا گیا۔ وہ وزیر بن گیا لیکن ڈرتا رہا کہ اس کا سابقہ سیکریٹری بریف کیس میں ڈائنامائٹ لئے پھر رہا ہے مگر اس کے بعد وہ پُر سکون ہو گیا۔ جسونت سنگھ کا کہنا ہے کہ سیکریٹری شاید مرچکا ہے۔“

یہ سن کر سب کے چہرے ستے گئے۔ آس کی آخری ڈوری بھی ٹوٹ گئی تھی۔

”یعنی کہ..........“ تسکین نے کہنا چاہا۔

”میں نہیں مانتا یہ بات۔“ عمر نے میز پر گھونسہ مارتے ہوئے کہا۔ ”چلو.......... سب اپنے اپنے کام لگ جاؤ۔“

مگر سب اسے تکے جا رہے تھے۔ وہ کچھ دیر ٹہلتا رہا پھر بولا۔ ”سچائی یہ ہے کہ خواجہ کا سیکریٹری یا مرچکا ہے یا زندہ ہے۔ ہمیں بہرحال معلوم نہیں کہ کون سی بات سچ ہے۔ اگر وہ مرچکا ہے اور مرنے سے پہلے دستاویزات کسی اور کو نہیں دے سکا یا دستاویزات تلف کر دی گئی ہیں تو اس صورت میں خواجہ محفوظ ہے۔ خواجہ ایسا آدمی نہیں کہ اتنی تیز دھار تلوار اس کے سر پر لٹک رہی ہو اور وہ بھارت واپس چلا جائے۔ اب تین صورتیں ممکن ہیں۔ یا تو اسے یقین ہو گیا کہ سیکریٹری مرچکا ہے یا پھر کسی اعتبار سے ان دستاویزات کی اہمیت ختم ہو گئی ہو یا پھر سیکریٹری بھارت سے فرار ہو گیا ہو گا۔ اس آخری صورت میں خواجہ کو یقین ہو گا کہ سیکریٹری جب بھی واپس آئے گا‘ اسے ضرور علم ہو جائے گا۔ وزیر داخلہ ہونے کی حیثیت سے سیکرٹ پولیس اور دیگر سرکاری ایجنسیوں کا سربراہ وہی ہے۔“ اس نے توقف کیا اور ڈیڈ کی طرف مڑا۔ اس کے انداز میں التجا تھی۔ ”ہمیں یہ تسلیم نہیں کرنا چاہئے کہ سیکریٹری مرچکا ہے۔“ اس نے اپیل کی۔ ”اس لئے کہ دیگر امکانات بھی موجود ہیں اور ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ اس دور میں خواجہ کا تعلق بائیں بازو سے تھا۔ اس کے روابط آہنی پردے کے تمام ممالک سے تھے اور ظاہر ہے‘ سیکریٹری کی وابستگی بھی وہیں ہو گی..........“

”ایک منٹ“ ڈیڈ نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”مجھے کچھ یاد آ رہا ہے۔ وہ چکر تھا ہی کچھ عجیب۔ نیلو..........“ وہ نیلوفر کی طرف مڑا۔ ”تم ذرا دسمبر ۴۸ء کی فائلیں مجھے نکال کر دو۔ اس عرصے میں ویانا میں اغوا کی ایک اسٹوری چھپی تھی لیکن معاملہ تھا چکر دار۔ ایک ہندوستانی..........“

”مجھے بھی کچھ کچھ یاد آتا ہے۔“ عمر نے چیخ کر کہا۔ حالانکہ اسے یاد آ ہی نہیں سکتا تھا۔ ”نیلوفر.......... جلدی سے فائل نکالو۔“

نیلوفر نے فائل نکال کر دی۔ عمر اور ڈیڈ فائل پر جھک گئے۔ ”یہ رہی وہ خبر۔“ ڈیڈ نے فاتحانہ لہجے میں کہا۔ ”خبر امریکی ملٹری پولیس نے جاری کی تھی۔ ایک شخص اپنے متعاقبین سے بچ کر ویانا کے امریکی سیکٹر میں گھس آیا تھا۔ تعاقب کرنے والے چار افراد تھے اور وہ ایک بڑی گاڑی میں سوار تھے۔ ان کا سامنا امریکی گشتی دستے سے ہو گیا۔ فائرنگ کا تبادلہ ہوا۔ تعاقب کرنے والوں میں سے ایک زخمی ہو گیا‘ تین فرار ہو گئے۔ اس عرصے میں وہ شخص غائب ہو گیا جس کی وجہ سے وہ سب کچھ ہوا تھا۔ بعد میں اسپتال میں زخمی نے اعتراف کیا کہ اس کا تعلق ہنگری کی سیکرٹ پولیس سے ہے۔ اس نے یہ انکشاف بھی کیا کہ وہ جس شخص کو گرفتار کرنا چاہ رہے تھے‘ وہ ہندوستانی تھا۔ اس پر امریکیوں کو حیرت بھی ہوئی کیونکہ وہ اس شخص کو مشرقی یورپ کے کسی ملک کا باشندہ سمجھے تھے..........“

”یہ سو فیصد وہی سیکریٹری ہو گا۔“ عمر نے چیخ کر کہا۔ ”وہ ہنگری میں پناہ لینے آیا ہو گا لیکن خواجہ کا اثر و رسوخ زیادہ تھا چنانچہ وہ وہاں سے بھاگا ہو گا تو آسٹریا ہی اسے قریب لگا ہو گا۔ وہ کشمیری ہے۔ سرخ و سپید۔ یہ تاثر دینا اس کے لئے دشوار نہیں ہو گا کہ وہ ہنگری کا رہنے والا ہے یا مشرقی یورپی ہے۔ بہرحال اس کا مطلب ہے کہ وہ زندہ ہے اور بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔“

”لیکن اب اس کی عمر کیا ہو گی؟“ تسکین نے سوال اٹھایا۔

عمر گڑبڑا گیا۔ ”ستر اور اسی کے درمیان ہو گی..........“

”تو ممکن ہے‘ وہ مرچکا ہو۔“ تسکین بولی۔

”ہمیں اس کی زندگی کی امید رکھنی ہے۔“ عمر نے تند لہجے میں کہا۔ ”لیکن یہ

ضروری نہیں کہ وہ ویانا ہی میں ٹکا رہا ہو۔ سوال یہ ہے کہ وہ کہاں گیا ہو گا۔"

حیرت انگیز طور پر اس سوال کا جواب تسکین نے دیا۔ "وہ پیرس آ گیا ہو گا۔"

وہ حیرت سے اسے گھورتے رہے۔ عمر نے پوچھا۔ "کیا یہ تمہارے وجدان کا جواب ہے؟"

تسکین چند لمحے سوچتی رہی۔ "جزوی طور پر۔ منطقی اعتبار سے بھی یہی بات سمجھ میں آتی ہے۔" اس نے کہا "وہ پیرس کے سوا کہاں محفوظ رہ سکتا تھا۔ ویانا سے وہ سالزبرگ گیا ہوگا۔ وہاں سے وہ سوئٹزرلینڈ گیا ہو گا۔ وہاں اسے کوئی کام نہیں مل سکتا تھا۔ اب نقشہ دیکھو.........." تسکین نے دیواری نقشے کی طرف اشارہ کیا۔ "سوئٹزرلینڈ جانے کے بجائے اس کے لئے آسٹرین سرحد پار کر کے جرمنی میں داخل ہونا اور پھر وہاں سے فرانس میں گھسنا زیادہ دشوار نہیں تھا۔ ان دنوں پورے یورپ میں فرانس کی سرحد طویل ترین اور غیر محفوظ تھی۔ کوئی بھی سرحد پار کر کے یہاں گھس آتا تھا۔ تاریخ ہمیں یہی بتاتی ہے۔ یہاں روزگار بھی تھا اور کوئی کسی کے بارے میں تجسّس بھی نہیں کرتا تھا۔ وہ کیہل اور کارلسرو کے درمیان کہیں بھی دریائے رائن عبور کر سکتا تھا۔ وہاں دریا اتنا تنگ ہے کہ کوئی فرد بھی بغیر کسی دشواری کے تنہا اسے عبور کر سکتا ہے۔ وہاں سے وہ اسٹراس برگ پہنچا ہو گا اور اس کے بعد بس اسے پیرس کے لئے ٹرین پکڑنا تھی.........."

"ٹرین میں ان دنوں فرانسیسی پولیس سخت چیکنگ کرتی تھی۔ جن کے پاس پاسپورٹ، ویزا یا کسی طرح کے کاغذات نہ ہوں، انہیں دھر لیا جاتا تھا۔ بس پھر سیکریٹری ٹرین کے واش روم میں پکڑا گیا ہو گا۔" ڈیڈ نے کہا۔

"مذاق اڑا رہے ہو ڈیڈ؟" عمر نے پوچھا۔

"نہیں۔ میرا خیال ہے، تسکین نے مسئلہ حل کر دیا ہے۔" ڈیڈ بولا۔ "میں پیرس ہی میں تھا ان دنوں مجھے لی مونڈ میں چھپنے والی وہ اسٹوری یاد ہے۔ یہ ۴۸ء کی بات ہے اور وہ شخص پولیس سے بچ کر بھاگ گیا تھا۔"

۴۸ء کی فائلیں نکال لی گئیں۔ عمر، تسکین اور ڈیڈ انہیں چیک کرنے میں مصروف ہو گئے۔ اچانک ڈیڈ نے نعرہ لگایا۔ "یہ رہا.......... تین دسمبر ۴۸ء۔ لو پڑھ لو۔"

تسکین نے بہ آواز بلند خبر پڑھی۔ "کل اسٹراس برگ ایکسپریس سے ایک پناہ

گزین کو گرفتار کیا گیا جو غیر قانونی طور پر فرانس میں داخل ہوا تھا لیکن پناہ گزین افراتفری سے فائدہ اٹھا کر فرار ہو گیا۔ اس نے ٹائلٹ جانے کی خواہش ظاہر کی تھی جس پر اس کی ہتھکڑی کھول دی گئی۔ وہ ٹائلٹ سے واپس آیا۔ اس کے ساتھ ایک پولیس مین تھا۔ اسی وقت ان کے درمیان سے ریفریشمنٹ کی ہاتھ گاڑی گزری۔ قیدی نے بڑی پھرتی سے گاڑی کو الٹ دیا جس پر کافی اور شراب تھی۔ گاڑی الٹتے ہی افراتفری پھیل گئی۔ شراب کی وجہ سے کافی گرم کرنے والا ہیٹر بھڑک اٹھا۔ سب آگ بجھانے میں لگ گئے۔ اس صورت حال سے فائدہ اٹھا کر قیدی فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا.........."

"اور آج تک نہیں پکڑا گیا۔" عمر نے چیخ کر کہا۔

"ہاں۔ اور اب ہمیں اسے تلاش کرنا ہے۔" ڈیڈ بولا۔

"لیکن کیا ضروری ہے کہ یہ وہی ہو۔" نیلوفر نے اعتراض کیا۔

"یہ وہی ہے۔" تسکین نے کہا۔ "تم لوگوں نے پوری خبر نہیں سنی۔ پولیس کے مطابق قیدی نے بے ساختہ ایک ایسی زبان میں پورا جملہ بولا تھا جو کوئی بھی نہیں جانتا تھا۔ پولیس کا کہنا ہے کہ ان کے خیال میں وہ کوئی ایشیائی تھا۔ بعد میں اس نے مشرقی یورپ کے لہجے میں انگریزی بولنے کی کوشش کی تھی لیکن انہیں یقین ہے کہ وہ مشرقی یورپ کا نہیں تھا۔"

"تب تو میں اسے تلاش کروں گی۔" نیلوفر نے کہا۔

"یہ کام سب مل کر کریں گے۔ تم پہلے گھر جا کر مناسب نیند لو گی۔" عمر نے کہا۔ پھر اس نے کلاک کو دیکھا۔ صبح کے ۷ بجنے والے تھے۔ "تمام اسٹاف کو طلب کر لو تسکین، اور اس شخص کی تلاش پر لگا دو۔" اس نے اپنی بیوی سے کہا۔ "وہ یہاں سے کہیں نہیں جا سکتا۔ یہ محفوظ ترین مقام ہے۔ وہ کہیں نہ کہیں سوتا ہو گا، کوئی کام ٹک کر نہیں کر سکتا ہو گا کیونکہ اس کے پاس کاغذات نہیں ہوں گے۔ اوسط قدوقامت کا معمولی سا غیر اہم آدمی۔ اب شاید وہ فرانسیسی بولتا ہو گا.......... لیکن غیر ملکیوں کے لہجے میں۔ پولیس سے گھبراتا ہو گا۔ کسی پسماندہ علاقے میں رہتا ہو گا۔ یہ امکان بھی ہے کہ وہ کوئی ایسا کام کرتا ہو گا جس میں کوئی اس سے کاغذات طلب نہ کرے۔ مثلاً کسی ریس کورس میں یا نائٹ کلب میں اور شاید وہ خود کو ہنگرین کہتا ہو۔ اور ہاں، اس کی تلاش میں پولیس

سے مدد نہیں لی جا سکتی۔ یہ کام ہمیں خود کرنا ہے۔ وہ پولیس کو دیکھے گا تو بھڑک جائے گا۔
سب کو بلاؤ اور سمجھا دو۔" اب عمر' تسکین سے مخاطب تھا۔ "انہیں کہہ دینا کہ اسے
تندہی سے تلاش کریں۔ ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔ ہمیں نہیں معلوم کہ تیمور کب
تک بھارتیوں کے ظلم و ستم جھیل سکے گا۔ یہ سب لوگ بڑے جری اور توپ قسم کے
رپورٹر بنتے تھے۔ اب انہیں تین چار دن میں اس شخص کو تلاش کرنا ہے۔" پھر وہ نیلوفر
کی طرف مڑا۔ "اور تم میری بہن گھر جاؤ۔ آج کی چھٹی۔ آرام کرو اور تازہ دم ہو جاؤ۔
پھر میں تمہیں کام میں لگا دوں گا اور تم جو یہ سمجھتی ہو کہ وہ دیو تمہاری وجہ سے اس
مصیبت میں پھنسا ہے تو یہ غلط ہے۔ جو کچھ ہوا ہے' میری وجہ سے ہوا ہے۔
چلو.........اب بھاگ لو۔"

☆============☆============☆

اپنی گرفتاری سے پہلے تیمور سوچتا تھا کہ عدالت میں اعتراف جرم کے لئے تیاری
کے مرحلے سے گزرنے کے بعد ایک وقت ایسا ضرور آتا ہو گا کہ بے قصور شخص تنہائی
میں بالآخر اپنے حواسوں میں واپس آتا ہو گا اور سمجھتا ہو گا کہ اسے اعتراف کے راستے
پر زبردستی لایا گیا ہے۔ ایسے میں اس کی مزاحمت دوبارہ تعمیر ہو جاتی ہو گی۔

وہ انسان کو معقول مخلوق سمجھتا تھا۔ اسی لئے اس کا خیال تھا کہ اپنی عقل' حوصلے
اور زبان پر آدمی کا اختیار کبھی ختم نہیں ہوتا۔ یہ الگ بات کہ کسی وجہ سے وہ پاگل ہو
جائے۔ وہ یہ تسلیم کر سکتا تھا کہ سائنٹیفک انداز میں کیا جانے والا تشدد ہڈیوں اور گوشت
کے ریشوں اور پٹھوں کو تباہ کر کے اسے ایسے جرائم کے اعتراف پر مجبور کر سکتا ہے جو اس
سے سرزد نہ ہوئے ہوں لیکن اسے یقین تھا کہ اس کے دماغ اور قوت ارادی کو نفسیاتی
حملے سے زیر نہیں کیا جا سکتا۔ اسے یقین تھا کہ اعتراف کے سلسلے میں دو میں سے ایک
بات ضرور ہے۔ یا وہ لوگ جو' اب تک کشمیر میں پکڑے گئے اور جنہوں نے ہنسی خوشی
اعتراف جرم کر لیا' ذہنی طور پر اس کے مقابلے میں کمزور تھے یا پھر دشمنوں نے نشان نہ
چھوڑنے والے تشدد کے نئے طریقے وضع کر لئے ہوں گے۔ درحقیقت وہ دونوں باتیں
ہی غلط تھیں لیکن تیمور کو اس کا علم اس وقت ہوا جب بہت دیر ہو چکی تھی۔ اس وقت
تک وہ خود شکار ہو چکا تھا۔ اس کی خود ستائی' اپنے اچھے ہونے کا احساس اسے بہت دور کی
چیز لگتا تھا بلکہ وہ اسے مسترد کر چکا تھا کیونکہ وہ اس کی سوچ کے نئے انداز' اس کے نئے
جذبوں اور خواہشوں سے متصادم تھا۔ اس کی شخصیت دھیرے دھیرے لیکن مسلسل
تبدیل ہو رہی تھی۔

اس کی پہلی غلطی تو یہ سمجھنا تھی کہ وہ بے وقوف بیوروکریٹس یا بے رحم تشدد

کاروں کے ہاتھ میں ہے۔ اس کا خیال تھا کہ ان کے سامنے ایک حوصلہ مند اور پُر اعتماد شخص کامیاب رہے گا' جسے اپنے نظریات پر کامل یقین ہو۔ جو اپنے موقف پر ڈٹ سکتا ہو لیکن درحقیقت اس کا واسطہ چالاک اور اہل ڈاکٹروں اور نفسیات دانوں کی ایک ماہر فن ٹیم سے پڑا تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جنہیں بیمار ذہنوں کو شفا دینے کی تربیت ملی تھی مگر اب وہ اپنی اس تربیت کو الٹ کر استعمال کر رہے تھے.......... فاشسٹوں کے انداز میں۔ اور وہ یہ کام اپنے دیش کی خاطر کر رہے تھے۔ اب وہ صحت مند ذہنوں کو بیماری کی طرف لے جاتے تھے۔

تیمور جس عمل سے گزر رہا تھا.......... بلکہ گزارا جا رہا تھا' اس کا کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ کلاک کی ٹک ٹک' وقت کا گزرنا' جسمانی بے آرامی' فطری تقاضوں کی پکار' بھوک' پوچھ گچھ کے لئے آنا جانا' بدبوئیں' آوازیں' درجہ حرارت کی کمی بیشی' دھوپ سے محرومی اور پرائیویسی کا نہ ہونا۔ یہ سب عام باتیں ہیں۔ کون تصور کر سکتا ہے کہ یہ سب کچھ تشدد میں بھی ڈھل سکتا ہے لیکن یہ سب کچھ مل کر منطقی طرزِ فکر کے عمل میں رخنے پیدا کر رہا تھا۔ کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ آدمی کتنی جلدی ہر آواز' ہر بلاوے کی صورت حال میں معمولی سی تبدیلی کی یا کسی بھی عام سے واقعے کی تشریح و توضیح کرنے کا عادی ہو جاتا ہے۔ کاریڈور میں کوٹھری کی طرف بڑھتے ہوئے قدموں کی چاپ بتاتی کہ کوئی اس کی رہائی کے احکامات لے کر آ رہا ہے! چاپ پیچھے ہی رک جاتی یا آنے والا کوٹھری کے سامنے سے رکے بغیر گزر جاتا تو مایوسی ہوتی لیکن زیادہ نہیں۔ وہ پھر امید کی ڈور تھام کر بیٹھ جاتا۔

پہلے دن کے بعد مسلسل اور پیچیدہ سرگرمیوں کا اسے اندازہ ہی نہیں ہوا۔ پوچھ گچھ' تصویریں کھنچنا۔ پھر اس کے فنگر پرنٹس لئے گئے۔ اسے پوچھ گچھ کے نام پر ایک بلڈنگ سے دوسری اور دوسری سے تیسری بلڈنگ میں لے جایا جاتا رہا۔ وہ سب ایک جیسی عمارتیں تھیں.......... نیچی چھتوں والی۔ کبھی وہ کسی پولیس افسر کے پاس جاتا تو کبھی کسی ڈاکٹر کے پاس اور پھر کبھی قید تنہائی۔

وہ نہیں جانتا تھا کہ اسے بہت قریب سے دیکھا جاتا رہا ہے۔ اس کے علاوہ بار بار اس کا معائنہ ہوا ہے۔ ان تمام باتوں کی روشنی میں ڈاکٹروں اور نفسیات دانوں نے اس

کے لئے ایک طریقہ علاج کا تعین کر لیا ہے۔ ان کے نزدیک وہ ایک مریض تھا۔ انہوں نے اس کے لیے چارٹ بنا کر دیواروں پر آویزاں کر لیے تھے۔ اب تربیت یافتہ افراد کی ٹیم مجوزہ تراکیب پر عمل کر رہی تھی۔

اس کی گرفتاری کو دو ہفتے سے زائد ہو چکے تھے۔ ایک دن چار گارڈ اس کی کوٹھری میں آئے اور انہوں نے اسے کپڑے اتارنے کا حکم دیا۔ تیمور کا پہلا رد عمل ارادہ مزاحمت تھا۔ وہ اتنی ذلیل بات بغیر ہچکچائے کیسے مان لیتا لیکن اس نے خود پر قابو پا لیا۔ ایک تو وہ کوٹھری اتنی بڑی نہیں تھی کہ وہاں لڑائی کی جاتی' دوسرے وہ چار تھے۔ کچھ دیر بعد سہی مگر بالآخر وہ اسے زیر کر لیتے۔ پھر وہ ان کے حربوں کے بارے میں جاننا چاہتا تھا۔ لہٰذا اسے آخری حد تک تحمل سے کام لینا تھا۔ اس نے سوچا' غیر ضروری طور پر خود کو کیوں ہلکان کیا جائے جبکہ یہ لوگ اپنا مقصد ہر حال میں حاصل کر لیں گے۔ وہ اس بات سے واقف نہیں تھا کہ اگر اس طرح کی اشتعال انگیز صورت حال میں آدمی لڑے بغیر ہتھیار ڈال دے' خواہ اس نے مصلحتاً ایسا کیا ہو تو اس کا ذہن دوسروں کے فیصلے اور ترغیبات بغیر کسی مزاحمت کے تسلیم کر لینے کا خوگر ہو جاتا ہے۔

اس نے خاموشی سے کپڑے اتار دیے۔ وہ کپڑے ایک گارڈ نے لے لئے۔ پھر کوٹھری کا دروازہ کھولا گیا۔ وہ اسے برہنہ مارچ کراتے باہر لائے۔ راہداریوں سے گزرتے ہوئے اسے بہت سے لوگ آتے جاتے دکھائی دیئے۔ ان میں سے کسی نے اسے پلٹ کر دوبارہ نہیں دیکھا۔ جیسے اس کی برہنگی ان کے لئے معمول کی بات ہو۔ وہ کئی دفاتر کے کھلے دروازوں کے سامنے سے گزرا جہاں سیکریٹریاں اپنے دفتری کاموں میں مصروف تھیں مگر کسی نے اس کی طرف توجہ نہیں دی۔

بالآخر وہ ایک دفتر میں پہنچا جہاں چار افراد سویلین لباس پہنے اس کے منتظر تھے۔ وہ تفتیش کار تھے۔

وہ ایک بہت بڑی میز کی چاروں سائیڈوں پر بیٹھے تھے۔ ان میں سے ہر ایک کے سامنے کچھ کاغذات رکھے تھے۔ وہاں کوئی فاضل کرسی نہیں تھی جس پر تیمور بیٹھتا۔ چاروں تفتیش کاروں کا لیڈر وہی شخص تھا جس سے تیمور ایک بار پہلے بھی مل چکا تھا.......... کارٹوس جیسے سر اور میلے' بھدے دانتوں والا آتما رام۔

آتما رام نے کہا۔ "اوہ مسٹر تیمور، تم آ گئے۔ اچھا.......... وہ سامنے والی دیوار سے ٹک کر کھڑے ہو جاؤ تاکہ ہم تمہیں دیکھ سکیں اور برائے مہربانی ہمارے سوالوں کے جواب بغیر کسی تاخیر کے اور پوری سچائی سے دینا۔" اتنا کہہ کر اس نے تیمور کی برہنگی کو غور سے دیکھا اور مسکرا دیا۔ دوسروں نے بھی اسے دیکھا اور ہنسنے لگے۔ ان میں سے ایک نے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے اپنی زبان میں کوئی تبصرہ کیا۔ اس کے نتیجے میں ان چاروں کی ہنسی اور تند ہو گئی۔

"ہاں مسٹر تیمور، اب ہم شروع کرتے ہیں۔" آتما رام بولا۔ "یہ بتاؤ، کشمیر میں گھس کر جاسوسی اور تخریب کاری کی ترغیب تمہیں کس نے دی تھی؟"

تیمور کو شرم بھی آ رہی تھی اور غصہ بھی۔ اس کے ساتھ جو سلوک کیا گیا تھا اس نے اس کی انا کو گھائل کر دیا تھا۔ اس پر ستم یہ کہ یہ لوگ اسے مضحکہ اڑانے والی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ اس کا مذاق اڑا رہے تھے۔ ان کا انداز ایسا تھا جیسے وہ انسان نہیں کوئی جانور ہو۔ چنانچہ وہ غصے میں آپے سے باہر ہو گیا۔ اس کے حلق سے غیر انسانی سی چیخ نکلی اور اس کے ساتھ ہی مغلظات کا فوارہ سا ابل پڑا۔ وہ چیخ رہا تھا کہ اس کے کپڑے اسے دیے جائیں۔ اس نے انہیں ہر وہ گالی دی جو اس کی یادداشت میں محفوظ تھی۔ وہ اس وقت تک ان پر چیختا رہا جب تک اس کی آواز جواب نہ دے گئی پھر بے بسی کے آنسوؤں نے اس کی آنکھوں کو بھر دیا۔ سب کچھ ہوا لیکن اس نے ان پر حملہ نہیں کیا۔ انہیں جسمانی طور پر زیر کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اس لئے کہ اپنی برہنگی کے نتیجے میں ابھرنے والی شرم اور خوف پر وہ قابو نہیں پا سکا تھا۔

"یہ بچپنا چھوڑو مسٹر تیمور۔ یہ تم پر زیب نہیں دیتا۔ تم خاموشی سے ہمارے سوال سنو اور تحمل سے جواب دو۔" آتما رام نے اسے چمکارتے ہوئے کہا۔ "بغیر کپڑوں کے ایک عاقل و بالغ آدمی مجھے اتنا عجیب نہیں لگتا جتنا ایک ایسا شخص جو غصے میں سب کچھ بھول جائے.......... آپے سے باہر ہو جائے۔ تمہارا رویہ بچوں کا سا ہے۔ تم یہ نہیں سوچتے کہ اگر ہم تم پر ہنستے ہیں تو اس میں بھی قصور تمہارا ہی ہے۔ اگر تم ہم سے تعاون کرو تو ہم تمہارے کپڑے واپس دینے کے سلسلے میں سنجیدگی سے غور کریں گے۔"

کافی دیر بعد وہ دوبارہ کوٹھری میں پہنچا دیا گیا۔ وہ اب بھی ننگا تھا اور اس کے ذہن

میں خیالوں کا ہجوم تھا۔ اس کا برہنہ جسم خنکی کی وجہ سے ٹھٹھر رہا تھا۔ اندر ہی اندر وہ کھول رہا تھا۔ اسے اپنی بے بسی، شرم اور شرمندگی یاد آ رہی تھی اور وہ انتقام کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ پھر اس نے اچانک خود کو بڑی شدت سے ایک بات سوچتے پایا.......... میں انہیں ایسا کون سا سچ بتا سکتا ہوں جو سچ بھی ہو اور یہ لوگ اسے تعاون بھی تصور کریں تاکہ مجھے میرے کپڑے واپس مل جائیں۔ پورے کپڑے نہ سہی، انڈر ویئر تو مل جائے۔ میں کم از کم خود کو پھر سے انسان تو سمجھنے لگوں۔

اب سے پہلے پوچھ گچھ اتنی دشوار نہیں تھی۔ وہ سامنے بیٹھ کر سوالوں کے جواب دیتا۔ آتما رام ہمیشہ موجود ہوتا۔ کبھی اس کے ساتھ اور لوگ بھی ہوتے۔ وہ بار بار اس سے اس کی کہانی سنتے، اس امید پر کہ شاید اس کے بیان میں کبھی کوئی تضاد مل جائے گا۔ وہ ہر بار انہیں زور و شور سے بتاتا کہ وہ جاسوس نہیں، اخباری رپورٹر ہے مگر وہ اس سے یہی پوچھتے رہتے کہ اسے کشمیر میں جاسوسی اور تخریب کاری کے لئے کس نے بھیجا ہے۔ وہ انہیں ہر بار بتاتا کہ وہ اخباری رپورٹر ہے اور "کشمیر میں کشمیریوں کی زندگی" کے موضوع پر مضامین کی ایک سیریز کے لئے مواد اکٹھا کرنے کی غرض سے کشمیر آیا ہے۔

یہ اعتراف کرنے پر وہ مجبور تھا کیونکہ اسے اپنے اس مؤقف پر ڈٹے رہنا تھا کہ وہ ایک اخبار نویس ہے لیکن کبھی کبھی اسے احساس ہوتا کہ اس کی ہر بات بے اثر ہے اور بے نتیجہ ثابت ہو رہی ہے۔ البتہ کبھی کبھی آتما رام اچھے موڈ میں بھی ہوتا تھا۔ ایسے میں ایک بار تیمور نے اس سے پوچھا۔ "سنو آتما رام جی۔ تمہارے اخباری نمائندے بھی تو دوسرے ملکوں میں ہوں گے؟ ہے نا.......... شاید پاکستان میں بھی ہوں گے۔"

"ہاں ہیں۔" آتما رام نے جواب دیا۔

"تو تم انہیں جاسوس تو نہیں کہو گے؟"

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ان کی ایک قانونی حیثیت ہے۔ ویسے بھی ہم امن پسند لوگوں کو جاسوس بھرتی کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔" آتما رام نے کہا۔

"تو آپ تسلیم کرتے ہیں کہ غیر ممالک میں اخبار نویس جائز کام کرتے ہیں اور وہ جاسوس نہیں ہوتے؟"

"بھارتی اخبار نویسوں کے معاملے میں یہ بات سو فی صد درست ہے۔"

"تو میرے معاملے میں درست کیوں نہیں ہو سکتی؟" تیمور نے فاتحانہ انداز میں پوچھا۔

آتمارام مسکرایا۔ اس کا انداز غیر دوستانہ نہیں تھا۔ پھر اس نے گفتگو کا رخ بدلا اور تیمور سے اس کے شارٹ سروس کمیشن کے حوالے سے فوجی بیک گراؤنڈ کے بارے میں پوچھنے لگا۔

بعد کی پوچھ گچھ سے ثابت ہو گیا کہ تیمور کی بات آتمارام پر کوئی تاثر نہیں چھوڑ سکی تھی اور جب تیمور نے یاد دلایا تو آتمارام نے کہا "مسٹر تیمور' میری درخواست ہے کہ احمقانہ گفتگو سے پرہیز کریں۔ وہ جو آپ نے موازنہ کیا تھا' میں نے تو اسے مذاق سمجھا تھا۔ ہمارے رپورٹرز کو ویزے دیئے جاتے ہیں۔ انہیں مغربی دنیا میں بلکہ دنیا بھر میں پسند کیا جاتا ہے۔ انہیں آزادانہ طور پر کام کرنے' معلومات اکٹھی کرنے کے مواقع فراہم کئے جاتے ہیں اور وہ اپنے کام کے دوران میزبان ملکوں کے قوانین نہیں توڑتے۔ تمہارا معاملہ مختلف ہے۔ ہم نے تمہیں نہ بلایا' نہ یہاں آنے کی اجازت دی۔ تم یہاں باضابطہ طور پر نہیں آئے بلکہ قانون شکن ہو۔ تمہاری یہاں موجودگی ہی غیر قانونی ہے۔ تم یہاں میرے سامنے پاکستانی جاسوس اور تخریب کار کی حیثیت سے بیٹھے ہو' کسی اخبار نویس کی حیثیت سے نہیں۔ اب تم جتنی جلدی ہمیں یہ تفصیل فراہم کر دو گے کہ تمہیں کس نے بھیجا ہے اور یہاں تمہارا مشن کیا تھا' اتنا ہی بہتر ہو گا اور اتنا ہی جلدی ہم اس معاملے کو نمٹا سکیں گے۔ یہ معاملہ خوش اسلوبی سے انجام کو پہنچ جائے' اسی میں سب کی بہتری ہے۔ تمہاری بھی اور میری بھی۔"

"کیسا انجام؟ تمہارے خیال میں انجام کیا ہو گا اس معاملے کا؟" تیمور نے پوچھا۔

آتما رام پھر اپنے مخصوص انداز میں مسکرایا "دیکھو مسٹر تیمور' ہم دونوں ہی جہاندیدہ آدمی ہیں اور ایک دوسرے کو سمجھتے ہیں۔ تم جانتے ہو کہ انٹیلی جنس والوں کو ایک غلطی کی...... دشمن کے ہاتھوں گرفتار ہونے کی کیا قیمت ادا کرنا پڑتی ہے۔ انجام یہ ہے کہ تم پر مقدمہ چلایا جائے گا' جرم ثابت ہو گا اور تمہیں پھانسی پر لٹکا دیا جائے گا۔ اگر تم تعاون کرو تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ تم آسانی سے بغیر زیادہ تکلیف اٹھائے اپنے انجام کو پہنچ جاؤ گے۔ ہٹ دھرمی کا انجام تمہارے لئے تکلیف دہ ہو گا۔ دیکھو' جب تم بھارتیوں

اور کشمیریوں کے خلاف اس مشن پر آئے تھے' تمہیں اس وقت بھی معلوم تھا کہ ناکامی کی صورت میں تمہارا یہی انجام ہو گا۔"

تیمور کو اپنے پیٹ پر گرہیں سی پڑتی محسوس ہوئیں۔ وجہ یہ تھی کہ آتمارام کے لہجے میں سچائی تھی۔ وہ جو کچھ کہہ رہا تھا' اس پر اسے مکمل یقین تھا۔ تیمور نے کہا "چلو فرض کر لو کہ میں جاسوس ہوں۔ تب بھی مجھے پھانسی کی سزا نہیں ملنی چاہئے۔ زمانہ امن میں پکڑے جانے والے جاسوسوں کے لئے سزائے موت کی روایت نہیں۔"

"ہمارے ہاں یہی روایت ہے" آتما رام نے سرد لہجے میں کہا "ہمارے اپنے قوانین ہیں اور ان کے مطابق یہ سنگین ترین جرم ہے۔ تم نے غیر قانونی طور پر یہاں داخل ہونے کے ساتھ کئی قوانین توڑے ہیں۔ تم جس انداز میں گرفتار ہوئے ہو' وہی ایک ثبوت ہے۔ ہمیں صرف یہ ثابت کرنا ہے کہ تم نے جاسوسی کے ہمارے نئے قوانین کو توڑا ہے۔"

"آتما رام' یہ تو سو بار مر کے زندہ ہو جاؤ' تو بھی ثابت نہیں کر سکو گے۔ تم کیا سمجھتے ہو کہ ملزموں کے کٹہرے میں کھڑا ہو کر میں اس جرم کا اعتراف کر لوں گا جو مجھ سے سرزد نہیں ہوا ہے۔ میں جو کچھ تمہیں بتا چکا ہوں' وہ لفظ بہ لفظ سچ ہے اور میری زبان سے اس کے سوا تم کچھ نہیں نکلوا سکو گے۔"

"ممکن ہے' ایسا ہی ہو" آتما رام نے کہا۔ وہ بہت موٹی کھال کا آدمی تھا۔ اس پر کسی توہین کا اثر نہیں ہوتا تھا "بہر کیف ہم تو کوشش کریں گے کہ تم سچ اگل دو' ہمیں تمہاری بہتری عزیز ہے۔ بس مسٹر تیمور' آج کے لئے اتنا کافی ہے۔"

اس کے بعد وہ واقعہ پیش آیا تھا جس میں تیمور کو لباس سے محروم کر دیا گیا تھا اور اس کے بعد پوچھ گچھ کے انداز اور طور طریقوں میں بتدریج ایک دھیمی تبدیلی رونما ہوئی تھی۔ سوالات اب بھی وہی تھے مگر اب اسے جسمانی بے آرامی کا سامنا بھی کرنا پڑ رہا تھا۔ ذلت اور عزت نفس پر وار مستزاد تھے۔

اسے ایک ایسی کوٹھری میں پہنچا دیا گیا جہاں پلنگ بھی نہیں تھا۔ چاروں کونوں میں بہت طاقتور اسپاٹ لائٹس نصب تھیں۔ چیختی چنگھاڑتی روشنی بند پپوٹوں میں [illegible] کرتی اور آنکھوں کو جلاتی محسوس ہوتی۔ آنکھوں کے ڈھیلوں میں نیزے اترتے محسوس

ہوتے۔ رات ہو یا دن، وہ سپاٹ لائٹس کبھی نہ بجھتیں۔ اس روشنی سے فرار ناممکن تھا۔ وہ فرش پر پیٹ کے بل لیٹ کر آنکھوں کو دونوں کہنیوں سے ڈھانپ کر بمشکل چند منٹ سو پاتا مگر پہلو بدلتے ہی وہ خوفناک روشنی اپنے نیزے اچھالنے لگتی اور اس کی آنکھ کھل جاتی۔

کبھی اسے لگتا کہ اس بے رحم روشنی کا سامنا کرتے اسے کئی دن ہو چکے ہیں اور کبھی اس سے مسلسل، بغیر کسی وقفے کے اٹھارہ بیس گھنٹے پوچھ گچھ کی جاتی۔ اس دوران اسے بیٹھنے کا موقع بھی نہیں دیا جاتا بلکہ اسے تن کھڑا رہنے پر مجبور کیا جاتا۔ اس کے دونوں ہاتھ سر کے پیچھے رکھوائے جاتے۔ کبھی اسے پنجوں کے بل کھڑا رہنے کو کہا جاتا۔

ایک عنایت کی گئی۔ بالآخر اسے پہننے کے لئے ایک پاجامہ دے دیا گیا۔ اسے برہنگی سے تو نجات مل گئی لیکن ایک اور بے عزتی اس پر تھوپ دی گئی۔ اب وہ لیٹرین جانے کو کہتا تو اسے اجازت نہ دی جاتی۔ یہ دھمکی بھی دی گئی کہ اگر وہ ایک سیکنڈ کے لئے بھی خود کو پاجامے سے آزاد کرے گا تو پاجامہ اس سے چھین لیا جائے گا۔ کچھ ہی دنوں میں وہ پاجامہ اس قدر متعفن ہو گیا کہ کبھی کبھی اسے لگتا کہ اس سے تو برہنگی ہی بہتر تھی۔ تاہم اس کی پاجامہ اتارنے کی کبھی ہمت نہیں ہوئی۔ اسے احساس تھا کہ وہ اسے غلیظ جانور بنائے دے رہے ہیں۔

تیمور جسمانی تکالیف اور تھکن کا تو مقابلہ کر سکتا تھا اس لئے کہ وہ جان دار آدمی تھا اور اپنی قوت پر یقین بھی رکھتا تھا لیکن مسلسل بدترین توہین و تذلیل اور عزت نفس سے محرومی نے اسے کمزور کر دیا تھا۔ اس کا ذہن الجھا ہوا رہتا اور بدن پر لرزہ طاری رہتا۔ اور اس کے پاس لڑنے کے لئے ہتھیار نہیں تھے......... نہ جسمانی، نہ ذہنی اور نہ روحانی۔ وہ کسی بھی نوعیت کی جنگ نہیں لڑ سکتا تھا۔ مخالفین نے اس کے دفاعی حصار میں ان گنت شگاف ڈال دیئے تھے۔

ابھی تک اس کے ساتھ مار پیٹ نہیں کی گئی تھی۔ نہ ہی اس پر کسی قسم کا تشدد کیا گیا تھا لیکن اسے یہ باور کرا دیا گیا تھا کہ اگر اس نے فرار ہونے یا نافرمانی کرنے کی کوشش کی تو اسے موقعے پر ہی شوٹ کر دیا جائے گا۔ تیمور میں زندہ رہنے کی خواہش بہت توانا تھی۔ وہ جب تک سانس، تب تک آس کا قائل تھا لیکن اس صورت حال کے

سات دن بعد اسے آس کی نوعیت کے بارے یقین نہیں رہا۔ اب وہ بس یہ سوچتا تھا کہ بہرحال امید موجود ہے اور اسے زندہ رہنا ہے۔ زندہ رہنے کے لئے اسے محتاط رہنا ہو گا۔

مسلسل دباؤ اب اس پر بری طرح اثر انداز ہو رہا تھا۔ اس کا وجود درد اور دکھن سے عبارت ہو گیا۔ اعصاب بری طرح چٹخنے لگے۔ اسے نسوں اور پٹھوں کے تناؤ کی تکلیف رہنے لگی اور اسے پُرسکون رہنے یا آرام کرنے کا موقع نہیں دیا جاتا تھا۔ اس کی سمجھ میں یہ بات آ گئی تھی کہ کسی کو سونے نہ دینا یا آرام نہ کرنے دینا بدترین تشدد ہے۔

وہ جب بھی عمر، تسکین اور اپنے اخباری ساتھیوں کے بارے میں سوچتا تو وہ سب اسے بہت دور کے غیر واضح لوگ لگتے۔ کبھی کبھی تو اسے لگتا کہ وہ محض اس کے تخیل کی پیداوار ہیں، وہ حقیقی نہیں لگتے تھے۔ وہ ان کے بارے میں کم ہی سوچتا تھا۔ اس لئے کہ اسے دہشت ناک امروز سے ہی فرصت نہیں ملتی تھی۔ جیل کا متعفن ماحول، خوف ناک قسم کی پوچھ گچھ، نامناسب غذا، گندا پانی اور یہ احساس کہ اس کے اپنے لوگوں نے اسے چھوڑ دیا ہے......... ترک کر دیا ہے اور یہ احساس کہ اس کے صیاد اس کے دوستوں اور ہم وطنوں سے زیادہ طاقت ور ہیں، یہ سب کچھ اتنا جان لیوا تھا کہ سامنے کے مسائل کے سوا کچھ سوچنا ہی دشوار تھا۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ باہر سے اس کے لئے کوئی مدد نہیں آئے گی۔

سب سے بڑھ کر ناقابل برداشت وہ تبدیلیاں تھیں جو ان لوگوں کے رویوں میں اس کے لئے آتی تھیں۔ انتہائی سخت اور ناروا رویے کے بعد اچانک وہ اس پر مہربان ہو جاتے۔ اسے کرسی دی جاتی بیٹھنے کے لئے۔ چائے کی ایک پیالی تھما دی جاتی......... بدمزہ ہی سہی۔ کبھی وہ اسے سگریٹ دے دیتے۔ باتھ روم جا کر ہاتھ منہ دھونے کی اجازت دے دی جاتی اور ایسے موقعوں پر آتما رام جو بہت اچھے موڈ میں ہوتا، کہتا "مسٹر تیمور شاید تمہیں احساس نہیں کہ یہ سب کچھ ہمارے لئے کتنا تکلیف دہ ہے۔ ہم جدید دور کے مہذب لوگ ہیں جو ایک قدیم نسل سے تعلق رکھتے ہیں لیکن تمہاری ضد اور ہٹ دھرمی ہمیں تم پر وہ طریقے آزمانے پر مجبور کر دیتی ہے جو ہمیں ناپسند ہیں۔ ذاتی طور پر ہمیں تم سے کوئی اختلاف نہیں۔ تمہاری اپنی ذمے داریاں ہیں اور ہماری اپنی ہیں۔ یہ الگ بات کہ وہ آپس میں متصادم ہیں اور بنیادی طور پر غلطی تم سے سرزد ہوئی ہے، ہم سے نہیں۔

اب تم اس کھیل میں ہار چکے ہو تو ہار قبول کر لو۔ معاملات کو اور دشوار بنانے کا کیا فائدہ۔"

ان لمحوں میں وہ اسے دکھا دیتے تھے............ اس پر ثابت کر دیتے تھے کہ وہ بھی انسان ہیں............ بلکہ عام حالات میں اچھے انسان ہیں۔ تیمور اکثر اس پر غور کرتا اور پھر سوچتا کہ آخر وہ ان لوگوں کے خلاف کیوں ہے اور خلاف ہونے کا فائدہ بھی کیا ہے جبکہ ترپ کے تمام پتے ان لوگوں کے ہاتھ میں ہیں۔

مسئلہ یہ تھا کہ جسمانی اذیتوں' تھکن اور بے آرامی میں وہ بھول جاتا تھا کہ وہ ان لوگوں کے خلاف کیوں ہے۔ اس کا سبب کوئی آئیڈیل تھا یا کوئی ایسی بات جو وہ یاد کرنا نہیں چاہتا تھا۔ یا اس کا سبب کسی سے کیا گیا کوئی وعدہ ہے۔ کبھی اچانک اس میں اتنا حوصلہ آ جاتا کہ وہ سامنے بیٹھے ہوئے آتما رام سے بحث کرنے لگتا۔ کبھی وہ آپے سے باہر ہو کر اسے گالیاں دینے لگتا اور کبھی ایسا ہوتا کہ وہ بیٹھا احمقوں کی طرح سر ہلاتا رہتا اس کی سمجھ میں ان کے سوال بھی نہ آتے۔

ایسے موقعوں پر ہر بار پوچھ گچھ کا اگلا سیشن پہلے سے زیادہ سخت اور بے رحمانہ ہوتا۔ اس کا دورانیہ بھی زیادہ طویل ہوتا۔ پوچھ گچھ کے دوران کئی بار وہ ڈھیر ہو گیا۔ ہوش و حواس کھو بیٹھا۔ اس پر پانی کی بالٹیاں الٹ دی گئیں۔ اس کو زبردستی کھڑا کر دیا گیا اور جواب دینے پر مجبور کیا گیا۔ یہاں تک کہ وہ دوبارہ بے ہوش ہو گیا۔

پوچھ گچھ بہت چالاکی سے تبدیل کر دی گئی تھی اور اسے پتا بھی نہیں چلا تھا۔ اب وہ اس سے سوال نہیں کرتے تھے بلکہ جوابات اس کے دماغ میں ٹھونستے تھے۔ ایسا ان اوقات میں ہوتا جب اس کا ذہن جواب دے چکا ہوتا۔ مثلاً وہ کہتے یہ طے ہے کہ تم جاسوس ہو۔ ہم جانتے ہیں تم کشمیر کیوں آئے ہو۔ ہم جانتے ہیں کہ تمہیں کس نے بھیجا ہے۔ ہم جانتے ہیں' تم کس کے لئے کام کر رہے ہو۔ تمہارا مشن کیا ہے۔ ہم جانتے ہیں' تمہیں یہاں کس سے رابطہ کرنا تھا۔ تمہارے آقاؤں نے تمہیں چھوڑ دیا ہے۔ اس لئے کہ اب تم ان کے کام کے نہیں رہے۔ انہوں نے جیتے جی تمہیں مردہ سمجھ لیا ہے۔ ہم نے تمہیں حقائق بتا دیئے ہیں۔ وہ مسلسل کہتے رہتے۔ ہم جانتے ہیں ہمیں معلوم ہو گیا ہے۔ تم نے یہ کیا............ تم نے وہ کیا............ تم جاسوس............ تم دہشت گرد............ تم

تخریب کار............ تم سازشی۔

تیمور کے ذہن سے ایک بات نہیں مٹی............ چپکی رہی۔ وہ یہ کہ مکمل اعتراف جرم پر آمادہ کئے بغیر وہ اسے عدالت میں نہیں لے جائیں گے اور یہ کہ اس وقت اس کے جسم پر کوئی نشان نہیں ہو گا۔ تیمور کے اندر قوت حیات بہت تھی۔ اتنی توانا کہ قید کرنے والوں کو بھی اندازہ نہیں تھا۔ نیند سے محرومی اور بے آرامی کے طویل وقفوں میں اکثر وہ سوچتا کہ اسے یہ بے سود جدوجہد ختم کر دینی چاہئے۔ اسے اپنی بے بسی اور لاچاری کا مکمل ادراک تھا۔ لیکن مہربان لمحوں میں' جب وہ آتما رام کے سامنے کرسی پر بیٹھا سگریٹ کے کش لے رہا ہوتا تو اس کے اندر جانے کہاں سے خود اعتمادی ابھر آتی۔ وہ کہتا "آتما رام' تم یہ جنگ ہار جاؤ گے۔ میں گوشت پوست کا بنا ہوا ہوں لیکن مجھ سے اپنی مرضی کی بات کہلوانے کے لئے تمہیں میرے ٹکڑے کرنے پڑیں گے۔ تمہیں میرے ہاتھ پاؤں کاٹ ڈالنے پڑیں گے۔ میرا جبڑا' میرے دانت توڑنے پڑیں گے۔ تمہیں میرے ناخن اکھاڑنے پڑیں گے۔ میرا جوڑ جوڑ الگ کرنا ہو گا۔ تمہیں میری کھال اتارنی پڑے گی۔ تب میں تمہارا ٹھونسا ہوا اعتراف جرم اپنی زبان سے کر لوں گا لیکن اس حال میں تم مجھے عدالت میں پیش نہیں کر سکو گے۔ تمہاری انسانیت نوازی کا پول جو کھل جائے گا دنیا کے سامنے۔ اب تم خود سوچ لو۔ یہ جنگ تمہیں ہارنی ہے۔"

ایسے میں آتما رام اسے بڑی سنجیدگی سے دیکھتا۔ اس کی آنکھوں میں ترحم ہوتا۔ وہ پُر خیال انداز میں کہتا۔ "ہاں............ تم ایسے ہی اذیت پسند لگتے ہو۔ تم مسلمانوں کو شہادت کا شوق بھی تو بہت ہوتا ہے لیکن تم نہیں جانتے کہ ہم غیر انسانی تشدد پر یقین نہیں رکھتے۔ تمہارے ساتھ وہ سب کچھ نہیں کیا جائے گا جو تم نے ابھی بیان کیا۔ ہم نے لوگوں کو قائل کرنے کے لئے ایسے طریقے وضع کئے ہیں کہ جسم پر کوئی نشان نہیں پڑتا۔ میں اس وقت ایسے ہی ایک طریقے کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ ہم اسے آزمانا نہیں چاہتے کیونکہ اس کے نتیجے میں آدمی بہت کمزور ہو جاتا ہے۔ بلکہ آدمی مر بھی سکتا ہے۔ میرا خیال ہے اس موقعے پر تمہیں اس کی ہلکی سی جھلک دکھانا مناسب رہے گا۔"

اس نے ریسیور اٹھا کر تین عددی نمبر ڈائل کیا جو ظاہر ہے' اس عمارت میں کسی جگہ کا ہو گا۔ اس نے اپنی زبان میں ماؤتھ پیس میں کچھ کہا اور پھر ریسیور رکھ دیا۔ چند لمحے

کے بعد چار گارڈ نمودار ہوئے۔ ان کے ساتھ ایک فوجی بھی تھا۔ اس نے آتما رام کو سیلوٹ کیا اور مستفسرانہ نظروں سے تیمور کی طرف دیکھا۔

"ذرا رک جاؤ جانکی داس" آتما رام نے کہا۔ پھر وہ تیمور کی طرف مڑا۔ "مسٹر تیمور، تم اطمینان سے اپنی سگریٹ ختم کرو، پرُسکون رہو کہ اس وقت یہ تمہارے اختیار میں ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ اب سے چند منٹ بعد تمہاری حالت بہت خراب ہو گی۔ مجھے افسوس ہے کہ تم جانکی داس کے ساتھ کمرا نمبر ۲۷ میں جا رہے ہو۔ تم نہیں جانتے کہ کمرا نمبر ۲۷ کیا چیز ہے۔ ابھی میں تمہیں بتاؤں تب بھی تم تعاون کے لئے رضامند نہیں ہو گے۔ سنو، ہمارے پاس تمہارا اعتراف جرم تحریری شکل میں موجود ہے۔ تمہیں بس اس پر دستخط کرنے ہیں اور عدالت میں اسے دہرانا ہے۔"

"جہنم میں جاؤ۔" تیمور نے غرا کر کہا اور آتما رام کو گالی دی "تم سے بن پڑے تو مجھ سے اعتراف جرم ضرور کرا لو۔"

فوجی نے گارڈز کو اشارہ کیا انہوں نے تیمور کو گھیرے میں لے لیا۔ تیمور اس بات کا عادی تھا۔ وہ ان کے درمیان چلنے لگا۔

"گڈ بائی مسٹر تیمور" آتمارام نے کہا "میری بات یاد رکھنا۔ جس وقت کمرا نمبر ۲۷ میں یہ لوگ تم پر کام شروع کریں گے، تم آرزو کرو گے کہ مجھ سے رحم کی بھیک مانگ سکو اور رضاکارانہ طور پر اعتراف جرم کا وعدہ کر سکو۔ تم اس موقعے کو گنوا کر بہت پچھتاؤ گے۔"

تیمور، گارڈز کے ساتھ آتما رام کے کمرے سے نکل آیا۔ وہ راہداری میں بڑھتے رہے۔ آگے انتظامی دفاتر تھے۔ زینے چڑھ کے وہ دوسری منزل پر پہنچے۔ وہاں وہ ایک چھوٹے سے لکڑی کے دروازے کے سامنے رک گئے۔ جس پر ۲۷ نمبر لکھا تھا۔

جانکی داس نے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہوا۔ اس کے پیچھے وہ دونوں گارڈ اندر داخل ہوئے جو تیمور کے آگے چل رہے تھے۔ تیمور ایک لمحے دروازے کی چوکھٹ پر رکا اور اس نے کمرے کا جائزہ لیا۔ اندر اسے جو کچھ نظر آیا اس میں دہشت زدہ کرنے والی کوئی بات نہیں تھی۔ کمرے کے بیچوں بیچ ایک کرسی رکھی تھی۔ کرسی کے ساتھ ہی لوہے کی ایک بڑی بالٹی تھی۔ تیمور اس وقت متجسس ہو رہا تھا۔ وہ بے خوابی اور بے

آرامی کا تشدد جھیل چکا تھا لیکن آتما رام نے چیلنج کیا تھا کہ انہوں نے جسم پر نشان چھوڑے بغیر لوگوں کو قائل کرنے کے طریقے وضع کر لئے ہیں لیکن کمرے میں موجود کرسی اور بالٹی ایسا کوئی تاثر نہیں چھوڑ رہی تھیں کہ وہ آلات تشدد بھی ہو سکتے ہیں۔

لیکن آدھے گھنٹے بعد کمرا نمبر ۲۷ کا دروازہ کھلا اور تیمور، گارڈز کے درمیان باہر آیا تو وہ اصل تیمور حسین نہیں تھا۔ اس کے چہرے کے نقوش پھولے اور سوجے ہوئے لگ رہے تھے اور وہ مار پیٹ کا نتیجہ نہیں تھا۔ بلکہ اندر کے کسی ناقابلِ برداشت دباؤ کی وجہ سے تھا۔ اس کے ہاتھ ڈھیلے ڈھالے انداز میں پہلوؤں سے چپکے ہوئے تھے اور اس کی ٹانگیں پوری طرح اس کے قابو میں نہیں تھیں۔ وہ قدم قدم پر لڑکھڑاتا اور گرنے لگتا اور کبھی کھڑا ہو جاتا جیسے اس کے پاؤں فرش میں گڑ گئے ہیں۔ ایسے میں اسے آگے بڑھانے کے لئے گارڈز کو اسے دھکیلنا پڑتا اور تمام وقت اس کا سر بہت آہستہ آہستہ ہلتا رہا تھا، جیسے وہ کسی چیز کی نفی کر رہا ہو یا پھر اپنی گردن اس کے قابو میں نہ ہو۔

وہ کمرا ڈاکٹر موہن نیم کا تھا۔ وہ بہت قابل سائیکاٹرسٹ تھا۔ ایک زمانے وہ ہپناٹزم کے ذریعے اپنے دولت مند مریضوں کی نفسیاتی الجھنیں دور کرتا تھا مگر اب وہ معقول معاوضے پر بھارتی حکومت کے زیر سایہ اپنی صلاحیتوں کا منفی استعمال کر رہا تھا۔ اب اس کا کام تھا انسانی ذہن کو تباہ کرنا۔

☆============☆============☆

پیرس میں روزنامہ انقلاب کا اسٹاف ایک ایسے شخص کی تلاش میں تھا جو غیر قانونی طور پر ۴۸ء میں پیرس آیا ہو۔ امکان یہی تھا کہ وہ مشرقی یورپی بن کر رہ رہا ہو گا۔ اس کے پاس نہ ورک پرمٹ ہو گا' نہ شناختی کاغذات۔ یعنی وہ کوئی باقاعدہ ملازمت بھی نہیں کر رہا ہو گا اور وہ پولیس سے بچ کر رہتا ہو گا۔

تلاش کے سلسلے میں پوچھ گچھ بہت محتاط انداز میں کی جا رہی تھی۔ عمر اور تسکین دونوں کو یقین تھا کہ اگر مطلوبہ شخص کے کان میں بھنک بھی پڑ گئی کہ اسے تلاش کیا جا رہا ہے تو وہ روپوش ہو جائے گا۔ یہ سوچ کر کہ پولیس اس کی تلاش میں ہے۔ دوسری طرف اس بات کی بھی بہت اہمیت تھی کہ اسے جلد از جلد تلاش کر لیا جائے۔ ان کے پاس وقت زیادہ نہیں تھا۔

فرید پیرس اور گردونواح کے ریس کورسوں کو کھنگالتا پھر رہا تھا۔ یہ ایسے مقامات تھے جہاں کوئی غیر ملکی نمایاں ہوئے بغیر بھی پیٹ پالنے کے لئے کوئی دھندا کر سکتا تھا۔ وہاں فرید کو ایک ہنگرین جوکی کے متعلق بتایا گیا۔ اس بات پر سب متفق تھے کہ اس کے انداز سے کسی نہ کسی گڑبڑ کا پتا چلتا ہے۔ فرید نے اس جوکی کو دیکھا لیکن وہ پہلے ہی سے جانتا تھا کہ اس کا مطلوبہ شخص اب عمر کے اس حصے میں ہو گا جہاں وہ گھڑ دوڑ میں حصہ نہیں لے سکتا۔ ویسے بھی گھڑ سواری کسی سیکریٹری ٹائپ کے آدمی کے بس کا روگ نہیں تھا۔

ان لوگوں نے چیکو سلوا کیہ' رومانیہ' آسٹریا' بلغاریہ اور رومانیہ کے پناہ گزینوں کو چیک کیا لیکن کوئی ایسا شخص نہیں ملا جس پر خواجہ مقصود کا سیکریٹری ہونے کا گمان کیا جا سکتا۔ اس دوران عمر پریس ایسوسی ایشن نیوز پرنٹر مشینوں اور ادارتی کمرے کے درمیان منڈلاتا رہا۔ ٹیلی پرنٹر مشین کے ذریعے یہ اہم خبر آنا تھی کہ تیمور پر مقدمہ کب شروع ہو

گا۔ ادارتی کمرے میں ڈیڈ لیپ ہام اور صدیق اس کی معاونت کر رہے تھے۔ وہ انہیں نت نئے کام سونپتا۔ وہ خود اٹھارہ گھنٹے یومیہ کام کر رہا تھا۔ یعنی ڈیڈ اور صدیق سے زیادہ خود کو تھکا رہا تھا۔ اس نے ادارتی کام تسکین کو سونپ دیا تھا جو اپنی مخصوص مستعدی کے ساتھ پُرسکون انداز میں اسے نبھا رہی تھی لیکن اتنی محنت کے بعد بھی وہ نقطۂ آغاز پر کھڑے تھے۔ انہیں یہ تک معلوم نہیں تھا کہ جس شخص کو وہ تلاش کر رہے ہیں' اس کا نام کیا ہے۔ یہ بات مایوس کن بلکہ المناک تھی۔

وہ بڑی تندہی سے کام کر رہے تھے۔ عمر کا تجربہ کہتا تھا کہ اس انداز میں کام کرنے کا نتیجہ ضرور نکلتا ہے لیکن یہاں یہ بات سامنے آ رہی تھی کہ لگتا تھا' ان کا مطلوبہ شخص پیرس میں قیام کے بعد بالآخر شہر چھوڑ گیا تھا۔ ممکن ہے' پیرس نے اسے احساس تحفظ نہ دیا ہو۔ یا پھر وہ چھپ کر رہنے کے معاملے میں لاثانی تھا کیونکہ اپنے کام میں ماہر چھ سات رپورٹروں کی تفتیش کا بے نتیجہ ہونا کوئی مذاق نہیں ہوتا۔

وقت ڈوری کی طرح ہاتھ سے پھسلا جا رہا تھا۔ پاکستان سے ہر روز فون آتا۔ پبلشر پوچھتا کہ عمر' تیمور کے سلسلے میں کیا کر رہا ہے۔ کچھ بات بنی یا نہیں۔ وہ ہر روز یہ بھی بتاتے کہ اسلام آباد کی کوئی کوشش بار آور نہیں ہو رہی ہے۔ وہ ایسی تجاویز پیش کرتا جو ناقابلِ عمل ہوتیں۔ عمر کا بس وقت ضائع ہوتا۔ اس کے اعصاب پر ویسے ہی ہر گزرتا ہوا لمحہ بوجھ بن رہا تھا۔ وہ چڑچڑا اور غصہ ور ہو گیا تھا۔

☆============☆============☆

ڈاکٹر موہن نیم فربہ اندام تھا۔ اس کے سر کے بال برف جیسے سفید تھے۔ غیر معمولی چمک دار آنکھیں وجود کے ہر خفیہ خانے کو ٹٹول کر جسم کے پار نکلتی محسوس ہوتیں۔ وہ جیل میں پانچ گھنٹے دیتا تھا۔ دو گھنٹے صبح کے وقت اور تین گھنٹے سہ پہر میں۔ ان دنوں پاکستانی جاسوس تیمور حسین کی ذہنی اور نفسیاتی مزاحمت کو توڑتا تھا۔ وہ صرف اسی پر کام کر رہا تھا۔

ڈاکٹر موہن کو اپنے مریض کے مجرم ہونے یا نہ ہونے سے کوئی غرض نہیں تھی۔ وہ یہ بات خوب جانتا تھا کہ تیمور حسین کو اس کے سپرد کیوں کیا گیا ہے۔ لوگ صرف تین طرح کی صورت حال میں اعتراف جرم کرتے تھے۔ ایک انتہائی جسمانی تکلیف کی وجہ

سے ....اور تشدد سے بچنے کے لئے۔ لیکن ایسے لوگ زخموں کے بھر جانے کے بعد اعترافِ جرم سے منکر ہو جاتے تھے۔ دوسری صورت یہ تھی کہ ان کے پیاروں کو یرغمال بنا لیا جاتا اور وہ ان کی جان بچانے کے لئے اعترافِ جرم کر لیتے۔ اس لئے کہ اپنے پیاروں کی ابتلا پر انہیں احساسِ جرم ہونے لگتا۔ یہ سب سے اچھی صورت تھی۔ عدالت میں ایسے لوگوں کا اعترافِ جرم بے حد موثر اور سچا معلوم ہوتا۔ تیسری صورت سائیکاٹری تھی۔ یہ ان لوگوں کے لئے مددگار تھی جنہیں احساسِ جرم ستاتا تھا جبکہ درحقیقت معیوب خواہشات کے سوا انہوں نے کوئی جرم نہیں کیا ہوتا تھا۔ رام راج کی شیطنت نے اس تیسرے طریقے کا ایک اور استعمال نکال لیا تھا۔ اب ان کے کہنے پر سائیکاٹرسٹ اہداف کے ذہنوں میں احساسِ جرم کی فصل بوتے تھے جبکہ درحقیقت احساسِ جرم کی کوئی بنیاد ہی نہیں ہوتی تھی۔ اس کے لئے انہوں نے ایک ٹیکنیک وضع کر لی تھی اور سائیکاٹرسٹ کے پاس بھیجے جانے سے پہلے مریض کو تیاری کے مراحل سے گزارا جاتا تھا۔ تیاری کا انحصار مریض کی طاقت، ذہانت، آئی کیو اور اس کی انا اور خودداری کی پیائش پر ہوتا تھا۔ ظاہر ہے، ایک ہی طرح کی ذلت سے دو چار کئے جانے پر دو مختلف افراد مختلف ردِ عمل ظاہر کرتے ہیں۔

ڈاکٹر موہن نے اس کارڈ کا جائزہ لیا جو ویران آنکھوں والے اس مریض کے ساتھ آیا تھا۔ وہ بے حد غلیظ پاجامہ پہنے ہوئے تھا۔ اس کا بالائی جسم برہنہ تھا۔ وہ اس کے سامنے کھڑا تھا۔ "بہت خوب!" ڈاکٹر بڑبڑایا "آٹھ دن سخت نوعیت کی پوچھ گچھ۔ بہت زیادہ روشن کوٹھری۔ یعنی یہ تھکن اور بے آرامی سے ٹوٹ رہا ہو گا اور نیند کے لئے ترس رہا ہو گا۔ اس کے بعد کمرا نمبر ۲۷ میں آدھے گھنٹے کی ورزش ...." اس نے کارڈ کو پلٹا۔ پیچھے ڈاکٹر کا تحریری تبصرہ تھا۔ اس ڈاکٹر نے مریض کی خودی کو نقصان پہنچانے کی کوشش کے بعد دو مسکن دواؤں کے انجکشن لگائے تھے۔ ڈاکٹر نے اپنے نوٹ میں خیال ظاہر کیا تھا کہ مریض نے خود کشی کی کوشش نہیں کی تھی بلکہ وہ چاہتا تھا کہ اسے عدالت میں پیش نہ کیا جائے۔ اس کے لئے وہ خود کو کوئی زخم لگانا چاہتا تھا۔ مسکن دوائیں ایسی دی گئی تھیں جو دماغ پر اثر انداز ہوتی تھیں۔ ان کا مقصد اسے اس وقت پر سکون رکھنے کے علاوہ ڈاکٹر موہن نیم کے لئے تیار کرنا بھی تھا۔

ڈاکٹر موہن نے نظریں اٹھا کر اپنے دیو قامت مریض کو دیکھا اور اس سے یوں مخاطب ہوا جیسے وہ کوئی چھوٹا سا، بدتمیز بچہ ہو "اب خود کشی کی یا خود کو زخمی کرنے کی کوشش نہ کرنا۔ جذبات بچوں کے کھلونے ہیں اور یہ سب سے بچکانہ جذبہ ہے۔ خود کو نقصان پہنچانا۔ دوسروں کو نقصان پہنچانے کے لئے۔ تم یہ بات سمجھتے ہو نا؟"

"سمجھتا ہوں، آئندہ ایسا نہیں کروں گا" تیمور نے کہا۔ اسے احساس تھا کہ اس کی زبان موٹی ہو گئی ہے اور آواز عجیب سی لگ رہی ہے لیکن اپنا ذہن اسے بالکل صاف لگ رہا تھا۔ ڈاکٹر اسے اچھا لگا تھا۔ جیل میں اب تک اس کا جن لوگوں سے سابقہ پڑا تھا، ان میں وہ سب سے اچھا تھا "میں بیٹھ سکتا ہوں؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں" ڈاکٹر موہن نے تیز لہجے میں کہا "تمہیں کھڑے رہنا ہے۔ ابھی ہمارے تعلقات ایسے نہیں کہ تم میرے سامنے بیٹھ سکو۔"

اب تک تیمور تعمیل ارشاد کا عادی ہو چکا تھا کیونکہ مزاحمت کے بعد بھی آخر کار یہی کچھ کرنا پڑتا تھا۔ تاہم ڈاکٹر کی بات سے اسے مایوسی ہوئی۔

ڈاکٹر موہن نے کہا "مسٹر تیمور، مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم فوجی ہو۔"

"جی ہاں۔ میں نے شارٹ سروس کمیشن لیا ہے۔"

"کوئی جنگ لڑی تم نے؟"

"جنگ تو نہیں۔ البتہ انفرادی طور پر میں نے جہادِ افغانستان میں حصہ لیا ہے۔"

"وہاں تم کیا کرتے رہے؟"

تیمور کو مایوسی ہوئی۔ اس نے سوچا، یہ شخص بھی ویسا ہی نکلا۔ یہ سب یہی بات پوچھتے ہیں۔ بہرحال یہ کوئی مسئلہ نہیں تھا "میں دشمن سے جنگ لڑتا رہا" اس نے جواب دیا۔

"مقصد کیا تھا تمہارا؟ اور جنگ کس سے لڑتے رہے؟"

"مقصد تھا افغانستان کی آزادی، اور پہلے ہم روسیوں سے اور بعد میں افغان غاصبوں سے لڑے۔"

"اور تم نے یقینی طور پر پل اڑائے ہوں گے، تخریب کاری کی ہو گی، افغان املاک کو نقصان پہنچایا ہو گا۔"

تیمور کی ٹانگیں دکھنے لگی تھیں۔ پنڈلیوں میں درد ہو رہا تھا "دیکھیں.......... ہم حالت جنگ میں تھے۔ جنگ کے دوران کچھ تباہ کرنا تخریب کاری کے زمرے میں نہیں آتا۔"

"یعنی تمہارے خیال میں صرف فوجی وردی پہن لینے سے تخریب کاری جیسا جرم کار ثواب ہو جاتا ہے؟"

اس پر تیمور بری طرح چونکا "میں تمہاری بات نہیں سمجھا ڈاکٹر!"

"بات یہ ہے کہ جہاں کسی کے نقصان کا معاملہ ہو' وہاں نیت نہیں دیکھی جاتی' صورت حال پر غور نہیں کیا جاتا۔ مجرمانہ عمل کو اس کے میرٹ پر پرکھا جاتا ہے۔ تم نے افغانوں کی املاک تباہ کیں۔ یہ بہرحال تخریب کاری تھی' یعنی جرم تھا۔"

تیمور کو تسلیم کرنا پڑا کہ ڈاکٹر کا استدلال معقول تھا اور وزن رکھتا تھا

"اوہ.........میں نے کبھی اس زاویے سے تو سوچا ہی نہیں.........."

"حالانکہ سوچنا چاہئے اس لیے کہ یہ بات سچی ہے۔ اب اس طرح سوچنے کی کوشش کرو گے؟" ڈاکٹر نے پوچھا۔

تیمور کی تابع داری پھر عود کر آئی "اگر تمہاری یہی خواہش ہے تو ضرور سوچوں گا۔" اس نے کہا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ ڈاکٹر بہرحال معقول آدمی ہے۔ ورنہ دوسرے لوگ تو اس پر چیختے چلاتے تھے۔ حکم دیتے تھے کہ جاسوس اور تخریب کار ہونے کا اعتراف کر لو۔ جبکہ ڈاکٹر اپنا نقطۂ نظر پیش کر کے اس پر صرف غور کرنے کی فرمائش کر رہا تھا اور اس کی بات بھی معقول تھی۔

"اگر میں تمہیں اس کاؤچ پر لیٹ کر ایک گھنٹا سونے کی اجازت دوں تو کیا تم میری بات پر غور کرو گے؟ کیا تم وعدہ کرو گے کہ میری بات دہراؤ گے؟"

"نیند کے لئے تو میں سب کچھ کر سکتا ہوں ڈاکٹر۔"

"تو پھر ایسا کرو کہ سو جاؤ۔"

ڈاکٹر شریف النفس آدمی ثابت ہو رہا تھا۔ تیمور نے بھی اپنا وعدہ نبھایا۔ اس نے سونے سے پہلے ڈاکٹر موہن کے نقطۂ نظر سے سوچنے کی مخلصانہ کوشش کی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ وہ واقعی جاسوس اور تخریب کار ہے۔ وردی سے جرم کار ثواب تو نہیں ہو جاتا۔ اصل

اہمیت فعل کی ہے.......... عمل کی..........

تیمور سو گیا تو ڈاکٹر نے ایک سرنج میں محلول بھرا اور تیمور کو اتنی مہارت سے انجکشن لگایا کہ تیمور کو پتا بھی نہیں چلا۔ تیمور کے جاگتے جاگتے دوا یقیناً پوری طرح اثر انداز ہو چکی ہو گی۔

یہ اس انٹرویو کا آغاز تھا جس کا مقصد مریض کے دماغ میں ان بنیادی تصورات کے بیج ڈالنا تھا جو بڑی اہمیت کے حامل تھے۔ عام طور پر ڈاکٹر موہن اس موقعے پر ہپناٹزم سے استفادہ کرتا تھا۔ جو دوا اس نے تیمور کے جسم میں انجکٹ کی تھی' وہ مریض کی اخلاقی قدروں کو دھندلاتی' اس کے ذہن کو الجھاتی اور اسے بیرونی ترغیبات زیادہ آسانی سے قبول کرنے کے قابل بناتی تھی۔ وہ دوا فوری نتائج کے لئے اچھی تھی لیکن اس کے اثرات دیرپا نہیں ہوتے تھے۔ تاہم اگر بیج ٹھیک طور سے بوئے جاتے اور خیالات اور جذبات کی مریض کی شخصیت میں اس وقت پیوند کاری کی جاتی جب وہ کمزور ترین پوزیشن میں ہوتا تو دوا کا استعمال روکنے کے بعد بھی وہ سب کچھ شعور میں اسی طرح موجود رہتا۔ وہ خیالات اور جذبات مریض کی شخصیت کا جزو لازم بن جاتے۔ شرط یہ تھی کہ وہ سمجھ لئے اور تسلیم کر لئے جائیں۔ تب مریض عدالت کے کٹہرے میں کھڑا ہو کر احساسِ جرم کی گٹھڑی سر سے اتار پھینکتا اور پُرسکون ہو جاتا اور اعتراف کرتے وقت اس کے انداز میں اعتماد اور کامل یقین ہوتا۔

اور یہی ڈاکٹر موہن نیم کی اہمیت تھی!

ایک گھنٹا پورا ہو گیا تو ڈاکٹر موہن کاؤچ کی طرف بڑھا اور اس کا کندھا ہلاتے ہوئے کہا "بس اب اٹھ جاؤ۔ وہاں جا کر کھڑے ہو جاؤ اور اپنا وعدہ یاد کرو۔ ہاں..........اب بتاؤ کہ افغانستان میں تم کیا کرتے رہے تھے؟"

تیمور کا ذائقہ کچھ عجیب سا ہو رہا تھا۔ ایک گھنٹے کی نیند سے اسے کوئی فائدہ نہیں ہوا تھا۔ وہ خود کو پہلے سے زیادہ مضمحل محسوس کر رہا تھا۔ "میں جہاد افغانستان کے دوران.........."

اسی لمحے ڈاکٹر موہن کی آواز کوڑے کی طرح لہرائی "نہیں.......... نہیں۔ یاد کرو' ہمارے درمیان کیا طے ہوا تھا۔"

تیمور کو وہ بات یاد آئی۔ وہ احمقانہ انداز میں مسکرایا۔ واقعی وہ بھی کتنا احمق تھا کہ یہ بات بھول گیا تھا۔ جو بات طے ہوئی تھی اسی پر تو خوش ہو کر ڈاکٹر نے اسے ایک گھنٹہ سونے کا موقع فراہم کیا تھا "میں جاسوس تھا.......... میں تخریب کار تھا" اس نے دہرایا۔

"ہاں.......... یہ بہتر ہے۔ اب ذرا اسے دہراؤ" ڈاکٹر بولا۔

"جاسوس اور تخریب کار تھا میں۔"

"بالکل درست۔ اور تم یہ بھی جانتے ہو کہ یہ سچ ہے؟"

"جی ہاں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ سچ ہے۔"

"گڈ۔ اب مجھے اپنے پروفیشن کے متعلق بتاؤ۔ میرا خیال ہے' تم ایک اخباری رپورٹر ہو۔ یہ درست ہے نا؟"

"جی ہاں۔" تیمور اب قدرے پُر سکون تھا۔ اسے اطمینان تھا کہ ڈاکٹر حقیقت جانتا ہے۔ وہ جہاد افغانستان کے دوران جاسوس اور تخریب کار سہی لیکن ڈاکٹر جانتا تھا کہ اب وہ رپورٹر ہے۔ گویا اب وہ اس پر جاسوس اور تخریب کار ہونے کا الزام نہیں لگا رہا ہے۔

"تمہارے ہاں اخباری رپورٹر کے فرائض کیا ہوتے ہیں؟" ڈاکٹر نے پوچھا۔

"تیمور کے لئے اپنی توجہ کہیں مرکوز کرنا بہت دشوار تھا۔ کمرا نمبر ۲۷ میں جو کچھ ہوا تھا' اس کے بعد یہ کمزوری پیدا ہوئی تھی لیکن اب وہ کمرا نمبر ۲۷ کے بارے میں سوچنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ اس نے بلند آواز میں کہا "میرا خیال ہے' وہی فرائض آپ کے ملک میں بھی ہوتے ہیں رپورٹروں کے۔"

"میرا خیال مختلف ہے" ڈاکٹر بولا "ہمارے ہاں رپورٹر وہ بیانات جو حکومت انہیں فراہم کرتی ہے' لے جا کر اپنے اخبار میں دیتے ہیں۔ ایڈیٹرز ان کی اشاعت کا اہتمام کرتے ہیں۔ اب تم میرے سوال کا جواب دو۔ تمہارے ہاں ایک اخباری رپورٹر کے کیا فرائض ہوتے ہیں؟"

تیمور الفاظ تلاش کرنے لگا "جی.......... وہ.......... اسٹوری کی تلاش' حقائق کی جستجو' لوگوں کے اور واقعات کے متعلق جاننے کی کوشش۔ جو کچھ معلوم کرنا' اسے لکھ کر.........."

"تم جن لوگوں کے متعلق نجی نوعیت کی معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہو' کیا وہ لوگ بخوشی وہ معلومات فراہم کرتے ہیں؟"

تیمور نے ایک لمحے کو سوچا۔ ایک تو اسے وہ کسی اور زمانے کی بات لگتی تھی پھر اسے خیال آیا کہ اپنے ذاتی معاملات میں مداخلت تو کسی کو بھی اچھی نہیں لگتی۔ ایسی معلومات خریدنی' بہ زور حاصل کرنی بلکہ چرانی پڑتی ہیں۔ اس نے سوچا' یہ سن کر تو ڈاکٹر کو تعجب ہو گا۔ بلکہ شاید خوش بھی ہو۔

اس نے ڈاکٹر موہن کو سب کچھ بتا دیا۔

"دوسرے لفظوں میں تمہارے ملک میں اخبار نویس وہی کچھ کرتا ہے جو ہمارے ملک میں پولیس اور انٹیلی جنس کے لوگ کرتے ہیں؟"

تیمور نے حیرت سے اسے دیکھا۔ یہ بات طے تھی کہ ڈاکٹر مختلف معاملات میں اچھوتے مگر معقول پہلو نکالنے کا ماہر ہے۔ تیمور نے اپنے پیشے کے بارے میں کبھی اس زاویے سے نہیں سوچا تھا' مگر بات بہرحال معقول تھی۔ اس نے کہا "لگتا تو یہی ہے لیکن ایسا نہیں ہے۔ دیکھیں' ہمارا فرض لوگوں تک حقائق پہنچانا ہے اور.........."

"جو کچھ مجھ سے سیکھا' سمجھا ہے' وہ نہ بھولو" ڈاکٹر نے تہدیدی لہجے میں کہا "حالات' مقصد' نیت یا نتائج کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ فعل یا عمل کیسا ہے۔ اچھا ہے یا برا.......... اور اسے کیا عنوان دیا جائے گا۔ درحقیقت رپورٹر کی حیثیت سے بھی تم جاسوسی کرتے رہے ہو۔ ہے نا سچ؟"

تیمور کو موہوم سا احساس ضرور ہو رہا تھا کہ اس منطقی استدلال میں کوئی سقم ہے لیکن اس کا ذہن اسے گرفت میں نہیں لے پایا۔ وہ اتنا نڈھال تھا کہ اس پر اپنی ذہنی قوت مرکوز نہیں کر سکتا تھا پھر اس نے سوچا' اسے زحمت کی ضرورت بھی کیا ہے جبکہ ڈاکٹر کی بات معقول ہے۔ "یہ درست ہے" اس نے آہستہ سے کہا۔

وہ اس کی تعلیم جرم کا آغاز تھا۔ اس کی قوتِ مدافعت کو تھکن اور نیند کی محرومی نے توڑ دیا تھا اور اس کے ذہن اور قوت فیصلہ کو انجکشن کی جانے والی دوا نے ماند کر دیا تھا۔ اسے بتدریج لیکن یقینی انداز میں اس راہ پر لایا گیا تھا جہاں وہ ایک پیشہ ور جاسوس اور کسی اسٹوری کا تعاقب کرنے والے رپورٹر میں تمیز نہ کر سکے۔ وہ بھول گیا کہ وہ

رپورٹر کی حیثیت سے کشمیر میں یہ جاننے کے ارادے سے داخل ہوا تھا کہ بے قصور لوگوں کو اعتراف جرم پر کیسے مائل کیا جاتا ہے۔

ڈاکٹر موہن ماہرانہ انداز میں اسے نئی آئیڈیالوجی کے راستوں پر پھراتا رہا۔ وہ ایک ظالم تبصرہ کرکے اس کے ذہن میں بسے ہوئے پرانے مثالیوں کو چکنا چور کر دیتا اور جو کچھ بچتا' وہ تیمور کے لئے ایک ننگی' بدصورت سچائی کے سوا کچھ بھی نہ ہوتا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ تیمور نہ صرف خود کو مجرم سمجھنے لگا بلکہ عمر' تسکین' اس کا اخبار اور وطن' سبھی مجرم ٹھہرے۔

ڈاکٹر نے تیمور سے عمر کے فوجی پس منظر کے بارے میں پوچھا اور تبادلہ خیال کیا۔ اس نے یہ ثابت کیا کہ ایک انٹیلی جنس آفیسر دوسرے انٹیلی جنس آفیسر کو ہدایات دے سکتا ہے.........اسے کسی مشن پر روانہ کر سکتا ہے۔ تیمور نے جب یہ کہا کہ وہ عمر کی ہدایت پر ہرگز کشمیر نہیں آیا تو ڈاکٹر ہنسنے لگا۔ "ہدایات براہ راست دینا ضروری تو نہیں" وہ بولا۔ "بعض اوقات دوسرے شخص کو احساس بھی نہیں ہوتا کہ اسے کس طرح ترغیب دی جا رہی ہے۔ تمہیں یہ یقین کیوں ہے کہ عمر اور اس کی بیوی نے تمہیں یہاں آنے کی ترغیب نہیں دی؟"

اس پر تیمور جز بز ہو کر رہ گیا۔

ڈاکٹر موہن نے بڑی سنجیدگی سے تیمور سے تسکین کی محبت کی کہانی سنی اور ایسے موقعے پر جب تیمور دوا کے زیر اثر تھا' اس نے تیمور کو عمر اور تسکین کی شخصیت کے ممکنہ دوسرے رخ دکھائے۔ اس نے تیمور کو بتایا کہ وہ دونوں بے حد چالاک اور مفاد پرست انسان ہیں اور انہوں نے مل کر سازش کی اور اسے جاسوسی کے لئے آلہ کار بنا لیا۔ یہ سوچ کر کہ اگر کوئی گڑبڑ ہو گئی تو ذمے داری تیمور کی ہو گی اور بھگتے گا بھی وہی۔

مرحلہ وار اس نے تیمور کو یقین دلایا کہ وہ درحقیقت جاسوس اور تخریب کار کی حیثیت سے کشمیر آیا ہے لیکن یہ مروجہ مفہوم کی تخریب کاری نہیں۔ وہ یہاں سے اسٹوری کے لئے مواد کے نام پر جو کچھ بھی لے کر جاتا' وہ شائع نہیں کیا جاتا بلکہ خفیہ طور پر پاکستانی فوج کو رپورٹ کی صورت میں دے دیا جاتا۔ تیمور بھی جانتا تھا کہ اس خیال کو یونہی مسترد نہیں کیا جا سکتا۔ یہ تجزیہ درست بھی ہو سکتا ہے۔ جو وہ درحقیقت تھا اور جو

اسے بنایا جا رہا تھا' ان کے درمیان فاصلہ سمٹ رہا تھا۔

کبھی کبھی یہ سب دلائل اس پر چیخ چلا کر' اسے ڈانٹ کر بھی اس پر تھوپے جاتے تھے۔ ایسا اس وقت ہوتا' جب وہ جسمانی تھکن اور نیند کی کمی سے نڈھال ہوتا۔ ایسے میں وہ ہر بات تسلیم کرنے کو تیار ہوتا۔ یا پھر وہ سب کچھ اس سے بہت دوستانہ انداز میں کہا جاتا۔ اس دوران اسے کاؤچ پر بیٹھنے کی اجازت بھی دی جاتی اور چائے اور سگریٹ سے اس کی تواضع بھی کی جاتی۔ ایسے میں ڈاکٹر کہتا "تم اس بات سے واقف ہو مسٹر تیمور کہ کسی غیر ملک میں ہر محب وطن شخص درحقیقت اپنے ملک کا ایجنٹ ہوتا ہے۔"

اور اگر تیمور سو فی صد نارمل بھی ہوتا' تب بھی اس جملے کی سچائی کو چیلنج نہیں کر سکتا تھا۔

جیسے کسی دماغی عارضے میں مبتلا مریض اور اس کے ڈاکٹر کے درمیان ذاتی سا تعلق قائم ہو جاتا ہے' ویسا ہی ذاتی تعلق ڈاکٹر موہن اور تیمور کے درمیان استوار ہو گیا تھا بلکہ وہ تعلق خود ڈاکٹر موہن نے استوار کیا تھا اور اس کی بنیاد اس پر تھی کہ وہ تیمور حسین جو ہر مخالفت کو روند کر آگے بڑھ جانے کا قائل تھا' ابنارمل اور کمزور ہوا تو ڈاکٹر موہن پر انحصار کرنے لگا۔ وہ ہمہ وقت ڈاکٹر کو خوش رکھنے کی کوشش کرتا۔ ڈاکٹر اس سے ناراض ہوتا' اس پر چیختا چلاتا تو وہ فکر مند اور پریشان ہو جاتا۔ اور جیسے جیسے اس پر کیا جانے والا کرپشن کا عمل اپنی جڑیں مضبوط کرتا گیا' تیمور کو احساس توہین بھی نہ رہا۔ اسے ڈاکٹر کا ڈانٹنا اور اپنی تابع داری نارمل لگتی تھی۔ جیسے وہ ہمیشہ سے ایسا ہی تھا۔ اسے احساس بھی نہیں تھا کہ وہ انسان سے پالتو جانور میں تبدیل ہو گیا ہے۔

اس کو راضی بہ رضا ہو جانے کے سبق دیے گئے۔ جب وہ بدتمیزی کرتا تو جیسے چھچھورے والدین بچے کے منہ پر تھپڑ رسید کر دیتے ہیں' اس کی کبھی پٹائی نہیں کی گئی' اسے کبھی زدوکوب نہیں کیا گیا لیکن جب کبھی وہ اس حد تک بدتمیز ہو گیا کہ اسے یہ پروا بھی نہ رہی کہ وہ اسے شوٹ کر دیں گے تو انہوں نے اپنی عددی برتری کے زور پر اسے قابو کر لیا۔ وہ اسے گھسیٹتے ہوئے تہ خانے میں لے گئے اور کسی کوٹھری میں پٹخ دیا۔ پٹخ کیا دیا' ٹھونس دیا کہنا زیادہ مناسب ہو گا۔ اس لئے کہ کوٹھری بے حد تنگ' گھٹی ہوئی اور نیچی چھت والی تھی۔ نہ تو وہ وہاں پوری طرح کھڑا ہو سکتا تھا اور نہ ہی پاؤں پھیلا کر لیٹ سکتا

تھا۔ وہاں اسے اڑتالیس گھنٹے کے لئے ٹھونس دیا گیا۔ اس دوران وہ خوراک' پانی' روشنی اور تازہ ہوا سے محروم رہا۔ وہ بے آرام پوزیشن جسم کی نسوں اور رگوں کے پٹھوں کو توڑ دینے والی تھی۔ وہ بدترین اذیت تھی۔ وہاں ذہنی طور پر تیمور مرگیا۔ وہ اس کا آخری مقبرہ تھا جہاں دیواریں اور چھت پانچوں طرف سے اس پر دباؤ ڈال رہی تھیں۔ وہ دیو قامت' مضبوط اور فعال تھا۔ وہ قید اس کی ان صفات کے اعتبار سے بہت طویل تھی۔ اور جب اس کے شیطان صفت صیاد اسے واپس لے جانے کے لئے آئے تو اس کے لئے وہ نجات دلانے والے فرشتے تھے۔

اس کو اس جانور کی طرح تربیت دی جارہی تھی جس پر کسی سائنس دان کو تجربہ کرنا مقصود ہو۔ اس چوہے کی طرح جسے یہ سکھایا جارہا ہو کہ پنیر حاصل کرنے کے لئے کس طرح بھول بھلیوں سے گزرا جاتا ہے۔ فرق یہ تھا کہ اسے دہشت سے دوچار کیا جاتا تھا۔ اسے یہ سکھایا جاتا تھا کہ دہشت ناک مرحلوں کے درمیان سکون کا وقفہ حاصل کرنے کے لئے کیا کرنا چاہئے۔ جسم اور شعور کے ساتھ اس کا تحت الشعور بھی تلپٹ ہو رہا تھا۔ اس تشدد کی شیطنت اور ہولناکی یہ تھی کہ آدمی غیر شعوری طور پر خود سے بھی غداری کر لیتا تھا اور اسے احساس بھی نہیں ہوتا تھا۔

اس کے باوجود جانے کس طرح تیمور اب بھی لڑ رہا تھا۔ مدافعت کر رہا تھا۔ ان واضح اور شفاف لمحوں میں جب وہ دوا کے زیر اثر نہیں ہوتا تھا' تب اس میں عجیب سی قوت ابھر آتی اور اسے نظر آجاتا کہ اسے فٹ بال کی طرح استعمال کیا جارہا ہے۔ تباہ کیا جارہا ہے ایسے میں وہ اپنا اعتراف جرم لکھنے سے انکار کر دیتا۔ حالانکہ وہ اسے خود اس کا لکھا ہوا اعتراف جرم بھی دکھا دیتے تھے۔ وہ جعل سازی کے ماہرین کا شاہکار تھا۔ جس پر کوئی انگلی بھی نہیں اٹھا سکتا تھا۔ ایسے میں وہ جاسوسی کے الزام سے یکسر انکار کر دیتا۔ اس کے بعد وہ لوگ پھر اس کی ہوش مندی پر تشدد کے ہتھوڑے برساتے۔ وہ تشدد اسے خطرناک حد تک دیوانگی کی اس سرحد سے قریب کر دیتا جسے پار کرنے کے بعد واپسی ناممکن تھی۔ اسے ایک بار پھر کمرا نمبر ۲۷ کی وحشتوں سے متعارف کرایا جاتا۔

وہ اس کو سزا کا احساس دلانے اور سزا سے بچنے کے لئے خود کو بھی بیچ دینے کی جبلت کو جگانے کے لئے اسے بتاتے کہ اسے کمرہ نمبر ۲۷ میں لے جایا جارہا ہے۔ اس

طرح اس میں کمزوری پیدا ہوتی اور وہ بچوں کی طرح رو رو کر کہتا "میرے خدا......... پلیز میرے ساتھ ایسا نہ کرو......... پلیز......... پلیز........."

اس دباؤ کے تحت وہ ان کی ہر بات ماننے کے لئے تیار ہو جاتا مگر وہ پھر بھی اسے نہ بخشتے۔ پھر وہ گارڈز کے درمیان آہستہ آہستہ دوسری منزل پر لے جایا جاتا جہاں کمرا نمبر ۲۷ واقع ہوتا تھا۔ تیمور ہمیشہ کمرے میں داخل ہونے سے بچنے کے لئے جدوجہد کرتا' ہاتھ پاؤں مارتا۔ اس خالی کمرے سے جس میں ایک کرسی اور بالٹی کے سوا کچھ بھی نہیں تھا' اسے اتنا خوف آتا تھا کہ اس کا بیان ممکن نہیں تھا وہ اس کے نزدیک اذیت کی چوکھٹ تھی۔

وہ اسے کمرے میں لے جاکر......... دھکیل کر کرسی پر بٹھاتے اور اس کے ہاتھ پاؤں اس طرح باندھتے کہ وہ ہلنے کے قابل بھی نہ رہتا۔ وہ لڑھک بھی نہیں سکتا تھا۔ اس کے بعد وہ کرسی کے پاس رکھی ہوئی بالٹی اٹھاتے اور بالٹی کو الٹا کر اس کے سر پر رکھ دیتے۔ بالٹی اس کے کندھوں پر ٹک جاتی۔ اس کا چہرہ بالٹی کے اندر ہوتا وہ کچھ بھی دیکھنے کے قابل نہیں ہوتا تھا۔ بالٹی دیوار کے سوا کچھ نظر آہی نہیں سکتا تھا۔

اس کے بعد اسے جو آخری قابلِ شناخت آواز سنائی دیتی' وہ گارڈز کے کمرے کے چاروں کونوں کی طرف بڑھتے ہوئے قدموں کی چاپ کی ہوتی۔ ہر کونے میں موٹے تنکوں والی ایک بہت بڑی جھاڑو رکھی ہوئی تھی۔ چاروں گارڈز وہ چاروں جھاڑوئیں استعمال شروع کر دیتے۔

اسے گارڈز کے واپس آتے ہوئے قدموں کی آہٹیں سنائی دیتیں پھر وہ بالٹی کی سائیڈوں پر اور پیندے پر جھاڑو برسانا کرتے تھے۔

ذرا ہی دیر کے بعد بالٹی پر کیا جانے والا ہر وار جو نہ اسے چھوتا' نہ اس کے جسم کے کسی حصے کو' اس کے لئے ایسا ہو جاتا تھا جیسے اس کے جسم میں نیزے اتارے جارہے ہوں۔ اس اذیت کے نتیجے میں بالٹی کے اندر سے جو آوازیں ابھرتیں' انہیں بلبلے اٹھنے کی غیر انسانی آواز یا بکری کا ممیانا ہی کہا جا سکتا تھا۔ بعض اوقات تو اس منحوس آہنی آواز کے نتیجے میں تیمور کے پھیپھڑے سے خوفناک چیخیں امنڈتیں۔ بالٹی کی بند فضا میں وہ چیخیں خود اس کی سماعت اور اعصاب کے لئے عذاب ناک ثابت ہوتیں۔ اسے اپنے کانوں کے

پردے پھٹتے اور دماغ ہلتا محسوس ہوتا۔ اس کا سر دھڑکتی' پھڑکتی آتشی اذیت سے بھر جاتا۔ ہر بار جب جھاڑو بالٹی سے ٹکراتی' اس اذیت میں اضافہ ہو جاتا۔

وہ لوگ کمرے کی لائٹ آف کر دیتے اور وہ شیطانی کھیل اندھیرے میں کھیلا جاتا۔ تیمور کے لئے تو بالٹی کے اندر ہی گھپ اندھیرا ہوتا۔ اس گھپ اندھیرے میں اسے احساس ہوتا کہ اس کا جسم پھیل رہا ہے اور رسیاں جسم میں گڑی جا رہی ہیں۔ ایسا لگتا کہ اس کا سر بھی بڑا ہو گیا ہے۔ اسی لئے بالٹی کا دباؤ اسے کھوپڑی چٹختا محسوس ہوتا ہے۔ اسے لگتا کہ اس کا سر ٹوٹ کر ہزاروں ٹکڑوں میں تبدیل ہو جائے گا لیکن ایسا کبھی نہ ہوتا۔ وہ سوچتا کہ اس اذیت سے نجات اس کے مقدر میں ہی نہیں۔

جب سزا کا وہ عرصہ ختم ہوتا اور اس کے سر سے بالٹی اٹھائی جاتی تو کرسی پر بندھا ہوا وہ شخص کم از کم تیمور نہ ہوتا جو وہ کبھی ہوا کرتا تھا۔ خوبرو تنومند سرکش اور زندگی سے بھرپور تیمور حسین۔ وہ تیمور حسین مر چکا تھا!

☆=============☆=============☆

جس بات کا انہیں خدشہ تھا اور جس سے وہ ڈر رہے تھے' وہ اچانک ہی رونما ہو گئی۔ بغیر کسی وارننگ کے۔ وہ اپریل کے اواخر کی ڈھلتی ہوئی سہ پہر تھی۔

وہ منظر بے حد ڈرامائی تھا۔ عمر' تسکین اور ڈیڈ لیپ ہام بیرونی دروازے سے اندر آئے۔ عین اسی وقت صدیق ان کے مقابل والے دروازے میں نمودار ہوا۔ وہ ٹیلی پرنٹر روم کا دروازہ تھا۔ وہ سب اپنی اپنی جگہ رک گئے۔ صدیق ان تینوں کو اور وہ تینوں بت بنے اسے دیکھ رہے تھے۔ کاپی ڈیسک پر ہونے والی سرگرمیاں یوں رک گئیں جیسے کسی نے برقی رو منقطع کر دی ہو۔ اب نہ کوئی ٹائپ کر رہا تھا' نہ کوئی کسی سے ہم کلام تھا۔ اس کی وجہ دو دروازوں میں کھڑے ان لوگوں کا انداز تھا۔ جو چیخ چیخ کر بتا رہا تھا کہ تباہ کن صورت حال سامنے آ چکی ہے۔

صدیق کے ہاتھ میں پریس کاپی کی ایک سلپ تھی۔ اس کی آنکھیں خوف سے پھیل گئی تھیں' منہ کھلا ہوا تھا اور چہرے کی رنگت یوں پیلی پڑ گئی تھی جیسے اس کا خون نچوڑ لیا گیا ہو۔ وہ ان تینوں کی طرف یوں دیکھ رہا تھا جیسے اسے یقین ہو کہ وہ اس کی امید بندھائیں گے۔ اور وہ تینوں جانتے تھے کہ اب کوئی امید نہیں رہی ہے۔

ڈیڈ لیپ ہام نے نفی میں سر ہلا دیا۔

صدیق کی آنکھیں کچھ اور پھیلیں۔ لب ہلے' بمشکل اس کی آواز نکلی' "ان لوگوں نے تیمور کو توڑ ڈالا ہے۔"

عمر نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ سے سلپ لے لی۔ اس نے پڑھا۔ سری نگر ۲۷ اپریل۔ بھارت کے وزیر داخلہ خواجہ مقصود نے آج اعلان کیا ہے کہ پاکستانی جاسوس تیمور حسین پر جسے ایک ماہ پہلے غیر قانونی طور پر کشمیر میں داخل ہونے کے جرم میں گرفتار کیا گیا تھا' ۲ مئی سے مقدمہ چلایا جائے گا۔ حکومت کی کوشش ہو گی کہ ملزم کو انتہائی سزا دلوائی جائے۔ مزید تفصیلات بعد میں.........

تسکین کے حلق سے عجیب سی آواز نکلی۔ وہ پلٹی اور کمرے سے نکل گئی۔ کمرے میں بے حد کشیدہ خاموشی تھی۔

پھر ڈیڈ نے تیز لہجے میں پوچھا۔ "نیلوفر کہاں ہے؟" اس نے دیکھ لیا تھا کہ نیلوفر کمرے میں موجود نہیں ہے۔

نواب نے کہا۔ "وہ کافی کا آرڈر دینے گئی ہے۔"

"وہ آئے تو اسے میرے پاس بھیج دینا اور جب تک اس سے میری بات نہ ہو' کوئی اسے نہ بتائے کہ کیا ہوا ہے۔ اس بچی کے لئے یہ بہت کڑا وقت ہے۔"

عمر یہ سوچ رہا تھا کہ یہ وقت تسکین کے لئے کتنا کڑا ہے۔ اپنی کیفیت تو اسے معلوم تھی۔

صدیق نے بڑی بے یقینی سے پوچھا۔ "ہم یہ شائع کریں گے؟"

"کیوں نہیں۔ ہم اخبار نکال رہے ہیں۔ اخبار ہماری پہلی ذمے داری ہے" عمر نے جواب دیا "پہلے صفحے پر یہ خبر شائع ہو گی' کاپی مجھے دکھا دینا۔"

"اور کیا ہم اس شخص کی تلاش جاری رکھیں گے؟" صدیق نے پوچھا۔

عمر کے جواب دینے سے پہلے ہی ڈیڈ نے کہا۔ "نہ صرف جاری رکھیں گے بلکہ اور تندہی سے تلاش کرنا ہے اسے۔"

عمر نے پریس کاپی صدیق کی میز پر رکھی اور کمرے سے نکل گیا۔ وہ اپنے آفس میں گیا۔ وہاں تسکین ادھر ادھر ٹہل رہی تھی۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔

"عمر.......... میں اسلام آباد جا رہی ہوں" وہ بولی "میں نے سات بجے کی فلائٹ پر سیٹ ریزرو کرا لی ہے۔ آج کا کام آدھے سے زیادہ مکمل ہے۔ میرا خیال ہے' میری غیر موجودگی میں ڈیڈ میرا کام سنبھال لیں گے۔"

"ٹھیک ہے تسکین" عمر نے کہا۔

"ممکن ہے' میں وہاں کام کی کوئی بات معلوم کر سکوں" تسکین نے وضاحت کی "یہاں تو ہم جیسے ایک بند گلی میں پھنس گئے ہیں۔ ہو سکتا ہے مجھے وہاں کسی سے اس سیکریٹری کا نام معلوم ہو جائے یا کوئی اور اہم بات.......... ممکن ہے' اسلام آباد میں کسی کو یاد ہو۔"

عمر کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔ محبت میں مبتلا لوگ کیسے عجیب کھیل کھیلتے ہیں۔ انہیں خود بھی پتہ نہیں ہوتا کہ وہ کوئی کام در حقیقت کیوں کر رہے ہیں۔ تسکین اسلام آباد جا رہی تھی کہ وہاں وہ خود کو تیمور سے نسبتاً قریب محسوس کرے گی لیکن ظاہر وہ یہ کر رہی تھی کہ عمر نے جو سیکریٹری کا فرضی کردار تخلیق کیا ہے' وہ اس کے وجود پر یقین رکھتی ہے۔ میں نے وہ کردار اپنی کمزوریوں اور اپنی ناکامیوں پر پردہ ڈالنے کے لئے تخلیق کیا تھا اور اب مجھ میں اتنی اخلاقی جرات نہیں کہ اس سے کہوں کہ تم اسلام آباد ضرور جاؤ۔ ممکن ہے' تم اسے ایک بار دیکھ بھی سکو۔ تم کشمیر جانے کی کوشش کرو تاکہ اسے مرتے ہوئے دیکھ سکو اور وہ اس لئے مر رہا ہے کہ مجھ سے ایک فیصلہ کرنے میں غلطی ہوئی تھی' عمر نے سوچا لیکن میں یہ کہہ نہیں سکتا۔ میں اس فرضی کردار سے چپکا رہوں گا جسے ہم سب نے مل کر حقیقی کردار بنا دیا ہے۔

"ٹھیک ہے تسکین۔ یہ کوشش بار آور بھی ہو سکتی ہے۔" اس نے کہا۔ "میں اپنے دوستوں کو مطلع کر دوں گا کہ.........."

"نہیں مگر' اس کی ضرورت نہیں.......... وہاں میرے اپنے رابطے ہیں۔ میرے دوست بھی ہیں۔ میں اپنے طور پر یہ کام کروں گی۔ تم بے فکر رہو۔"

عمر نے اداسی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

☆============☆============☆

تیمور کو اپنے ذہن پر قابو نہیں تھا۔ اس کا ذہن بار بار ادھر ادھر بھٹکتا تھا۔ عجیب

عجیب خیالات آتے تھے اس کے ذہن میں۔ جب بھی ایسا ہوتا' پروفیسر گرو داس جسے اس کا معلم مقرر کیا گیا تھا' اس کے رخسار پر پوری قوت سے تھپڑ رسید کرتا۔ اس پر قابو پانے کے اور طریقوں کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر موہن نے اسے یہ ہدایت بطور خاص دی تھی۔

گرو داس سری نگر کے ایک کالج میں لیکچرار تھا۔ سخت متعصب ذہنیت رکھتا تھا۔ اس کو کبھی کبھی قیدیوں کو مقدمے کے لئے تیار کرنے کے سلسلے میں استعمال کیا جاتا تھا۔ غاصب حکمران اس بات کی اہمیت سے واقف تھے کہ اعتراف جرم کرنے والا اگر عدالت میں بیان روانی سے' بغیر کسی ہچکچاہٹ کے دے گا تو زیادہ مؤثر ثابت ہوگا اسی لئے اس بات کو بہت زیادہ اہمیت دی جاتی تھی۔

"تم اپنا سبق ٹھیک طرح سے یاد کیوں نہیں کرتے؟" گرو داس نے تیمور کو تھپڑ مارتے ہوئے کہا "کیا تم چاہتے ہو کہ تمہیں پھر بالٹی دکھائی جائے؟"

"مارتے کیوں ہیں۔ میں سب کچھ روانی سے کہنا چاہتا ہوں لیکن کبھی کبھی بھول جاتا ہوں۔ مجھے یہ بھی یاد نہیں رہتا کہ میں اس وقت کہاں ہوں۔"

کچھ پروفیسر گرو داس کو تھپڑ مارنے میں لطف بھی آتا تھا۔ کالج کے طلباء کے تو تھپڑ مارا نہیں جا سکتا لہٰذا تیمور کو تھپڑ مار کر اسے خاص قسم کی تسکین ملتی تھی۔ پھر ڈاکٹر موہن نے اسے بتا دیا تھا کہ تیمور ایک بے ضرر آدمی ہے اور تھپڑ کھا کر کبھی اف بھی نہیں کرے گا بلکہ اسے تو تھپڑ کھانا اچھا لگتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اسے ذلیل کیا جائے۔

"ہم نے اس پر زبردست کام کیا ہے" ڈاکٹر موہن نے گرو داس کو یقین دلایا "شیر کو بکری بنا دیا ہے ہم نے۔ تمہیں اس سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔"

پروفیسر گرو داس کا قد سوا پانچ فٹ تھا۔ وہ دبلا پتلا' مخنی سا آدمی تھا جسے کلاس میں اس کے شاگرد بھی اہمیت نہیں دیتے تھے۔ تیمور اگر اس ہلکے سے بھی ہاتھ رسید کر دیتا تو اس کا پراٹھا بن جاتا لیکن تیمور کو ایسا کرنے کا خیال بھی نہیں آیا۔ اس لئے کہ اس کے دماغ میں ایک بات بسا دی گئی تھی۔ وہ غلطی پر تھا.......... مجرم تھا۔ وہ اتنا برا تھا کہ انتہائی درجے کی توہین بھی اس کے جرائم کا کفارہ نہیں کر سکتی تھی۔

"پھر سے سناؤ۔" پروفیسر گرو داس نے کہا۔

گرو داس کا مکتب جیل ہی کے ایک چھوٹے سے کمرے میں تھا۔ وہاں ایک گارڈ

ہمیشہ موجود رہتا تھا۔ تیمور وہاں کھڑا رہتا۔ ایسے موقعوں پر وہ انجکشن کے زیر اثر ہوتا۔ اسے کچھ ایسی دوائیں بھی دی جا رہی تھیں جو ابھی تجرباتی مراحل میں تھیں۔ ان کی وجہ سے اپنے ذہن پر اس کا اختیار بالکل نہیں ہوتا تھا۔ کچھ نہیں ہوتا تو تھکن' بے آرامی اور نیند سے محرومی تو بہرحال ہوتی ہی تھی۔

تیمور نے دھیرے دھیرے کہنا شروع کیا "میں ۲۳ مارچ کو اسلام آباد پہنچا۔ وہاں مجھے جاسوسی اور تخریب کاری کے سلسلے میں ہدایات دی گئیں۔ ہمارا مقصد کشمیر کو بھارت کی گرفت سے آزاد کرانا ہے۔ اسی سلسلے میں عمل کرنے کے لئے میں کشمیر میں داخل ہوا.........."

"ہاں .... بولتے رہو۔ اور سنو' میری طرف دیکھتے ہوئے بولو۔ یاد رکھو کہ عدالت میں بیان دیتے ہوئے بھی تمہیں میری طرف دیکھتے رہنا ہے۔"

"میں نے ایک اسمگلر سے رابطہ کیا۔ اس نے پانچ ہزار روپے لئے اور آٹے کی بوریوں کے درمیان مجھے ٹرک کے ذریعے کشمیر لے آیا۔ وہاں ٹرک کی تلاشی لی گئی اور یوں پولیس نے مجھے گرفتار کرلیا۔ میں جس مقصد کے لئے آیا تھا' وہ پورا نہیں ہو سکا۔"

گرو داس نے اپنا گنجا سر ہلایا' اپنے سامنے رکھے کاغذات پر نظر ڈالی اور بولا "اب پروسیکیوٹر کی طرف سے تم سے ایک سوال کیا جاتا ہے۔ غور سے سنو اور جواب دو۔ تمہیں اس مشن پر کس نے بھیجا تھا؟"

یہ سوال اشارہ تھا جس کے جواب میں تیمور روانی سے شروع ہو گیا۔ "آرمی ہیڈ کوارٹر اسلام آباد کے انٹیلی جنس سیکشن جی ٹو نے۔ بیرونی ممالک میں پاکستانی سفارت خانے جی ٹو کے تعاون سے ہی کام کرتے ہیں۔ مجھے یہاں جس کام سے بھیجا گیا تھا' وہ تھا یہاں اہم اور حساس نوعیت کے سرکاری راز معلوم کرنا۔ کامیابی کے بعد مجھے بھارت میں پاکستانی سفارت خانے سے رابطہ کرنا تھا۔ وہاں سے مجھے تخریب کاری کے سلسلے میں مزید ہدایات دی جاتیں۔

"مجھے جس شخص کے ذریعے انٹیلی جنس میں بھرتی کیا گیا' اس کا نام میجر عمر جاوید ہے۔ وہ پیرس سے شائع ہونے والے روزنامہ انقلاب کا ایڈیٹر انچیف ہے۔ وہ انٹیلی جنس میں بھی کام کرچکا ہے اور اس کی.......... اس کی.........."

پروفیسر نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ اس کی نگاہوں میں برہمی تھی "ہاں ہاں.......... آگے چلو نا" اس نے ڈانٹتے ہوئے کہا "تم جانتے ہو کہ کیا کہنا ہے تمہیں؟"

تیمور نے ہچکچاتے ہوئے کہا "اس کی.........." اور پھر کہتے کہتے رک گیا۔ نہ جانے کیا بات تھی۔ وہ جب بھی اس مقام پر پہنچتا تھا تو رک جاتا تھا۔ وہ تسکین کا نام لینا چاہتا.......... ڈاکٹر موہن نیم نے اس پر ثابت کر دیا تھا کہ عمر اور تسکین نے مل کر سازش کی تھی اور اسے کشمیر بھیجا تھا۔ وہ یہ جانتا تھا کہ تسکین مجرم ہے.......... عمر سے بڑھ کر مجرم ہے.......... ڈاکٹر نے دلیل دی تھی کہ تسکین نے اسے متاثر کرنے کے لئے اپنے حسن و شباب کا سہارا لیا تھا۔ اس ترغیب کے بعد وہ کسی طور پر عمر اور تسکین کے جال سے نکل ہی نہیں سکتا تھا۔ اسے برے بھلے کی تمیز نہیں رہی تھی اور وہ ان کے بتائے ہوئے راستے پر اس حد تک بڑھ گیا تھا کہ واپسی کا راستہ بھی نہیں رہا تھا۔

پروفیسر نے تیز لہجے میں کہا۔ "ہاں.......... کیا کہہ رہے تھے تم؟" یہ کہہ کر اس نے تیمور کو پوری قوت سے ایک تھپڑ مارا۔

تھپڑوں سے تیمور کو جسمانی نہیں' روحانی تکلیف پہنچتی تھی۔ درحقیقت وہ پوری سچائی سے اعترافِ جرم کرنا چاہتا تھا۔ پورا بیان سنانے کے بعد وہ خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کرتا تھا۔ اعترافِ اس کے لئے باعث سکون تھا۔ اسے اپنے کئے پر شرمندگی تھی۔ اس نے منہ کھولا اور بولنے کی کوشش کی لیکن اس کی آواز نہیں نکلی۔

پروفیسر گرو داس نے گارڈ سے اپنی زبان میں کچھ کہا۔ گارڈ کارنر میں رکھی ہوئی بالٹی کی طرف بڑھا اور ڈیسک پر رکھا ہوا بید اٹھا کر اس سے بالٹی کو پیٹنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی تیمور کے حلق سے لایعنی چیخیں نکلنے لگیں۔ اس نے دونوں کانوں میں انگلیاں ٹھونس لی تھیں اور یوں پاؤں پٹخ رہا تھا جیسے کسی شدید ترین اذیت سے دوچار ہو۔ چند لمحے بعد اس کی چیخوں کے ٹوٹے پھوٹے الفاظ سمجھ میں آنے لگے' وہ کہہ رہا تھا "نہیں.......... نہیں میں یہ برداشت نہیں کر سکتا۔ یہ ظلم مت کرو میرے ساتھ۔ میں تو خود اعتراف کرنا چاہتا ہوں اپنے جرائم کا۔ میں پھانسی چڑھ جانا چاہتا ہوں۔ نہیں کرو.......... نہیں کرو.......... پلیز.......... ہاں' مجھے یاد آگیا.........."

بالٹی پیٹے جانے کا شور تھما تو تیمور کی حالت غیر ہو چکی تھی۔ وہ یوں کانپ رہا تھا

جیسے اس پر لرزہ چڑھ گیا ہو۔ چہرے کے نقوش بگڑ چکے تھے۔ دانتوں سے کاٹے جانے کے باعث ہونٹوں سے خون بہہ رہا تھا۔ اس کے دماغ میں مرتعش خوف کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔

پروفیسر اس کے پُرسکون ہونے کا منتظر تھا۔ پھر اس نے کہا "ہاں......... اب شروع ہو جاؤ۔ وہاں سے......... مجھے جس شخص کے ذریعے.........."

"مجھے جس شخص کے ذریعے انٹیلی جنس میں بھرتی کیا گیا' اس کا نام میجر عمر جاوید ہے۔ وہ پیرس سے شائع ہونے والے روزنامہ انقلاب کا ایڈیٹر انچیف ہے۔ وہ انٹیلی جنس میں بھی کام کر چکا ہے۔ اس کی بیوی تسکین سابقہ' مشرقی پاکستان میں تحریک مزاحمت میں شامل رہ چکی ہے۔ اب بھی وہ انٹیلی جنس کے لئے کام کرتی ہے اور لوگوں کو انٹیلی جنس میں بھرتی کراتی ہے۔" اس کے بعد تیمور نے اپنے جرائم کا بیان شروع کر دیا۔ اسی کے ساتھ اسے لگا کہ اس کے دماغ و دل پر سے کوئی بوجھ ہٹ گیا ہے اور اس کی روح ہلکی پھلکی ہو گئی ہے۔ ہمیشہ ایسا ہی ہوتا تھا۔

سچ تو یہ تھا کہ وہ اس انجام تک پہنچنے کے لئے تڑپ رہا تھا جو اس کے لیے طے کر دیا گیا تھا۔ یہ ڈاکٹر موہن مہیم کے نقطۂ نظر سے ایک انقلابی تجربہ تھا جو حیرت انگیز حد تک کامیابی سے ہم کنار ہوا تھا۔ اس کی یہ تھیوری درست ثابت ہو گئی تھی کہ ہیپناٹک ترغیبات کے ذریعے یہ ممکن ہے کہ آدمی پھانسی کے ذریعے موت کے تصور سے خوف زدہ ہونے کے بجائے اس سے محبت کرے۔ اسے اپنی نجات کا ذریعہ سمجھے۔

ڈاکٹر موہن اپنی رائے کے مطابق برا آدمی نہیں تھا۔ اس نے تیمور کے ساتھ جو کچھ کیا تھا' اپنی سائنٹیفک دلچسپی سے قطع نظر وہ اسے ایک رحم دلانہ عمل قرار دیتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ مہذب ملکوں میں سزائے موت کے مجرم کو سزا پر عمل درآمد سے پہلے مسلسل مسکن دواؤں کے زیر اثر رکھ کر ان پر رحم کیا جاتا تھا تاکہ موت کی دہشت ان کے لئے اذیت ناک نہ ہو۔ اس اعتبار سے ڈاکٹر موہن کے نزدیک یہ بہت بڑی کامیابی تھی کہ اس نے سزائے موت کے مجرم کے لئے سزا کو دلکش اور ذریعہ نجات بنا دیا تھا۔ اسے پھانسی کے تختے پر کھڑے ہونے کے تصور سے لذت ملتی تھی۔ وہ اس لمحے کا بے چینی سے منتظر تھا۔ تڑپ رہا تھا کہ وہ جلد سے جلد آ جائے۔

ایک موقعے پر جب تیمور کاؤچ پر دراز آرام کر رہا تھا اور اس کا ذہن غنودگی کی کیفیت میں تھا' ایسے میں ڈاکٹر موہن نے اس سے کہا "لوگ یہ بات سمجھتے نہیں کہ پھانسی پانا موت کا آسان ترین اور سب سے کم سفاک روپ ہے۔ ویسے بھی موت انسان کو ابدی سکون کی طرف لے جاتی ہے۔ آدمی بہت سرعت سے' بغیر کسی اذیت سے گزرے ابدی سکون کی وادی میں اتر جاتا ہے۔ بس پیروں کے نیچے سے تختہ سرکنے کی دیر ہوتی" اس نے کچھ توقف کیا اور پھر اضافہ کیا "تم پھانسی کے تختے پر پہنچو گے تو تمہیں احساس ہو گا کہ تمہیں آلام اور مصائب سے چھٹکارا ملنے والا ہے۔ تمہاری روح آزاد ہونے والی ہے۔ اس وقت تم موت کی لذت سے صرف ایک قدم کے فاصلے پر ہو گے۔ موت جو تمہیں ہر ذمے داری سے آزاد کرا دے گی۔ ابھی شاید تم میری بات نہیں سمجھے ہو۔ سمجھو گے تو تم اس لمحے کے حصول کے لئے بے صبرے ہو جاؤ گے جو تمہیں ابدی سکون سے ہم کنار کرنے والا ہے۔ تم اس کے لئے ایسے تڑپو گے جیسے کوئی مہجور عاشق اپنی محبوبہ سے ملنے کے لئے تڑپتا ہے۔"

ڈاکٹر موہن نے درست کہا تھا۔ بالٹی کے دہشت زدہ کر دینے والے مرحلے سے گزر کر تیمور جب بھی اپنی حد بے روشن کوٹھری میں پہنچتا تو اسے موت بے حد مہربان شے لگتی۔ اس کا بس چلتا تو وہ اڑ کر پھانسی کے تختے پر پہنچ جاتا۔

اب وہ موت کے انتظار میں ایک ایک لمحہ گن رہا تھا!

☆=============☆=============☆

اسلام آباد ائر پورٹ پر اترتے ہی تسکین نے پرل کانٹی نینٹل کا رخ کیا۔ اس نے فون کر کے عمر کو اپنے خیریت سے پہنچنے کی اطلاع دی۔ اپنا سامان ہوٹل کے کمرے میں رکھنے اور نہا کر تازہ دم ہو کر وہ استقبالیہ پر آئی۔ وہاں اس نے اپنا پریس کارڈ دکھانے کے بعد تیمور کے متعلق معلومات کیں۔ کلرک نے بتایا کہ تیمور کا سامان ہوٹل کے لاکر میں رکھ دیا گیا۔ تسکین نے اسے ہدایت کی کہ تیمور حسین کا سامان اس کے کمرے میں رکھوا دیا جائے۔

ہوٹل سے باہر آ کر اس نے ایک ریسٹورنٹ میں کھانا کھایا پھر وہ یونہی روز گارڈن کی طرف چلی گئی۔ کچھ دیر وہ وہاں بیٹھی تیمور کے متعلق سوچتی رہی۔ تیمور کے متعلق

سوچتے ہوئے اس کے جذبات عجیب ہو جاتے تھے۔ آخری ملاقات میں تیمور نے جو کچھ کیا تھا' اس کے متعلق یاد کرنا اسے برا نہیں لگتا تھا۔ البتہ وہ محجوب ضرور ہو جاتی تھی۔ ایک اور بات یہ تھی کہ وہ اس کے لئے اپنے دل میں مامتا جیسا کوئی جذبہ محسوس کرتی تھی۔ اس کا سراپا اس کی نگاہوں میں پھر جاتا تھا۔ وہ زندگی سے معمور شخص جو ناقابل تسخیر معلوم ہوتا تھا۔ اب یقین نہیں آتا تھا کہ بھارتیوں کے مظالم نے اس کی مزاحمت کو توڑ ڈالا ہے لیکن یہ سچ ہی تھا۔ ایسا نہ ہوتا تو وہ اسے کھلی عدالت میں لانے کی ہمت نہ کرتے۔ یعنی وہ سچ مچ ٹوٹ گیا تھا۔ مگر یہ خیال بے حد اذیت دہ تھا.......... جیسے بڑے اہتمام سے تراشا ہوا کوئی بت ٹوٹ جائے۔ وہ دکھی ہو گئی۔

وہ ہوٹل واپس پہنچی تو تیمور کا سامان اس کے کمرے میں پہنچایا جا چکا تھا۔ سامان کچھ زیادہ نہیں تھا۔ تیمور کا پورٹیبل ٹائپ رائٹر تھا' ایک چھوٹا اٹیچی کیس تھا' رین کوٹ تھا اور اس کا بریف کیس تھا۔ اس کے کاغذات میں کوئی ایسی چیز نہیں تھی جس سے کچھ مدد ملتی۔ پھر بھی تسکین نے اس کے بریف کیس کو اچھی طرح ٹٹولا کہ ممکن ہے' اس نے کوئی نوٹ چھوڑا ہو لیکن اس میں تیمور کی ایک نئی' مختصر کہانی کے چند صفحات اور ایک کہانی کے خاکے کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ مقبوضہ کشمیر کے متعلق نوٹس بھی نہیں تھے جس سے پتا چلتا کہ تیمور نے پہلے مقبوضہ کشمیر کے متعلق جغرافیائی نوعیت کی معلومات جمع کی ہوں۔ اس سے ثابت ہوتا تھا کہ تیمور نے اسلام آباد پہنچنے سے پہلے ہی کشمیر جانے کا تہیہ کر لیا تھا۔

تیمور کا سامان دیکھ کر اسے عجیب سا لگا تھا۔ یہ سامان اس نے ریو ماریبوف پر کھڑی تیمور کی کار کی ڈگی میں رکھا دیکھا تھا.......... اس روز جب تیمور پیرس سے رخصت ہوا تھا اس بات کو اب ایک ماہ سے زیادہ ہو گیا تھا۔ اس سامان کو دیکھ کر تسکین کو طمانیت کا احساس ہوا۔ جیسے وہ اس سامان کو اپنے پاس رکھے گی تو حالات اور واقعات کچھ اس طرح کروٹ لیں گے کہ کسی بھی لمحے تیمور پاؤں پٹختا ہوا آ جائے گا اور کہے گا.......... یہ میرا سامان کیوں رکھا ہے تمہارے پاس۔ ادھر لاؤ۔

رات کافی دیر ہو چکی تھی لیکن تسکین اب بھی سونے کے لئے نہیں لیٹی۔ اس نے اپنی سہیلی شبانہ کو فون کیا۔ وہ مشرقی پاکستان میں تحریک مزاحمت میں اس کی ساتھی رہی

تھی۔ اب وہ اعلیٰ سطح کے ایک سرکاری افسر کی بیوی تھی۔ اس سے پہلے وہ خود بھی سیکریٹریٹ میں ملازمت کرتی رہی تھی۔

"شبانہ .... میں چند روز کے لئے یہاں آئی ہوں" تسکین نے رابطہ ملنے کے بعد کہا۔ "تم سے ملنا چاہتی ہوں۔"

"کل بارہ بجے آ جاؤ" دوسری طرف سے شبانہ نے کہا "میرا پتہ تو ہے تمہارے پاس؟"

"ہاں ہے اور مجھے پہنچنے میں کوئی دشواری بھی نہیں ہو گی۔"

☆============☆============☆

اگلے روز بارہ بجے تسکین 'شبانہ کے گھر پہنچی۔ شبانہ گھر میں اکیلی تھی۔ پہلے تو دونوں پچھلے دنوں کی یادیں تازہ کرتی رہیں پھر تسکین نے شبانہ کو تفصیل سے سب کچھ بتایا۔ "ہم خواجہ مقصود کے اس سیکریٹری کے متعلق زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں جو اس کے ساتھ آیا تھا۔"

"لیکن تسکین' یہ تو اس وقت کی بات ہے جب میں اور تم پیدا بھی نہیں ہوئی تھیں۔" شبانہ نے کہا۔

"یہ میں بھی جانتی ہوں" تسکین نے بڑے تحمل سے کہا "لیکن معاملہ بہت اہم ہے۔ اس پر تیمور کی زندگی اور موت کا انحصار ہے۔ ہمیں کم از کم سیکریٹری کا نام معلوم کرنا ہے۔"

"لیکن کیسے؟"

"ظاہر ہے کہ کوئی پرانا آدمی.......... سرکاری افسر ہی اس سلسلے میں ہماری مدد کر سکتا ہے۔"

"ایسے لوگوں میں سے کسی کے زندہ ہونے کا امکان کم ہی ہے" شبانہ نے پُرخیال لہجے میں کہا "یہ چوالیس سال پرانی بات ہے۔"

"لیکن ہمارے لئے یہ موہوم سا امکان بھی نہ ہونے کے برابر ہے کہ تمہارا مطلوبہ سیکریٹری زندہ ہو۔"

"تم کتنی بے رحمی سے بات کر رہی ہو" تسکین نے ملامت بھرے لہجے میں کہا۔

"بے رحمی نہیں، یہ حقیقت پسندی ہے۔" شبانہ نے نرم لہجے میں کہا "مجھے تو تم پر حیرت ہے میں اور تم ۷۰ء میں مشرقی پاکستان میں جن حالات سے گزرے ہیں، اس کے بعد ہمارا حقیقت پسند ہو جانا کوئی حیرت کی بات نہیں۔"

"شبانہ پلیز۔ مثبت انداز میں سوچو۔ مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔"

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کس طرح.........." یہ کہتے کہتے شبانہ اچانک رک گئی۔ اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ "دیکھو......... مجھے ایک صاحب کا خیال آیا ہے۔ میں نے جب نئی ملازمت کی تو محکمہ خارجہ میں ایک افسر تھے۔ وہ ابھی حیات ہیں۔ انہیں ریٹائر ہوئے سولہ سال ہو چکے ہیں۔ ہاں......... یاد آیا نعمان صاحب۔ ان سے مل دیکھتے ہیں۔"

"تو چلو۔"

"اس وقت؟"

"مجھے تم پر حیرت ہے شبانہ۔ تمہارے نزدیک زندگی اور موت کے مسئلے کی کوئی اہمیت نہیں!" تسکین نے پھر ملامت کی۔

"اچھا بابا......... چلو" شبانہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

☆============☆============☆

نعمان صاحب کی عمر ستر سے کچھ اوپر ہو گی لیکن عمر کے اعتبار سے ان کی یادداشت قابل رشک تھی۔ ریٹائرڈ سرکاری افسروں کو اپنے کیریئر کے متعلق باتیں کرنا یوں بھی بہت اچھا لگتا ہے۔

خواجہ مقصود کے متعلق انہیں فوراً ہی یاد آ گیا "ارے......... وہ بھی کوئی بھولنے والی بات ہے۔" وہ بولے "اس وقت تو ایسا لگتا تھا کہ کشمیر ہمارا ہو گیا۔ امریکی مداخلت نہ ہوتی تو کشمیر پر ہمارا قبضہ ہوتا۔"

"میں خواجہ مقصود کے متعلق پوچھ رہی تھی" تسکین نے اسے یاد دلایا۔

"سب جانتے تھے کہ وہ ابن الوقت ہے" نعمان صاحب نے کہا "اس نے دیکھا کہ کشمیر پاکستان کا ہونے والا ہے تو چپکے سے اس طرف نکل آیا۔ ان دنوں وہ کمیونسٹ تحریک سے متعلق تھا۔ یہاں آ کر وہ اس سے تائب ہو گیا۔ مجھے اپنے باس......... اس

وقت کے سیکریٹری خارجہ امور سے اس کی گفتگو سے اندازہ ہوا تھا کہ وہ دستاویزات کی صورت میں بھارت کے کچھ اہم راز ساتھ لایا تھا۔ انہی کی بنیاد پر وہ مستقبل کی کشمیری حکومت میں وزارت طلب کر رہا تھا۔ مذاکرات چل رہے تھے کہ کشمیر میں اچانک جنگ بندی ہو گئی۔ اقوام متحدہ کے مبصر تعینات کئے گئے۔ خواجہ کی تو ہوا بگڑ گئی......... وہ فوراً ہی یہاں سے لندن نکل گیا........."

"لیکن کیوں؟" تسکین نے اعتراض کیا "وہ کشمیر واپس بھی تو جا سکتا تھا؟"

"کیسے جا سکتا تھا۔ اس کا سیکریٹری ان دستاویزات کے بریف کیس سمیت غائب ہو گیا تھا جن کے زور پر وہ یہاں اپنی پوزیشن بنا رہا تھا۔"

تسکین کا دل یوں دھڑکا جیسے حلق میں آ گیا ہو "سیکریٹری کہاں گیا.........؟"

"اس کے سوا کوئی امکان نہیں تھا کہ کشمیر واپس چلا گیا ہو گا" نعمان صاحب نے بتایا "وہ کٹر بائیں بازو کا آدمی تھا۔ دوسری طرف خواجہ جوڑ توڑ والا آدمی تھا۔ خواجہ نے لندن جا کر اپنی غیر حاضری کا جواز بنایا۔ پھر روسیوں سے بات کی۔ وہ سیکریٹری سے خائف تھا کہ اس کے پاس اس کی غداری اور ابن الوقتی کا ثبوت ہے۔ اس نے روسیوں کو سیکریٹری کے خلاف خوب بھرا۔ پھر وہ برطانوی اور روسی آشیرواد حاصل کرنے کے بعد بھارت واپس گیا۔ وہاں اسے فوراً ہی عہدہ مل گیا۔ سنا ہے کہ سیکریٹری گھبرا کر آہنی پردے کی طرف بھاگا۔ وہ شاید ہنگری گیا تھا مگر وہاں پہلے ہی خواجہ اس کی پوزیشن خراب کر چکا تھا اسے گھیرنے کی کوشش کی گئی تو وہ بھاگا۔ سنا ہے کہ آسٹریا چلا گیا تھا۔ اس کے بعد اس کا کوئی سراغ نہیں ملا۔"

"سیکریٹری کے متعلق مجھے بتائیں آپ۔ کبھی اس سے ملاقات ہوئی تھی آپ کی؟" تسکین نے پوچھا۔

"ملاقات تو نہیں ہوئی۔ دو تین بار دیکھا تھا۔ بے حد دبلا پتلا آدمی تھا۔ قد چھوٹا تھا۔ مگر دبلے پن کی وجہ سے اتنا چھوٹا نہیں لگتا تھا۔ عام سا آدمی تھا۔ مجھے بس اس کی آنکھیں خصوصیت سے یاد ہیں۔ بڑی اداس آنکھیں تھیں اس کی۔ انداز میں انکساری تھی۔"

"نام اس کا؟"

"نام.........." نعمان صاحب نے دہرایا۔ کچھ سوچتے رہے پھر بے بسی سے بولے "عجیب بات ہے۔ زبان پر آتے آتے غائب ہو جاتا ہے" انہوں نے انگلی سے سر تھپتھپایا۔ "یہاں گردش کر رہا ہے لیکن گرفت میں نہیں آتا۔"

"پلیز.......... یاد کرنے کی کوشش کیجئے" تسکین نے اصرار کیا۔

وہ سوچتے رہے پھر بے بسی سے سر ہلا کر بولے "یاد ضرور آئے گا لیکن اس وقت نہیں۔ یاد آئے گا تو میں آپ کو بتا دوں گا۔"

تسکین اور شبانہ اٹھنے لگیں۔ "نام یاد آجائے تو شبانہ کو فون کر کے بتا دیجئے گا" تسکین نے کہا "پلیز.......... یہ سمجھ لیں کہ یہ ایک انسان کی زندگی اور موت کا سوال ہے۔"

"آپ بے فکر رہیں بی بی۔"

☆=============☆=============☆

ڈیڈ لیپ ہام کو عمر اپنے آفس میں بیٹھا ملا۔ اس کی ٹھوڑی سینے پر جھکی ہوئی تھی اور وہ خلا میں گھور رہا تھا۔ اس نے ڈیڈ کے قدموں کی آہٹ سنی تو چونکا۔ اس کا ہاتھ بے اختیار اپنے حلق پر چلا گیا۔ وہ بیٹا تیمور کے متعلق سوچ رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ عنقریب تیمور کو پھانسی دے دی جائے گی۔ وہ تصور میں زندگی اور توانائیوں سے معمور اس کے جسم کو اینٹھتے پھڑکتے دیکھ رہا تھا پھر اس نے اسے پھندے سے لٹکتے ہوئے دیکھا۔ اس کا سر ایک جانب ڈھلکا ہوا تھا۔ وہ کسی بہت بڑے گڈے کی طرح لگ رہا تھا جس کی گردن ٹوٹ گئی ہو۔

ڈیڈ نے کہا "یہ تم کیا کر رہے ہو اپنے ساتھ۔ تسکین کی خیر خبر معلوم ہوئی؟"

"بس ڈیڈ، پہلے فون کے بعد سے اب تک اس نے رابطہ نہیں کیا" عمر نے جواب دیا۔ "مجھے ڈر لگ رہا ہے ڈیڈ۔ کہیں وہ کشمیر نہ چلی جائے۔"

"ڈیڈ نے چونک اسے دیکھا "کشمیر کیوں جائے گی وہ؟"

"اس کے نزدیک ہونے کے لئے۔"

"مذاق کر رہے ہو؟"

عمر اٹھا اور ادھر ادھر ٹہلنے لگا "کاش یہ مذاق ہی ہوتا۔ ڈیڈ، میں سوچ سوچ کر پاگل

ہوا جا رہا ہوں۔ میں نہ اندھا ہوں، نہ بہرا۔ پورا آفس جانتا ہے کہ تیمور، تسکین کے لئے پاگل ہوا جا رہا تھا۔"

"یہ تو ٹھیک ہے" ڈیڈ نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا "لیکن اس سے تسکین کا کیا تعلق؟"

عمر نے خود کلامی کے انداز میں وہ بات کہی جو وہ پچھلے ایک مہینے میں اکثر سوچتا رہا تھا اور کسی سے کہہ نہیں سکا تھا "اگر تیمور کو پھانسی ہو گئی تو تسکین مجھے کبھی معاف نہیں کرے گی۔ یہ بات میں اس کی آنکھوں میں پڑھ چکا ہوں۔ میں تیمور کو پاکستان بھیج رہا تھا تو تسکین نے مخالفت کی تھی۔ اس نے مجھے خبردار کیا تھا.........."

"تو پھر تم نے تیمور کو پاکستان کیوں بھیجا؟" ڈیڈ نے نرم لہجے میں پوچھا۔

"شاید تسکین سے دور کرنے کے لئے۔"

ڈیڈ نے سیٹی بجانے والے انداز میں ہونٹ سکیڑے "تمہیں اس احمقانہ بات پر یقین ہے؟" اس نے پوچھا۔

عمر نے ڈیڈ کو بہت غور سے دیکھا "اس سے کیا فرق پڑتا ہے ڈیڈ۔ وقت بہت تیزی سے ہمارے ہاتھوں سے پھسلا جا رہا ہے۔ تیمور کا خاتمہ بہت کچھ ختم کر دے گا۔ میرا خیال ہے، ہمارا اخبار بھی ختم ہو جائے گا۔ اسی لئے تو میں اسے چھڑانے کی احمقانہ اسکیمیں بناتا ہوں جن کی عملاً کامیابی کا کوئی امکان نہیں ہوتا.........."

"سنو بیٹے، تم احمقانہ گفتگو کر رہے ہو جبکہ میں نے تمہارے منہ سے اس طرح کی گفتگو کبھی نہیں سنی" ڈیڈ نے کہا "تم اس فیلڈ میں طویل عرصے سے ہو اور جانتے ہو کہ دو طرح کے لوگ مل کر ایک کامیاب اخبار نکال سکتے ہیں۔ ذہانت اور تجربہ بتاتا ہے کہ کون سا معمولی سا واقعہ ایک بہت بڑی اسٹوری بن سکتا ہے۔ ان کے پاس حس ہوتی ہے ایڈیٹر کی، اور دوسرے وہ ہوتے ہیں جو فیلڈ میں جاتے ہیں، حقائق اکٹھے کرتے ہیں اور اسٹوری مرتب کرتے ہیں ممکن ہے، اس معاملے میں ہم سے کوتاہیاں ہوئی ہوں۔ ہم اس سیکریٹری کے متعلق ضروری معلومات جمع نہیں کر سکے۔ اس معاملے میں، میں ہمیشہ بے یقینی ظاہر کرتا رہا لیکن بیٹے، اب میں کہہ رہا ہوں۔ یہ کوئی موہوم امید یا بہلاوا نہیں۔ یہ واضح اور قوی امکان ہے اور یہ بھی سن لو کہ تسکین کو اسلام آباد سے اہم معلومات حاصل

ہو سکتی ہیں۔ یاد رکھو، وہ............"

اسی وقت فون کی گھنٹی بجی۔ عمر نے ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف سے آپریٹر نے کہا "ماموزیل تسکین عمر اسلام آباد سے بات کرنا چاہتی ہیں............ موسیو عمر جاوید سے۔"

عمر کا ریسیور والا ہاتھ ہلکے سے کانپا "میں عمر جاوید بول رہا ہوں" اس نے ماؤتھ پیس میں کہا۔ پھر اس نے ڈیڈ سے کہا "جانا نہیں ڈیڈ۔ یہ تسکین کی کال ہے۔ ممکن ہے، کام کی معلومات حاصل ہو گئی ہوں۔"

ذرا دیر بعد ریسیور پر تسکین کی ہیجانی آواز ابھری۔ اس نے لفظ ضائع کیے بغیر کہا "عمر............ تمہاری بات درست نکلی۔ سیکریٹری کا وجود ہے۔ لکھو............ اس کا نام جبار شاہ۔ تم نے اسے اختراع کہا تھا لیکن وہ سچ مچ موجود ہے۔ اس کی بیوی کا نام گلنار ہے۔ اس کی ایک بیٹی بھی تھی............ عائشہ۔ عائشہ اس وقت پانچ سال کی تھی۔ عمر............ اب کچھ ہو سکتا ہے.........؟"

"کیوں نہیں ہو سکتا" عمر ماؤتھ پیس میں چلایا "ظاہر ہے، ہم پوری کوشش کریں گے۔ جان لڑا دیں گے ہم۔ تم اسلام آباد میں ہی رہو۔ کوئی بات بنی تو تمہاری موجودگی کام آئے گی۔"

"بات بنی چاہیئے عمر، جبار شاہ کو ڈھونڈو۔"

"تم حوصلہ نہ ہارنا تسکین۔ ہم کوئی کمی نہیں چھوڑیں گے اس کی تلاش میں۔ تم اور معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرو۔ جیسے ہی کچھ معلوم ہو گا، میں تمہیں فون کروں گا۔ اچھا خدا حافظ۔"

ڈیڈ اسے بہت غور سے دیکھ رہا تھا "تم بھی بڑے اذیت پسند ہو عمر۔" وہ بولا "اگر ہم تیمور کو چھڑانے میں کامیاب ہو گئے تو سب سے پہلے تسکین ہی اس ہیرو سے ملے گی۔"

عمر، ڈیڈ کا بڑا لحاظ کرتا تھا۔ وہ اس پر غصہ نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے بڑے تحمل سے کہا "اس سے کسی طور بھی کوئی فرق نہیں پڑتا ڈیڈ۔ اور پھر تسکین اس کی حقدار ہے۔ اس معاملے میں ذہانت اور اعصاب کا مظاہرہ ایک اسی نے تو کیا ہے۔ اصولاً تو مجھے

پہلے ہی کسی کو اسلام آباد بھیج دینا چاہیئے تھا۔ میں تو تیمور کی آمد سے لے کر آخر تک ہر اعتبار سے ناکام رہا ہوں............ ٹوٹل فلاپ۔" وہ چند لمحے سوچتا رہا، پھر بولا "اب میں خود بھی سڑکوں پر نکل جاؤں گا اور اسے ڈھونڈ کر رہوں گا۔ میں............"

ڈیڈ مسکرایا "نہیں عمر، تم ایسا نہیں کرو گے۔ تم ایڈیٹر ہو۔ رپورٹر کو ٹانگوں والا کیوں کہا جاتا ہے۔ اس لئے کہ وہ اپنی روزی اپنی ٹانگوں کی مدد سے کماتا ہے............ مارا مارا پھر کے۔ تم فکر نہ کرو۔ میں کاپی ڈیسک کا بوجھ بھی اٹھالوں گا۔ ہم ہر آدمی کو اس کام پر لگا دیں گے لیکن یہاں کسی بھی وقت تمہاری ضرورت پڑ سکتی ہے۔ تمہارا کام کوئی نہیں کر سکتا۔ تسکین موجود ہوتی تو اور بات ہوتی۔ تم خود کو سنبھالو عمر۔ یہ نہ بھولو کہ ایڈیٹر کا کیا کام ہے۔ وہ جہاز کا ناخدا ہوتا ہے............"

☆============☆============☆

نیلو فر کے لئے تیمور پر مقدمہ چلائے جانے کی المناک خبر ایک دھماکے سے کم نہیں تھی۔ وہ سن ہو کر رہ گئی تھی۔ اب تیمور کی بچت کا کوئی امکان نہیں رہا۔ یہ وہ وقت تھا کہ نہ اسے خود ترسی کی خواہش تھی اور نہ ہی وہ اس میں وقت ضائع کر سکتی تھی لیکن وہ کر بھی کیا سکتی تھی!

وہ پہلے ہی دن سے اس کی محبت میں گرفتار ہو کر خود پر سے ہر اختیار کھو بیٹھی تھی۔ اسے یہ یقین ایک لمحے کے لئے بھی نہیں رہا تھا کہ تیمور کو اس کی کوئی پروا ہے۔ اس کے حصے میں تو بس یونہی ایک رات کی قربت اور ایک تتلی جیسا لمحہ آیا تھا۔ جو اس کے ہونٹوں پر اپنے پروں کے رنگ چھوڑ کر اڑ گیا تھا۔ یا پھر ادارتی کمرے کے باہر اس سے وہ الوداعی ملاقات ہوئی تھی۔ اس کے بارے میں وہ جانتی تھی کہ تیمور نے اس کا منہ بند کرنے کے لئے اسے رشوت دی تھی۔

اسے نہ اس بات پر غصہ تھا' نہ افسوس کہ تیمور نے اسے اس طرح استعمال کیا۔ بلکہ وہ تو تیمور کو سراہتی تھی کہ وہ اپنا ارادہ بالآخر پورا کرتا تھا۔ خواہ اس کی کچھ بھی قیمت ادا کرنی پڑے۔ وہ اپنے راستے میں کسی رکاوٹ کو برداشت نہیں کرتا تھا۔ مردوں کو ایسا ہی ہونا چاہئے۔

اب دو متضاد جذبے اسے کچل رہے تھے۔ ایک تو تیمور کی محبت۔ اس کے جسم کا روم روم اس کے لئے تڑپ رہا تھا۔ اس کی آغوش محبت کی وہ گرمی جس میں آدمی خود کو کھو بیٹھے' بھول جائے۔ اس کی مسکراہٹ' اس کی آواز اور اس کی ہٹ دھرمی یاد آتی جس میں اس کے لئے بڑی کشش تھی۔ ایک طرف تو یہ تھا۔ دوسری طرف وہ خود کو الزام دیتی تھی کہ وہ اس کے بہلاوے میں کیوں آئی۔ اسی کے نتیجے میں تیمور اتنی بڑی

مصیبت میں پھنسا۔

اس تصادم کے باوجود نیلوفر کا رد عمل نارمل تھا۔ وہ جانتی تھی کہ درحقیقت تیمور کی ابتلا کی وہ ذمے دار ہے۔ ہاں......... وہ اس سلسلے میں کسی سے کچھ کہہ دیتی تو یہ سب کچھ نہ ہوتا۔ وہ محبت میں بچوں کی طرح ناسمجھ نہ ہو گئی ہوتی تو اس وقت وہ لمحہ لمحہ یقینی موت کی طرف نہ بڑھ رہا ہوتا۔ یہ دکھ بھی چھوٹا نہیں تھا۔

وہ چیمپس ایلی سیز سے آگے جو چھوٹا سا' خوب صورت پارک تھا' وہاں چلی گئی۔ وہاں رنگ برنگ لباس پہنے بچے دھوپ میں کھیل رہے تھے۔ نیلوفر ایک بینچ پر اکیلی بیٹھ گئی۔ وہ سوچنے سے گریز کر رہی تھی اور اس امید پر بیٹھی تھی کہ کھیلتے ہوئے بچوں کی ہنسی اور قہقہے اس کے دکھ کو دھیما کر دیں گے۔ بچوں کی اس بھیڑ میں پھیری والے بھی گھوم رہے تھے۔ کچھ غبارے بیچ رہے تھے اور کچھ بچوں کے مطلب کی دوسری چیزیں۔

نیلوفر بری طرح چونکی۔ اسے گرشا نظر آیا تھا۔ وہ گرشا جسے دفتر سے ذلیل کر کے نکالا گیا تھا۔ وہ اسی طرف آ رہا تھا جہاں وہ بیٹھی ہوئی تھی۔

گرشا کے گلے میں ایک ڈوری تھی جس سے بندھی ہوئی ٹرے اس کے سینے پر ٹکی ہوئی تھی۔ ٹرے پر گھر میں بنی ہوئی مٹھائیاں اور چھوٹے کیک رکھے تھے۔ اس کے گلے میں وہی سبز' سرخ اور زرد ہیروں کے ڈیزائن والا مفلر تھا۔ وہ گاہکوں کی جستجو میں ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔

گرشا کو دیکھ کر نیلوفر کے ذہن میں اذیت ناک یادیں جاگ اٹھیں۔ اس نے خود کو آفس میں بیٹھے دیکھا۔ دیو قامت تیمور منحنی گرشا پر جھکا ہوا تھا۔ گرشا خوف زدہ تھا۔ پھر اسے وہ سہ پہر یاد آئی جب بغیر کسی قصور کے گرشا کو ذلیل کر کے دفتر سے نکالا گیا تھا۔

یہ سب یاد کر کے وہ شرمندہ ہو گئی۔ اس نے سوچا' کاش گرشا کی مجھ پر نظر ہی نہ پڑے۔ بلکہ وہ پارک سے جانے کے لئے اٹھنے لگی۔ اسی وقت گرشا نے اسے دیکھ لیا۔ دونوں کی نظریں ملیں گرشا کی آنکھوں میں شناسائی کی چمک ابھری......... اور وہ اس کی طرف چلا آیا۔

ان کے درمیان علیک سلیک ہوئی پھر گرشا نے کہا "پلیز......... ایک کیک کھالو۔ یہ حقیر سا تحفہ ہے میری طرف سے۔ یقین کرو' بہت اچھا کیک ہے......... گھر پر بنایا ہے۔

تمہیں پسند آئے گا۔"

نیلوفر نے اسے خوش کرنے کے لئے کیک لے لیا۔ اسے افسوس ہو رہا تھا کہ بے چارہ گرشا یوں گلی گلی گھوم کر چیزیں بیچنے پر مجبور ہو گیا ہے۔

"میری طرح تم بھی تو نہیں نکال دی گئی ہو؟" گرشا نے پوچھا "مجھے تم ناخوش لگ رہی ہو۔ طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری؟"

نیلوفر نے کہا "نہیں گرشا' میری نوکری برقرار ہے لیکن تمہارے نکلنے کے بعد سے آفس کا حال بہت خراب ہے..........." اتنا کہنے کے بعد اس کا جی چاہا کہ گرشا کو سب کچھ بتا دے۔ تیمور کی ابتلا' عمر کی تحقیقی کوشش' خواجہ مقصود کے سیکریٹری کی تلاش اور یہ کہ اب تیمور اپنے المناک انجام کی طرف بڑھ رہا ہے۔

ایک لمحے اس نے گرشا کی اداس آنکھوں میں دیکھا۔ ان آنکھوں میں تفہیم کی گہرائی جھلک رہی تھی۔ نیلوفر نے اسے سب کچھ کہہ سنایا۔ کئی موقعوں پر تو اس کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔ تاہم اس کے دل کا بوجھ کم ہو گیا۔

گرشا کھڑا بہت غور سے سنتا رہا۔ اس کے چہرے کے تاثر کو نیلوفر کوئی مفہوم نہ دے سکی۔ گرشا نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا مگر فوراً ہی اس کے چہرے پر خوف اور گھبراہٹ کا تاثر ابھر آیا۔ اس نے اپنی ٹرے کے ساتھ کوئی عجیب حرکت کی' دیکھتے ہی دیکھتے ٹرے چھوٹے سے بکس کی صورت اختیار کر گئی۔ کیک اور مٹھائیاں او جھل ہو گئیں۔ اس نے بکس کو گلے سے نکال کر ہاتھوں میں تھام لیا۔ بغیر ایک لفظ کہے وہ پلٹا اور تیز قدموں سے کھیلتے ہوئے بچوں کے درمیان سے گزر کر گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے ایک بار بھی پلٹ کر نہیں دیکھا۔

وہ اس اسرار کے بارے میں سوچتی رہی لیکن اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ البتہ چند لمحے بعد وہ معما خود بخود حل ہو گیا۔

اسے عقب سے بھاری قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ گشتی پولیس کا ایک سپاہی پچھلے گیٹ سے اس کی طرف آتا نظر آیا۔ بات سمجھ میں آ گئی۔ گرشا باوردی پولیس مین کو دیکھ کر ڈر گیا تھا........... اور بھاگ لیا تھا۔

نیلوفر نے سوچا' یہ بھی کوئی زندگی ہے۔ بے چارہ...........!

اسے افسوس ہونے لگا۔ کاش اس نے گرشا سے کہا ہوتا کہ وہ دوبارہ دفتر آئے اور قسمت آزمائی کرے!

☆============☆============☆

یہ اس دن کی صبح کی بات ہے جب پاکستانی جاسوس تیمور حسین کا مقدمہ عدالت میں پیش ہونا تھا۔ جیل میں ایک ماہر فن حجام اور ماشیا تیمور کو عدالت میں پیشی کے لئے تیار کر رہے تھے۔ نگران اعلیٰ کے فرائض پروفیسر گروداس انجام دے رہا تھا۔

تیمور اب ہر اعتبار سے وہی تیمور لگ رہا تھا جو چھ ہفتے پہلے پہلی بار قیدی کی حیثیت سے جیل میں آیا تھا۔ اس کی آنکھوں کے ڈھیلوں میں معمولی سا فرق تھا مگر وہ غور سے' بہت غور سے دیکھنے پر ہی نظر آتا تھا۔

یہ تیاریاں دو رات پہلے سے شروع کی گئی تھیں۔ تیمور کو بغیر کسی مداخلت اور روک ٹوک کے اڑتالیس گھنٹے سونے کا موقع دیا گیا تھا۔ اس کو ڈھنگ سے کھلایا پلایا گیا تھا۔ نتیجہ حیرت انگیز تھا۔ اس کی جلد کی زردی غائب ہو گئی تھی۔ چہرے سے بے آرامی کی تحریر بھی مٹ گئی تھی۔

تیمور کے جسم کی خوب ملائی کی گئی تھی۔ تیل لگا کر مالش کی گئی تھی۔ اس کے بال بڑی نفاست سے تراشے گئے تھے۔ چہرے اور گردن پر برف سے ٹکور کیا گیا تھا۔ اس کا شیو کیا گیا تھا۔ ناخن تراشے گئے تھے۔ پہننے کے لئے اس کے اپنے کپڑے اسے واپس دے دیئے گئے تھے۔ کپڑے دھو کر' استری کئے گئے تھے۔ جوتے چمکا دیئے گئے تھے۔

اس وقت وہ آرام کرسی پر نیم دراز تھا۔ حجام نے اپنے چھوٹے سے سیاہ بیگ میں سے ایک چھوٹا سا جار نکالا۔ جار کے مادے میں انگلیاں ڈبو کر نکالنے کے بعد وہ ان انگلیوں سے تیمور کے رخساروں کا مساج کرنے لگا۔

پروفیسر گروداس نے اسے تجسس نظروں سے دیکھا اور پوچھا "یہ کیا ہے؟"

"یہ جڑی بوٹیوں سے تیار کی ہوئی کریم ہے سرکار" حجام نے جواب دیا "پرانے زمانے میں ایک تھکا دینے والے دن کے بعد ہمارے سورما رخساروں پر رنگ دوڑانے کے لئے اسے لگاتے تھے ابھی دیکھئے گا........... یہ کیسے جلد کی رنگت سے گھل مل جائے گا۔ ایسے کہ شناخت کرنا ممکن نہیں ہوگا۔"

"اوہ.......... بہت خوب۔ تم دونوں پرانے زمانے میں کس کے لئے کام کرتے تھے؟" پروفیسر نے پوچھا۔

"ایک بہت بڑے آدمی کے لئے سرکار" ماشئے نے جواب دیا "مگر اب وہ بھولی بسری بات ہے' اب زمانہ بدل گیا ہے۔ اب فن کی وہ قدر دانی کہاں۔ اب تو اپنا اور بچوں کا پیٹ پالنا بھی بہت بڑا کام ہے۔ مجھے یقین ہے جناب کہ کچہری میں یہ پاکستانی مسلا ٹھیک ٹھاک لگے گا۔ مجھے یاد ہے' راجا جی رات بھر کی عیاشی کے بعد صبح اس سے زیادہ برے حال میں ہوتے تھے" اس نے تیمور کی طرف اشارہ کیا "لیکن گیارہ بجے تک دربار جانے کے لئے تروتازہ ہو جاتے تھے۔"

حجام نے تیمور کو سیدھا ہو کر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور بے رنگ مرہم نماشے کو اس کی آنکھوں کے نیچے بڑی نرمی سے ملنے لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے مرہم جلد کے مسامات میں اتر کر غائب ہو گیا۔ ماشئے نے برف کا چھوٹا سا ٹکڑا لیا اور اس سے اس جگہ ٹکور کرنے لگا جہاں مرہم لگایا گیا تھا۔ ذرا دیر بعد جلد وہاں سے سکڑ گئی اور سفید لگنے لگی۔ اب حجام ادھر ادھر گھوم کر کنگھا کر کے قینچی سے ذرا ذرا نکلے ہوئے بال کاٹنے لگا۔

"اس کریم کا نام سیرے چیکا ہے" ماشئے نے پروفیسر کو بتایا "اب ذرا دیر بعد اس کا کمال دیکھئے گا۔ آپ کو یاد ہے کہ قیدی کی جلد مالش اور ٹکور کے باوجود بے رنگ ہو رہی تھی۔ مردہ لگ رہی تھی۔ اب دیکھئے گا.......... اور یہ بھی کمال ہے کہ جلد کی یہ خوب صورتی اڑتالیس گھنٹے برقرار رہے گی' اس نے اپنی انگلیوں کے کناروں سے بڑے ماہرانہ انداز میں تیمور کے رخساروں کو تھپتھپایا۔ ایسا لگا جیسے وہ کوئی جادو کا عمل ہو۔ فوراً ہی تیمور کے رخساروں پر خون جیسا رنگ دوڑنے لگا۔ یک لخت وہ صحت مند آدمی لگنے لگا۔

اسی لمحے تیمور نے بڑی روانی سے کہنا شروع کیا۔ اس کے انداز میں ذرا سی بھی ہچکچاہٹ نہیں تھی "میں ۲۳ مارچ کو اسلام آباد پہنچا۔ وہاں مجھے جاسوسی اور تخریب کاری کے سلسلے میں ہدایات دی گئیں۔ ہمارا مقصد کشمیر کو بھارت کی گرفت سے آزاد کرانا ہے۔ اس سلسلے میں عمل کرنے کے لئے میں کشمیر میں داخل ہوا۔"

"پروفیسر گرو داس کا چہرہ غصے سے سیاہ پڑ گیا۔ "ابھی نہیں بے وقوف.......... یہاں نہیں" گویا وہ چلایا۔ "یہاں چپ بیٹھے رہو۔"

تیمور نے اسے زخمی نظروں سے دیکھا۔ وہ اس وقت بھی دوا کے زیر اثر تھا۔ اس وقت اسے اپنے اعتراف کے سوا کچھ یاد نہیں تھا۔ "لیکن مجھے بتایا گیا تھا کہ تھپڑ لگتے ہی مجھے اعتراف سنانا چاہئے۔" اس نے فریاد کرنے والے لہجے میں کہا۔ "تم یہی چاہتے ہو نا کہ میں سب کو بتا دوں۔"

پروفیسر نے اپنا سر پیٹ لیا۔ "یہ تمہیں تھپڑ نہیں مارا تھا۔ یہ تھپتھپایا تھا ماشئے نے" وہ غرایا۔ پھر اس نے بڑی تیزی سے خود کو سنبھال لیا۔ "فکر نہ کرو۔ اب تھوڑی دیر بعد تمہیں اعتراف کا موقع ملے گا۔" پھر وہ حجام اور ماشئے کی طرف مڑا "اسے احساس جرم اتنا شدید ہے کہ یہ عدالت میں اعتراف کے لئے بے تاب ہو رہا ہے..........!!" اس نے وضاحت کی۔

"بس اب مجھ سے برداشت نہیں ہوتا" تیمور بڑبڑا رہا تھا "تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ اب بہت جلد.........."

☆============☆============☆

روزنامہ انقلاب' پیرس ایڈیشن کے دفتر کے ادارتی کمرے کی فضا گواہی دے رہی تھی کہ اخبار ایک ہاٹ اسٹوری کے تعاقب میں ہے۔ بیشتر اسٹاف سڑکوں پر جبار شاہ کی تلاش میں مصروف تھا۔ دفتر میں صدیق نے ری رائٹ کرنے کا کام سنبھالا ہوا تھا۔ ڈیڈ لیپ ہام نیوز ایڈیٹر کی حیثیت سے آنے والی پریس کاپیوں پر کام کرنے کے علاوہ تسکین کے حصے کا ادارتی صفحے کا کام نمٹا رہا تھا۔

وقار اور زبیر پولیس کے محکمے اور وزارت داخلہ کے ذریعے مطلوبہ شخص کو تلاش کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اب انہیں معلوم تھا کہ جبار شاہ کے ساتھ اس کی بیوی اور بیٹی بھی تھی لیکن اب تک کی تگ و دو لاحاصل ہی ثابت ہوئی تھی۔

جبار شاہ کی بیوی گلنار اور بیٹی عائشہ باضابطہ طور پر پیرس آئی تھیں۔ ریکارڈ سے ثابت ہو گیا تھا کہ وہ بھارتی پاسپورٹ پر ویزا لگوا کر آئی تھیں۔ وہ ۱۳ اکتوبر ۵۰ء کو اورلی ائرپورٹ پر اتری تھیں۔ انہوں نے فرانسیسی پولیس کا سوال نامہ پر کیا تھا۔ اس میں انہوں نے عارضی پتا درج کیا تھا۔ انہوں نے نیولی کے ایک چھوٹے سے پینشن میں قیام ظاہر کیا تھا۔ ان کے ساتھ کافی سامان بھی تھا مگر بعد میں وہ اپنا سامان وصول کرنے بھی نہیں آئی

تھیں۔ انہوں نے یہ ظاہر کیا تھا کہ وہ تفریح کی غرض سے پیرس آئی ہیں۔

عمر کے اچھے خاصے رابطے تھے۔ ان کی وجہ سے زبیر کو پولیس کے اوریجنل انٹری کارڈ دیکھنے کا موقع مل گیا تھا۔ گلنار شاہ کی عمر اس وقت ۲۶ سال تھی اور عائشہ پانچ سال کی تھی۔ وہ بظاہر صرف چار ہفتے کے قیام کی غرض سے پیرس آئی تھیں۔ فرانسیسی قانون کے مطابق تین ماہ سے زیادہ قیام کی صورت میں انہیں پیش ہو کر ویزا بڑھوانے کے لئے درخواست کرنا تھی۔ مستقل قیام کے لئے انہیں رجسٹریشن اور شناختی کاغذات کے لئے اپلائی کرنا تھا۔

ذرا دیر کے بعد وقار نے عمر کو فون کیا "سوری.......... یہاں نیولی میں معاملہ چوپٹ ہو گیا ہے۔ وہ یہاں آئیں اور ایک ہفتہ قیام کیا۔ لینڈ لیڈی کی بیٹی کو وہ اب تک یاد ہیں۔ اس نے ان کا تفصیلی حلیہ لکھوایا ہے لیکن اس سے فائدہ کچھ نہیں۔ اس بات کو ۴۳ سال ہو چکے ہیں۔ اس نے بتایا کہ گلنار خوش اطوار عورت تھی لیکن خوش نہیں لگتی تھی۔ ان کے ساتھ کوئی مرد نہیں تھا۔ ماں بیٹی باہر نہیں نکلتی تھیں اور یہاں کوئی ان کا دوست بھی نہیں تھا۔ ایک ہفتے کے بعد وہ وہاں سے رخصت ہوئی تو اس نے نیا ایڈریس دیا۔ میں اس پتے پر پہنچا' پتا چلا کہ وہ وہاں پہنچی ہی نہیں۔ اب بتایئے میں کیا کروں؟"

"ٹھیک ہے وقار۔ گڈ ورک۔ یہاں ان دکانوں کی فہرست تیار کی جا رہی ہے' جہاں زیوارت گروی رکھے جاتے ہیں۔ یہ امکان موجود ہے کہ جلد یا بدیر گلنار بیگم نے زیور گروی رکھوا دیا ہوگا۔ تم ایسا کرو' دوبارہ پینشن جاؤ اور لینڈ لیڈی کی بیٹی سے ہر طرح کی معلومات نچوڑ لو۔ جو کچھ اسے یاد آئے لکھ لو۔ یہ خاص طور سے پوچھنا کہ عورت میں کوئی ہنر کوئی صلاحیت تھی۔ بعد میں وہی ہنر روزی کا وسیلہ بنا ہو گا۔"

صدیق نے بتایا "فرید نے بھارتی سفارت خانے سے فون کیا ہے.........."

عمر نے وقار کو خدا حافظ کہہ کر صدیق سے ریسیور لے لیا "ہاں فرید.........!"

"باس.......... یہ لوگ کچھ بتانے کو تیار نہیں ہیں" دوسری طرف سے فرید نے بتایا "الٹا یہاں ہلچل مچ گئی ہے۔"

"ہاں.......... میں سمجھ رہا ہوں۔"

"میرا خیال ہے' اب یہ لوگ بھی شاہ فیملی کو اتنی ہی شدت سے تلاش کریں

گے" فرید نے کہا "البتہ ان کے عزائم اور ہوں گے۔ ان کے لئے یہ سنسنی خیز خبر ہے کہ جبار شاہ اور اس کی فیملی کی پیرس میں موجودگی کا امکان ہے۔ میرے خیال میں تو یہ برا ہوا کہ انہیں معلوم ہو گیا ہے۔ اب وہ الٹا مجھ سے معلومات حاصل کرنے کے چکر میں ہیں۔"

"تم نے انہیں کچھ بتایا تو نہیں؟"

"نہیں۔ وہ لوگ اپنی آپس کی باتوں میں نورتن کا تذکرہ کر رہے تھے۔ یہ نورتن انڈین ریسٹورنٹ ہے۔ میرا خیال ہے' وہاں سے معلومات حاصل ہو سکتی ہیں۔"

"یہ بات تو ہے۔ ٹھیک ہے' خدا حافظ۔" عمر نے کہا اور ریسیور رکھ دیا "یہ اور مصیبت ہوئی" وہ بڑبڑایا "خواجہ تو جبار شاہ کو ڈھونڈنے کے لئے کچھ بھی کر سکتا ہے۔ مگر ہم بھی کیا کرتے۔ مجبوری تھی" وہ صدیق کی طرف مڑا "یہ اکبر کہاں ہے؟"

"اس سے ڈیڈ بات کر رہے ہیں.......... ۳۷ نمبر پر۔"

"اس کو میرے انسٹرومنٹ پر سوئچ کر دو۔"

ذرا دیر بعد کال اس کے انسٹرومنٹ پر منتقل کر دی گئی "ہیلو اکبر' نورتن کے متعلق جانتے ہو نا؟"

"جی ہاں۔ ہندوستانی ریسٹورنٹ ہے۔ پیلس ڈی لاباسٹل کے قریب۔ وہاں رش بہت ہوتا ہے۔"

"تم وہاں پہنچو۔ بھارتی سفارت خانے میں کسی نے اس کا تذکرہ کیا تھا۔ وہاں جبار شاہ اور گلنار بیگم کے متعلق بات کرو۔ بلکہ ان کی بیٹی عائشہ کے متعلق معلوم کرو۔ اب تو وہ بھی ۴۸ سال کی ہو گی۔"

"اصولاً تو ہمیں عائشہ کی اولاد کے متعلق پوچھ گچھ کرنی چاہئے۔" دوسری طرف سے اکبر نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"تم جلدی کرو اس لئے کہ بھارتی سفارت خانے والے کسی بھی وقت وہاں پہنچ سکتے ہیں۔"

شام کے قریب سب اپنی رپورٹیں لائے "میں نے لینڈ لیڈی کی بیٹی سے سب کچھ نچوڑ لیا ہے" وقار نے بتایا "لیکن بہت پرانی بات ہے اور پھر گلنار نے وہاں صرف

ایک ہفتے قیام کیا تھا۔ وہ بتا رہی تھی کہ عورت کے پاس پیسے زیادہ نہیں تھے۔ اس نے کوئی خریداری نہیں کی اور وہ بہت محتاط تھی۔ ہاں.......... گلنار کو کھانا پکانے کا بہت شوق تھا۔ ایک دن اس نے بڑے مزے کا کیک بھی بنایا تھا۔ بچی اس وقت بہت چھوٹی تھی۔ وہ انگلش پڑھ اور بول لیتی تھی.......... تھوڑی تھوڑی۔ گلنار جتنے دن وہاں رہی' بہت نروس رہی۔ انہوں نے ایک ہفتے کا کرایہ پیشگی ادا کیا تھا۔ اس کے بعد ان کے پاس زیادہ رقم نہیں بچی تھی۔"

اکبر نے کہا "چیف.......... یقین سے نہیں کہہ سکتا لیکن لگتی ہے کام کی بات۔ البتہ ہم اسے چیک نہیں کرسکتے۔ کم از کم فی الوقت.........."

"منہ سے بولو تو بھائی" عمر نے بے صبرے پن سے کہا "نورتن سے کچھ معلوم ہوا ہے؟"

"نورتن والوں کو تو کچھ معلوم نہیں۔ وہ بتانا بھی نہیں چاہتے۔ مگر میں نورتن کے بڑھے مالک کے پاس پہنچ گیا تھا۔ وہ انڈیا میں باورچی تھا۔ اسے میں نے پبلٹی کا یقین دلایا تو وہ مجھے ایک پیسٹری شاپ لے گیا۔ عوامی بستی میں چھوٹی سی دکان ہے وہ۔ وہاں کیک' پیسٹریاں اور مٹھائیاں ہوتی ہیں' دکان ایک ہندوستانی عورت چلاتی ہے۔ اس نے بتایا کہ ایک ہندوستانی عورت جس کا نام وہ نہیں جانتی' اپنے گھر میں اس کے لئے چیزیں بناتی ہے.......... کیک' پیسٹریاں' مٹھائیاں وغیرہ۔ وہ ہفتے میں ایک دن آتی ہے' مال دیتی ہے' معاوضہ وصول کرتی ہے اور چلی جاتی ہے.........."

"یہ کام کی بات ہے" وقار نے عمر سے کہا۔

"ٹھیک کہتے ہو۔ لینڈ لیڈی نے بھی گلنار کے کیک کی تعریف کی تھی" عمر نے کہا "اچھا خاصہ ذریعہ آمدنی ہے یہ اور پوچھ گچھ کرنے والا بھی کوئی نہیں۔"

"جی ہاں" اکبر نے کہا "میں نے دکان والی سے اس عورت کے متعلق پوچھا۔ اس نے بتایا کہ وہ اکیلی آتی ہے لیکن وہ جانتی ہے کہ اس کے ساتھ ایک لڑکی بھی ہے جو رات کو اس کا ہاتھ بٹاتی ہے۔ شاید وہ بیٹی ہے اس عورت کی۔ بہت خوب صورت ہے اور دن میں وہ پیرس کی کسی فیشن شاپ میں شوکیس کی گڑیا بنتی ہے لیکن وہ کبھی ماں کے ساتھ کیک پیسٹریاں لے کر نہیں آئی۔"

"یہ گڑ بڑ ہے۔ عائشہ کی عمر تو ۴۸ سال ہو گی۔ وہ شوکیس کی گڑیا کیسے بن سکتی ہے" عمر بڑبڑایا "بہرکیف میری چھٹی حس کہتی ہے کہ یہ ہماری مطلوبہ فیملی ہے۔"

"یہ بھی تو ممکن ہے کہ لڑکی اس عورت کی نواسی ہو؟" وقار نے کہا "عائشہ کی بیٹی۔ آخر عائشہ کی شادی بھی تو ہوئی ہو گی۔"

"بالکل ٹھیک.......... یہ ناممکن نہیں.........."

اسی وقت ایک کاپی بوائے ٹرانس اوشیانک پریس سے ایک کاپی لے آیا۔ عمر نے اسے اٹھا کر پڑھا۔ سرخی تھی .... سری نگر میں پاکستانی جاسوس پر مقدمہ' نیچے تفصیل تھی۔

"آج پاکستانی اخبار نویس تیمور حسین کو عدالت میں پیش ہوا۔ اس پر جاسوسی کا الزام ہے۔ پچھلے عرصے میں مقبوضہ کشمیر اور بھارت میں جاسوسی میں کئی پاکستانی پکڑے جا چکے ہیں اور ان میں سے ہر ایک نے ان الزامات کی پوری طرح تائید کی جو ان پر عائد کئے گئے تھے۔

"اپنے طویل اعتراف میں جو آج سہ پہر شروع ہوا اور کل بھی جاری رہے گا' تیمور حسین نے واشگاف الفاظ میں تسلیم کیا کہ نہ صرف وہ خود بلکہ اس کا اخبار' انقلاب پیرس بھی جاسوسی میں ملوث ہے۔ اخبار کا ایڈیٹر عمر جاوید جو ۷۱ء تک فوج میں رہا اور اس کی بیوی تسکین عمر بھی اور ان کے علاوہ کئی افراد اس میں شامل ہیں۔ تیمور نے اعتراف کیا کہ بھارت میں پاکستانی سفیر بھی جاسوسی کی کارروائیوں میں معاونت کرتا ہے۔ تیمور حسین پوری طرح صحت مند اور ہر اعتبار سے نارمل دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے بیان میں کوئی جھجک نہیں تھی۔ اس نے پُرسکون لہجے میں بڑی روانی سے بیان دیا.........."

عمر کو اپنا دل ڈوبتا محسوس ہوا۔ "خدایا.......... ان لوگوں نے کیا کیا ہے اس کے ساتھ!" اس نے کراہتے ہوئے کہا "وہ ایسا کمزور آدمی تو نہیں تھا کہ ایسا بے بنیاد اعتراف آسانی سے کرلیتا۔ جانے کیا حشر ہوا ہو گا اس کا.........." اس نے کاپی نواب کی طرف بڑھا دی اور کھوئے ہوئے انداز میں کہا "پہلے صفحے پر لگا دو اسے" پھر وہ اکبر کی طرف مڑا "ہاں.......... وہ کس فیشن شاپ میں کام کرتی ہے؟ یہاں تو سینکڑوں فیشن شاپ ہیں میرے بھائی۔"

"یہ تو دکان والی کو بھی معلوم نہیں تھا" اکبر نے جواب دیا۔

"بہر حال ہمیں تو اس کی نانی سے غرض ہے" عمر نے کہا "اس سے ملنے کا بھی سامان کیا تم نے؟"

اکبر پشیمان نظر آنے لگا "یہی تو مسئلہ ہے چیف۔ میں نے پہلے ہی کہا تھا چیک نہیں کیا جا سکتا۔ دکان والی کو اس کا نام پتا معلوم نہیں اور کل ہی وہ کیک پیسٹریاں دے کر گئی ہے۔ اب چار دن بعد دوبارہ آئے گی۔"

سب پریشان نظر آ رہے تھے۔ عمر نے ادھر ادھر دیکھا' جیسے وہاں موجود لوگوں کو شمار کر رہا ہو۔ پھر اس نے کہا "ٹھیک ہے۔ اب لڑکی کو ہدف بنانا پڑے گا۔ ہم پہلے ٹاپ کے فیشن ہاؤسز کو ٹٹولیں گے۔ ویسے اگر وہ نمایاں ہونے سے بچتی ہے تو اس نے کسی گمنام قسم کے فیشن ہاؤس کا انتخاب کیا ہو گا لیکن وقار نے بتایا کہ وہ خوبصورت بھی ہے۔ اس لئے امکان ہے کہ اسے ڈائریا' بیلنسیاگا میں چانس ملا ہو گا۔ بڑی دکانوں میں مشہور ماڈلز کام کرتی ہیں لہٰذا وہاں کسی نئی ماڈل کو تلاش کرنا مشکل نہیں ہو گا۔ یہ ضروری نہیں کہ وہ اصل نام سے کام کر رہی ہو۔ بہرحال اس کے نقوش میں مشرقی جھلک بہت نمایاں ہو گی۔ شکور' نواب' ڈیڈ کو اور مجھے چھوڑ کر باقی سب لوگ فوری طور پر اس کام میں لگ جائیں۔"

نواب نے احتجاج کیا "یہ کیا کرتے ہو چیف۔ یہ نہ بھولو کہ ہمیں اخبار بھی نکالنا ہے۔"

"ڈیڈ اور میں پروف ریڈنگ میں تمہاری مدد کریں گے" عمر نے کہا "شکور ڈیسک سنبھالے گا اور بہ وقت ضرورت ری رائٹ بھی کرے گا۔ تم فکر نہ کرو' کام چلتا رہے گا۔ اخبار میں کوئی فرق پڑا بھی تو ہمارے علاوہ کسی کو نظر نہیں آئے گا۔ اے بھائی........ یہ تھائرا کہاں ہے؟ فیشن ہاؤسز کو تو وہ خوب جانتی ہے۔ وہ کیوں موجود نہیں ہے؟؟"

صدیق نے شیڈول چیک کیا۔ "رینے ویسول میں آج موسم بہار کے ملبوسات پیش کئے جائیں گے۔ تھائرا کو وہاں کوریج کرنی ہے۔ اس سے تو اب تقریب ختم ہونے کے بعد ہی مل سکیں گے آپ۔"

"ٹھیک ہے۔ اسے وہاں فون کر کے کہہ دو کہ پہلی فرصت میں دفتر فون کر لے۔

وہ وہیں سے اسٹارٹ لے سکتی ہے۔ اس کے پاس اہم فیشن ہاؤسز میں کام کرنے والی ماڈلز کی فہرستیں ہوں گی۔ نیلوفر' تم ذرا اس کی دراز میں فہرست دیکھو۔ تمام فیشن ہاؤسز کو آپس میں بانٹ لو۔ چلو بس اب شروع ہو جاؤ........"

☆============☆============☆

عدالت میں اعتراف جرم کرتے ہوئے تیمور بہت اچھا محسوس کر رہا تھا۔ اس کے انداز میں وہ خود اعتمادی اور طمانیت تھی جو اسٹیج کے کسی اداکار میں اس وقت پیدا ہوتی ہے جب متعدد ریہرسلوں کے بعد اسے یقین ہو جاتا ہے کہ اب وہ مطلوبہ پرفارمنس دے سکے گا۔

اس کی نظریں پروفیسر گروداس کے چہرے پر جمی تھیں۔ پروفیسر' ڈاکٹر موہن منیم کے ساتھ پہلی قطار میں بیٹھا تھا۔ جب بھی تیمور کوئی نیا پیراگراف شروع کرتا' وہ اظہار اطمینان کے طور پر اثبات میں سر ہلاتا۔ ان کی موجودگی تیمور کے لئے باعث طمانیت تھی۔ انہیں دیکھ کر دل و دماغ سے بوجھ اتارنے کی خواہش بہت شدید ہو جاتی۔ اسے احساس تھا کہ ان دونوں نے اس کی مدد کرنے کے لئے بہت شدید اور طویل محنت کی تھی۔

عدالت کے نیم تاریک کمرے میں عام لوگ خاصی تعداد میں تھے۔ ان کے چہروں پر سختی' عناد اور نفرت تھی۔ برسوں سے انہیں بتایا جا رہا تھا کہ پاکستان ان کا خوف ناک ترین دشمن ہے اور وہ انہیں تباہ کر دینا چاہتا ہے۔

تیمور جس طرف بھی نظر اٹھاتا' اسے اپنے لئے کہیں نرمی نظر نہ آتی۔ اس کے اندر کچلی' دبی ہوئی اصل شخصیت کے لئے حوصلہ افزائی کا کوئی سامان نہیں تھا۔ وہ کچلی ہوئی شخصیت جو اس کے وجود میں کہیں گہرائی میں دفن ہو گئی تھی' کبھی کبھی بازگشت کی طرح اس کے اندر گونجتی........ ایک لفظ' بے معنی چیخ کی طرح جسے سن کر سمجھ میں کچھ نہ آتا۔ بس عجیب طرح کا خوف ابھر آتا۔

پرانے طرز کے اس کمرے میں کچھ فاصلے سے دیواروں کے ساتھ سرخ رنگ کی بالٹیاں رکھی تھیں جن میں ریت بھری ہوئی تھی۔ بظاہر وہ آگ بجھانے کا سامان تھا۔ عدالت میں موجود گارڈ ان بالٹیوں کے قریب کھڑے کئے گئے تھے۔ وہ جب بھی حرکت کرتے' ان کی بندوقیں بالٹیوں سے ٹکراتیں۔ وہ آواز تیمور کے لئے روح فرسا تھی۔

اسے سن کر اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سرد لہر دوڑنے لگتی۔ اس کے بعد نہ اس میں برائے نام قوت ارادی موجود رہتی اور نہ قوت ارادی کا مالک ہونے کی خواہش۔ وہ بالٹیاں وہاں رکھی ہی اسی مقصد کے تحت گئی تھیں۔ اعتراف کرانے والوں نے کہیں کوئی کمزور پہلو نہیں چھوڑا تھا۔

نیوز ریل کیمرے اس پر جمے ہوئے تھے۔ عدالت کی پوری کارروائی ریکارڈ ہو رہی تھی۔ تیمور کی نظریں پروفیسر گرو داس یا ڈاکٹر موہن پر پڑتیں تو اسے سکون محسوس ہوتا۔ وہاں دونوں اسے دوست جیسے لگتے تھے۔ انہوں نے اس پر محنت کی تھی۔ اسے اعتراف جرم سکھایا تھا........ قائل کیا تھا کہ کس انداز میں اس نے کیا جرم کیا ہے۔ انہوں نے ابدی سکون کی........ نجات کی راہ دکھائی تھی۔ دنیا میں بس وہی دونوں اس کے دوست تھے۔

اس کی زبان سے جملے بہتے رہے۔ اس کا لہجہ اثر انگیز تھا۔ سب لوگوں کی نظریں اس پر جمی تھیں۔ تینوں جج اسے گھور رہے تھے۔ وکیل استغاثہ کا انداز معاندانہ تھا اور اسے حکومت کی طرف سے جو وکیل فراہم کیا گیا تھا' وہ بہت مطمئن نظر آ رہا تھا۔ جبکہ عام لوگ اس خشمگیں نگاہوں سے گھور رہے تھے۔

پروفیسر گرو داس طمانیت سے سر ہلا رہا تھا۔ اس کے شاگرد نے سبق خوب یاد کیا تھا۔ ہر لفظ پر وہ ضرورت........ اور ہدایت کے مطابق اتار چڑھاؤ دے رہا تھا۔ ڈاکٹر موہن مسکرا رہا تھا۔ ایک دشوار ترین مرحلہ بڑی آسانی اور خوش اسلوبی سے طے ہو رہا تھا۔

تیمور کو خود پر فخر محسوس ہو رہا تھا۔ اس کی آواز کہیں نہیں لڑکھڑائی تھی........ تسکین کا تذکرہ کرتے ہوئے بھی نہیں۔ اسے احساس بھی نہیں تھا کہ وہ تسکین اور عمر کے ناموں پر کالک مل رہا ہے۔ انہیں دشمنوں کے ہاتھ بیچ رہا ہے۔

☆============☆============☆

رینے ویسول میں موسم بہار کے ملبوسات کی نمائش چل رہی تھی۔ ایک تہائی سے زیادہ کپڑے دکھائے جا چکے تھے۔ اچانک تھائرا کی نظر سیکریٹری پر پڑی۔ وہ اشارے سے اسے بلا رہی تھی........ بتا رہی تھی کہ اس کا فون ہے۔

تھائرا ایڈی سن فرانسیسی تھی۔ ڈراما اس کی فطرت میں رچا تھا۔ جب بھی وہ کسی ذخیرہ ملبوسات کے افتتاح میں شرکت کرتی' اس کی کیفیت ہیجانی ہوتی۔ وہ پہلی قطار میں بیٹھتی........ اس جگہ سے قریب جہاں فیشن ہاؤس کا مینیجر اور اس کے دوست بیٹھتے۔ تھائرا اپنی سیٹ پر پھیل کر بیٹھتی۔ دوستوں کو دیکھ کر ہاتھ ہلاتی۔ کوئی ماڈل فلور پر آتی تو اس کا نام پکارتی اور اسے مسکرا کر دیکھتی۔ پھر بیٹھ کر تفصیل لکھتی۔

تھائرا نے اس بلاوے پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا پھر وہ اٹھی اور دروازے کی طرف بڑھی۔ اس وقت فلور پر سیاہ بالوں اور مشرقی نقوش والی ایلن ایک نیا لباس پہنے تھرک رہی تھی۔ وہ بہت حسین لڑکی تھی۔ ان دنوں سب سے زیادہ تصویریں اس کی کھینچی جا رہی تھیں۔

"واہ........ ایلن ڈارلنگ" تھائرا اپنے مخصوص انداز میں چلائی "بہت پیاری لگ رہی ہو تم۔ اور یہ لباس بہت شاندار ہے۔ ذرا مجھے چھو کر دیکھنے دو۔ افوہ........ یہ لعنتی فون۔ ابھی آتی ہوں میں۔"

ایلن اسے دیکھ کر مسکرائی۔ اس کے دانت بے حد سفید اور چمک دار تھے۔

تھائرا نے باہر رکھے ایکس ٹینشن پر کال ریسیو کی۔ اس کا ذہن بٹا ہوا تھا۔ وہ ڈیڈ لیپ ہام کی بات پوری توجہ سے نہیں سن رہی تھی۔ اس کی نظر ماڈل پر تھی۔

ڈیڈ نے اپنی بات ختم کی تو اس نے ریسیور رکھ دیا۔ فیشن ہاؤس کی سیکریٹری اس کے قریب ترین ہی کھڑی تھی۔ تھائرا نے اس سے کہا "ڈارلنگ! یہ کال میرے دفتر سے آئی ہے۔ وہ کہتے ہیں' معاملہ بہت اہم ہے۔ یہاں کہیں کوئی ماڈل ہے........ انڈین۔ نام نہیں معلوم۔ مسلم ہے۔ مجھے اس کا پتا چلانا ہے۔ اب میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ کیا کروں۔ تم ایسا کرو' اپنے ہاں کی لڑکیوں سے ذرا پوچھ گچھ کرو اس سلسلے میں" یہ کہہ کر وہ اندر چلی گئی۔

فیشن پریڈ جاری رہی۔ تھائرا نوٹس لیتی رہی۔ ویسول کی سب سے مقبول ماڈل بیٹینا آئی۔ پھر اینجلا نے ایک نیا اور خوب صورت لباس دکھایا۔ پھر ایلن دوبارہ نمودار ہوئی۔ وہ نئے طرز کا ایوننگ گاؤن پہنے ہوئے تھی۔ وہ وائٹ' گرے اور بلیک گاؤن تھا ایک آستین سفید تھی اور دوسری آستین ندارد تھی۔ ہیروں کا جڑاؤ پلاٹینم کا ہار اس کے

گلے میں چمک رہا تھا۔ بالوں میں جڑاؤ ہیرے کے کلپ تھے۔ مجموعی تاثر مشرقی تھا.........
اور اس ڈریس کا نام مون لائٹ تھا۔

وہ آئی تو دیر تک تالیاں بجتی رہیں۔ وہ اب تک کا سب سے سپرہٹ لباس تھا۔

ایلن اپنے مخصوص انداز میں ہچکچاتے قدموں سے بڑھ رہی تھی۔ یہ ہچکچاہٹ اس کی چال کا اصل حسن تھی لیکن تھائرا کو احساس ہوا کہ اس بار اس کے ردھم میں کوئی گڑبڑ ہے لگتا تھا' وہ اپنے ہاتھ سے کسی بوجھ کو دھکیل رہی ہے۔ وہ لڑکھڑائی' اس کے دونوں ہاتھوں اپنی کنپٹیوں کی طرف گئے پھر اچانک ہی وہ ڈھیر ہو گئی۔

دیکھنے والوں کے درمیان سے کئی چیخیں ابھریں۔ پیچھے بیٹھے ہوئے لوگوں نے آگے کا منظر دیکھنے کے لئے پہلو بدلے اور اپنی کرسیاں سرکائیں۔ فیشن ہاؤس کا مالک ویسول مضطربانہ انداز میں اٹھ کھڑا ہوا۔ پردے کے پیچھے سے دو مرد اور چار پانچ عورتیں نمودار ہوئیں اور گری ہوئی ایلن پر جھک گئیں۔

آنے والوں نے لڑکی کو اٹھایا اور اسے اندر لے گئے۔ ویسول ان کے پیچھے تھا۔
تھائرا بھی اٹھ کر اسی طرف چل دی۔ وہ فیشن رائٹر تھی۔ اس کی دلچسپی فیشن میں تھی لیکن اس میں اتنا صحافیانہ شعور بہرحال تھا کہ اس غیر معمولی واقعے کو اہمیت دیتی۔ پہلے کبھی کوئی ماڈل اس طرح بے ہوش نہیں ہوئی تھی۔

ڈریسنگ روم میں ایلن کو ایک کاؤچ پر لٹایا گیا۔ اس کو ہوش میں لانے کی کوشش کی جانے لگی۔ بالآخر اس چہرے پر رنگ واپس آنے لگا۔ وہ کسمسائی اور دھیرے دھیرے آنکھیں کھول دیں۔

ہیڈ سیلز وومن اس پر جھک گئی "کیا ہوا تھا گڑیا؟" اس نے ہمدردانہ لہجے میں پوچھا "تمہاری طبیعت خراب ہے کیا؟"

"لباس بہت تنگ تھا" ایلن منمنائی "اور پھر ہک.........."

قریب کھڑے ڈیزائنر نے ہک کی شان میں ہجو پڑھتے ہوئے کہا "ہک کو دوبارہ فیشن میں لانا ہی نہیں چاہئے تھا۔"

تھائرا نے ایک گہری سانس لی اور ادھر ادھر دیکھا۔ اس بھیڑ میں اس کے علاوہ کوئی رپورٹر نہیں تھا۔ اس نے ماڈل اور ڈیزائنر کی بات غور سے سنی تھی اور محسوس کر لیا

تھا کہ یہ واقعہ اور اس واقعے پر ماڈل اور ڈیزائنر کا تبصرہ فیشن کی دنیا میں انقلاب لے آئے گا۔ اس کے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ یہ بات کسی اور اخبار میں نہیں چھپے گی۔ اس لئے کہ تمام رپورٹر ملبوسات کی کوریج میں مصروف ہیں۔ یہاں کوئی بھی نہیں..........

وہ تیزی سے باہر نکلی اور سیڑھیوں کی طرف لپکی۔ باہر نکل کر اسے کوئی ٹیکسی نظر نہیں آئی تو اس نے فٹ پاتھ پر دوڑنا شروع کر دیا۔ جس حد تک اس کی موٹی ٹانگیں اجازت دے سکتی تھیں' وہ دوڑی۔ بالآخر اسے ٹیکسی مل گئی۔ اس نے ڈرائیور کو تیز رفتاری سے چلنے کی ہدایت دی۔

وہ ہانپتی کانپتی ادارتی کمرے میں داخل ہوئی۔ اپنی کرسی پر ڈھیر ہو کر سانسیں درست کرنے میں اسے چند منٹ لگے۔ اس کے حلق سے عجیب عجیب آوازیں نکل رہی تھیں۔

عمر' ڈیڈ' اور نواب اس پر عقاب کی طرح جھپٹے۔

"تھائرا بے بی.......... لگتا ہے' تم نے کام کر دکھایا۔ بتاؤ نا ہمیں.........." عمر نے کہا۔

تھائرا کاغذات کے پلندے سے خود کو ہوا جھلنے لگی۔ "ہاں ڈارلنگ......... کام میں نے کر دکھایا" وہ ہیجانی لہجے میں بولی۔ "آج تک کا سب سے بڑا معاملہ ہے یہ اور لطف یہ کہ صرف ہمارے اخبار میں چھپے گا۔ صرف مجھے معلوم ہوا ہے۔ اب میں مشہور ہو جاؤں گی' بس ذرا لکھ لوں۔"

عمر اس کے اس طرح پھٹ پڑنے پر حیران رہ گیا۔ نواب اس سے خوب واقف تھا۔ جانتا تھا کہ اب کھودا پہاڑ نکلا چوہا والا معاملہ ہو گا۔

ڈیڈ نے عملی لائن پکڑی۔ "تھائرا.......... یہ تم کس قسم کی باتیں کر رہی ہو؟"

"ہو.......... ہو" تھائرا اپنے مخصوص انداز میں چلائی "میں تنگی کی بات کر رہی ہوں.......... اور ہک کی بات کر رہی ہوں۔ تم یقین نہیں کرو گے لیکن یہ سچ ہے۔ یہ سب کچھ اب آؤٹ.......... یقینی طور پر آؤٹ۔ میں نے خود اپنے کانوں سے سنا ہے ڈیزائنر کا تبصرہ یہ انقلاب تو امریکا تک پہنچے گا۔ پوری دنیا کو ہلا کر رکھ دے گا۔ اور صرف مجھے معلوم ہے کہ کیا ہوا ہے اور کیسے ہوا ہے۔ جب وہ لڑکی بے ہوش ہوئی' میں وہاں موجود تھی اور

جب وہ ہوش میں آئی، تب بھی۔"

"میرا دماغ الٹ جائے گا۔" عمر نے بے بسی سے کہا۔ "کس لڑکی کی بات کر رہی ہو تم؟ تھائرا.......... تمہاری بات سمجھ میں نہیں آ رہی.........."

"حالانکہ ڈارلنگز، میں عام فہم گفتگو کر رہی ہوں۔ تمہیں اندازہ نہیں کہ امریکا میں کیا ہو گا۔ دنیا میں.........."

"میں پوچھ رہا ہوں، کس لڑکی کی بات کر رہی ہو تم؟" عمر نے جھنجلا کر پوچھا۔

"میں رینے ویسول کی ماڈل ایلن کی بات کر رہی ہوں۔ وہ میرے سامنے ہی فلور پر گری اور بے ہوش ہو گئی۔ تنگ لباس کی وجہ سے........ اور ہک بھی چبھ رہا تھا اس کے۔ وہ لوگ اسے ڈریسنگ روم میں لے کر گئے۔ میں بھی پیچھے پیچھے چلی گئی۔ ویسول خود بھی وہاں موجود تھا۔ لڑکی نے کہا.......... اور ڈیزائنر نے کہا.......... میں نے صاف سنا.........."

عمر، تھائرا کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ ڈیڈ نے اس سے کہا۔ "ابھی اسے قتل نہ کرنا۔ اس کے مواقع تمہیں ملتے رہیں گے۔" پھر وہ تھائرا کی طرف مڑا "تمہیں یاد ہے، میں نے تمہیں فون کیا تھا؟ اس معاملے کا کیا بنا؟ میں نے کہا تھا، انڈین لڑکی کے متعلق.........."

"ارے ڈارلنگ، وہ تو میں نے ریسیور رکھتے ہی سیکریٹری سے کہہ دیا تھا" تھائرا پھر چلائی "مگر پھر میں اس بے چاری لڑکی کی بے ہوشی کے چکر میں بھول ہی گئی۔ میں تمہیں کیا بتاؤں، یہ اعزاز صرف ہمارے اخبار کے حصے میں آئے گا۔ وہ تمہاری انڈین ماڈل اتنی اہم نہیں ہو سکتی۔ ذرا وقت تو دیکھو میں یہ خبر شکاگو اور نیویارک بھجوانا چاہتی ہوں۔ وہاں سب کے منہ حیرت سے کھل جائیں گے.........."

"فی الحال تو مجھے ایک ہی منہ کھلا نظر آ رہا ہے" عمر نے دانت پیس کر کہا "اور اسے بند کرنا.........."

"تم یہ بتاؤ تم نے اس معاملے میں پوچھا تھا؟" ڈیڈ نے تھائرا کو جھنجوڑا۔

"ہاں۔ جس وقت میں نے تمہارا فون ریسیو کیا، سیکریٹری میرے ساتھ ہی تو کھڑی تھی۔ وہ لڑکیوں سے معلوم کرنے کے لئے اندر چلی گئی۔ پھر مجھے اس سے معلوم کرنا یاد ہی

نہیں رہا.........."

"ٹھیک ہے تھائرا" عمر نے تھکے تھکے لہجے میں کہا۔ "مجھے ایک بات بتاؤ۔ یہ تنگی.......... یہ ہک.......... یہ کیا چکر ہے؟"

"ہو.......... ہو.......... ڈارلنگ! میں تو سمجھی تھی، تم جانتے ہو گے" تھائرا ہنسنے لگی "لیکن اب یہ دونوں چیزیں آؤٹ آف فیشن ہو جائیں گی۔ اب کوئی معزز عورت.........."

عمر کے ذہن میں ایک خلش رہ رہ کر چبھ رہی تھی۔ وہ اپنے دفتر میں چلا گیا جہاں اس کی سیکریٹری زرینہ کچھ ٹائپ کر رہی تھی "بات سنو مس زرینہ" عمر نے اس سے کہا "تسکین ہوتی تو میں اس سے پوچھ لیتا۔ یہ بتاؤ کہ عورتوں کے لباس میں ہک کا کیا چکر ہوتا ہے؟"

زرینہ نے چونک کر اسے دیکھا۔ اس کا چہرہ تمتما اٹھا تھا۔

"پلیز.......... یہ بہت اہم معاملہ ہے زرینہ۔ اس تھائرا نے تو میرا دماغ الٹا دیا ہے۔"

"ہک سینہ پوش میں لگا ہوتا ہے" زرینہ نے نظریں جھکاتے ہوئے کہا "بیچ میں ہک کا سلسلہ ختم ہو گیا تھا مگر پچھلے کچھ عرصے سے پھر فیشن میں آ گیا ہے۔"

"ایک بات بتاؤ۔ لباس تنگ ہونے کی وجہ سے یا ہک چبھنے کی وجہ سے کوئی لڑکی بے ہوش ہو سکتی ہے؟"

زرینہ ہنسنے لگی "یہ کہانی تھائرا نے سنائی ہے آپ کو؟ اب تو ایسا نہیں ہوتا۔ کوئی اور وجہ رہی ہو گی بے ہوشی کی۔ اب تو ہک چبھتے ہی نہیں۔"

عمر دوبارہ ادارتی کمرے میں چلا آیا۔ ڈیڈ فون پر کسی سے بات کر رہا تھا۔ عمر نے اس سے پوچھا "کون ہے ڈیڈ؟"

"وقار ہے" ڈیڈ نے بتایا "مارسل روکاس سے بات کر رہا ہے نتیجہ صفر۔"

"اس سے کہو، فوراً واپس آجائے۔ پانچ منٹ کے اندر اندر یہاں پہنچ جائے" عمر نے کہا۔ پھر وہ تھائرا کی طرف مڑا۔ اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا "بند کرو یہ ٹائپنگ۔ یہ اسٹوری تم پھر لکھ سکتی ہو۔ انسانی جان کی کوئی وقعت نہیں تمہارے نزدیک۔

ادھر دیکھو......... مجھے کچھ سوالات کے جواب درکار ہیں" وہ تھائرا پر برس پڑا۔

"لیکن ڈیئر جاوید......... میں تو........." تھائرا خوف زدہ نظر آنے لگی۔

"شٹ اپ تھائرا۔ تم فضول باتیں بہت کرتی ہو" عمر نے اسے ڈانٹ دیا۔ "تم اس وقت تیمور کی زندگی سے کھیل رہی ہو۔ اب ذرا توجہ سے میری بات سنو۔ اس لڑکی کا نام کیا تھا جو بے ہوش ہو گئی تھی؟"

"ایلن" تھائرا نے کمزور آواز میں جواب دیا۔ "پورا نام مجھے نہیں معلوم۔"

"دیکھنے میں کیسی ہے؟"

"غضب کی ہے۔ ایسی حسین کہ کیا کہنے" تھائرا پھر شروع ہو گئی "سیاہ بال، سیاہ آنکھیں، مشرقی نقوش، ہو......... ہو......... کیا بات ہے اس کی" وہ مخصوص انداز میں چلائی "ارے......... میں بھی کتنی بے وقوف ہوں۔ تصویر میرے پاس ہے۔ تم خود دیکھ لو" یہ کہہ کر اس نے اپنی میز کے برابر رکھے شیلف سے ایک فرانسیسی رسالہ کھینچا۔ کچھ دیر کی ورق گردانی کے بعد اس نے ایک صفحہ کھولا اور رسالہ عمر کی طرف بڑھایا۔ "یہ رہی........."

عمر نے پورے صفحے کی اس تصویر کو غور سے دیکھا۔ لڑکی لگتی تو مشرقی ہی تھی لیکن وہ فیصلہ نہیں کر سکتا تھا۔ "یہ وقار کہاں ہے؟" اس نے پکارا

"آنے ہی والا ہو گا" ڈیڈ نے اسے تسلی دی "میں نے اسے بتا دیا ہے کہ معاملہ ایمرجنسی نوعیت کا ہے۔"

عمر پھر تھائرا کی طرف متوجہ ہو گیا "یہ لڑکی کب سے ماڈلنگ کر رہی ہے؟"

"ایک سال ہو گیا" تھائرا نے جواب دیا۔

"اب سب کچھ مجھے تفصیل سے بتاؤ۔ کوئی معمولی سی بات بھی نہ رہنے پائے۔ اس وقت سے شروع کرو جب ڈیڈ نے تمہیں فون کیا تھا۔"

"ہاں۔ میں نے فیشن ہاؤس کی سیکریٹری کو وہ پوری تفصیل بتائی جو ڈیڈ نے مجھے بتائی تھی۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ اپنی لڑکیوں میں دیکھے، شاید ایسی کوئی لڑکی ہو۔ پھر اپنی ماڈلز سے پوچھے، شاید ان میں کوئی ایسی کسی لڑکی سے واقف ہے۔ میں نے اسے بتا دیا تھا کہ معاملہ بہت اہم ہے۔"

"پھر؟"

"پھر سیکریٹری ڈریسنگ روم میں چلی گئی۔ شاید لڑکیوں سے پوچھنے کے لئے........."

"اور تم کہاں گئیں؟"

"میں دوبارہ اپنی جگہ جا بیٹھی۔"

"اس وقت فلور پر کون سی لڑکی تھی؟"

"گیزل اسی وقت گئی تھی اور بیٹینا آئی تھی۔"

"ایلن اس وقت کہاں تھی؟"

"معلوم نہیں۔ شاید ڈریسنگ روم میں دوسرا لباس پہن رہی ہو گی۔"

"ایلن دوبارہ کتنی دیر کے بعد آئی؟" عمر نے پوچھا۔

"کوئی پانچ منٹ بعد آئی ہو گی۔"

"یعنی اس دوران سیکریٹری نے ڈریسنگ روم میں موجود لڑکیوں سے پوچھ لیا ہو گا کہ ان میں سے کوئی کسی انڈین ماڈل سے واقف ہے؟"

"شاید ایسا ہی ہو۔ اتنی سی بات پوچھنے میں دیر ہی کتنی لگتی ہے" تھائرا نے کہا، پھر پوچھا "مجھ سے کوئی بڑی حماقت ہو گئی ہے۔ ہے نا؟"

"مائی ڈارلنگ، میں اس وقت ہنسی خوشی تمہیں قتل کر سکتا ہوں۔" عمر نے مسکرائے بغیر جواب دیا۔

اسی وقت وقار ادارتی کمرے میں داخل ہوا "کیا بات ہے، کوئی پیش رفت؟" اس نے آتے ہی پوچھا۔

عمر نے رسالے میں چھپی ہوئی تصویر اس کی طرف بڑھا دی "تمہیں لڑکی کا جو حلیہ بتایا گیا ہے، دیکھو، یہ لڑکی اس پر پوری اترتی ہے؟"

وقار نے تصویر دیکھی اور سیٹی بجائی "لگتی تو وہی ہے۔ سیاہ بال، سیاہ آنکھیں، مشرقی نقوش۔ مل گئی ہے کیا؟"

عمر نے تلخ لہجے میں کہا "مل گئی تھی لیکن ہماری اس عقل سے محروم رپورٹر نے اسے ہاتھ سے پھسل جانے دیا" اس نے تھائرا کی طرف اشارہ کیا۔

تھائرا نے باقاعدگی سے رونا شروع کر دیا "جاوید! تم میری توہین کر رہے ہو" وہ بولی "یہ بے رحمی ہے تمہاری............"

"اور کبھی کبھی ضروری بھی ہوتی ہے" عمر نے کہا "تیمور کے ساتھ سری نگر میں جو کچھ ہو رہا ہے' وہ اس سے بہت بڑی بے رحمی ہے۔ خود کو سنبھالو تھائرا۔ یہ رونے کا وقت نہیں' کچھ کرنے کا وقت ہے۔ فوراً رینے ویسول جاؤ۔ وقار کو اپنے ساتھ لے جاؤ۔ اس کے پاس دماغ بھی ہے اور اسے استعمال کرنا بھی جانتا ہے۔ اس لڑکی کو یہاں لے آؤ۔ اگر وہ جا چکی ہو تو اس کا پتا معلوم کرو۔ کسی نہ کسی کو معلوم ہوگا کہ وہ کہاں رہتی ہے۔ اتنی بڑی فیشن شاپ میں اپنا پتا بتائے بغیر کسی کو کام نہیں مل سکتا۔ اس کے گھر جاؤ اور اس کے باپ کو.......... یا نانا' جو کوئی بھی ہے وہ' اسے پکڑو۔ اس لئے کہ لڑکی جان گئی ہے کہ ان لوگوں کو تلاش کیا جا رہا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ پوری فیملی نکل بھاگے۔ اسی پوچھ گچھ سے گھبرا کر' جلدی نکل بھاگنے کے لئے اس نے بے ہوش ہونے کی اداکاری کی ہوگی' جس کا کریڈٹ تم نے تنگ لباس اور ہک کو دے دیا۔ بس اب نکل لو۔"

ان کے جانے کے بعد ڈیڈ نے نرم لہجے میں کہا "اب شاید تمہاری سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ میں تمہاری یہاں موجودگی کو کیوں ضروری قرار دے رہا تھا۔"

☆============☆============☆

سری نگر کی عدالت میں پاکستانی جاسوس تیمور حسین کا اعتراف جرم مکمل ہو چکا تھا۔ اس کے ساتھ ہی پورے بھارت میں پاکستان کے خلاف مظاہرے شروع ہو گئے تھے۔ مظاہرین تیمور حسین کو پھانسی دینے کا مطالبہ کر رہے تھے۔ عدالت میں موجود لوگوں نے بھی پھانسی دو' پھانسی دو کا شور مچانا شروع کر دیا تھا۔ جج کو گارڈز کو ہدایت دینا پڑی کہ ایسے لوگوں کو عدالت سے نکال دیا جائے۔

تیمور کو اس وقت فخر اور سکون کے سوا کسی بات کا احساس نہیں تھا۔ سب کچھ ٹھیک ہو گیا۔ پورے بیان میں ایک بار بھی اس کی زبان نہیں لڑکھڑائی تھی۔ سامنے بیٹھے پروفیسر گرو داس اور ڈاکٹر موہن منیم کے درمیان سرگوشیوں میں گفتگو ہو رہی تھی۔ تیمور نے کوشش کی کہ کسی طرح انہیں اپنی طرف متوجہ کر لے۔ اسے اس وقت ان کی ایک ستائشی نظر کی اشد ضرورت تھی لیکن اب وہ اسے دیکھنے سے گریز کر رہے تھے۔

تیمور کٹہرے میں کھڑا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب اسے کیا کرنا ہے۔ یہی وہ ایک بات تھی جو وہ بتانا بھول گئے تھے۔ انہوں نے اسے نہیں بتایا تھا کہ اعتراف جرم کرنے کے بعد اسے کیا کرنا ہے۔ وہ بہت تھک گیا تھا مگر اسے خوشی تھی کہ تمام بوجھ اتار پھینکنے کے بعد وہ ہلکا پھلکا ہو گیا ہے لیکن وہ اداس بھی تھا کہ اتنی جلدی یہ سب کچھ ختم ہو گیا۔ اب وہ کسی کام کا نہیں رہا ہے۔

اس کا وکیل اس کی طرف آیا۔ اس نے اس کے کندھے تھپتھپائے اور اسے اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ وہ اس کے پیچھے میز کی طرف گیا اور بیٹھ گیا۔ یہ وہ وقت تھا جب سری نگر میں ٹرانس اوشیانک کے نمائندے نے اس کی چال میں بے یقینی کی لڑکھڑاہٹ محسوس کی جیسے اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا ہو کہ اسے کہاں جانا ہے۔

پروسیکیوٹر اٹھا اور اس نے اختیاری دلائل پیش کیے۔ اس نے اعتراف جرم کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ ملزم نے خود کو پوری طرح عدالت کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا ہے۔ رضاکارانہ اعتراف جرم کی وجہ سے ملزم کو کم سے کم سزا ملنی چاہیے۔

چیف جسٹس نے فیصلہ سنایا کہ اگلی صبح دس بجے مقدمے کا فیصلہ سنایا جائے گا۔ اس وقت تک کے لئے عدالت برخواست کی جاتی ہے۔

☆============☆============☆

اگلی صبح دس بجے وہ سب ایک گروپ کی شکل میں عمر کے دفتر میں بیٹھے تھے۔ وہ سبھی نروس' چڑچڑے اور بد مزاج ہو رہے تھے۔ وہ جبار شاہ نام کے ایک بھارتی' کشمیری پناہ گزین کی آمد کے منتظر تھے جو کبھی بھارت کے وزیر داخلہ خواجہ مقصود کا اسسٹنٹ اور پرسنل سیکریٹری رہ چکا تھا۔

اس بات کا وعدہ کیا گیا تھا کہ جبار شاہ وہاں پہنچے گا۔ اب اگر وہ نہ آتا تو عدالت یقینی طور پر تیمور کو پھانسی کی سزا سناتی اور خواجہ مقصود چوبیس گھنٹے کے اندر اندر سزا پر عمل درآمد کر کے اپنی بات پوری کر دکھاتا۔

کمرے میں تیمور کے علاوہ ڈیڈ' لیپ ہام' صدیق' وقار اور نیلوفر موجود تھے۔ نیلوفر نے رکنے کے لئے بہت خوشامد کی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ جب تیمور کے لئے کی امید کی پہلی کرن نمودار ہو تو وہ بھی موجود ہو۔ عمر میں اتنا حوصلہ نہیں تھا کہ اس کی بات رد کرتا۔

اور اسلام آباد میں' پرل کانٹی نینٹل کے ایک کمرے میں تسکین عمر ملتجی نگاہوں سے فون کو تکے جا رہی تھی.......... منتظر تھی کہ فون کی گھنٹی بجے۔

ان میں صرف عمر ہی ایسا تھا جو پُرسکون تھا اور اس صورت حال میں بھی سوچنے سمجھنے کی اہلیت رکھتا تھا۔ صورت حال اچھی نہیں تھی مگر لگتا تھا کہ اب یہ اعصاب شکن کھیل اختتام کو پہنچنے والا تھا۔ خوف ناک سسپنس ختم ہونے والا تھا۔ وہ جو کچھ کر سکتے تھے' انہوں نے کیا تھا اور اب چوبیس گھنٹے کے اندر فیصلہ ہو جاتا تھا۔ ادھر یا ادھر۔

عمر کو اندازہ نہیں تھا کہ جبار شاہ آئے گا یا نہیں۔ اس معاملے میں اس کی چھٹی حس بھی خاموش تھی۔ وقار نے ڈائریکٹ تو نہیں بالواسطہ اس سے رابطہ کیا تھا۔ اب یہ جبار شاہ کے اختیار میں تھا کہ وہ آئے یا نہ آئے۔

ڈیڈ اور صدیق کو خود پر اتنا کنٹرول نہیں تھا۔ بلکہ صدیق وقار پر غصہ اتار رہا تھا۔

ڈیڈ نے پوچھا "وقار.......... تم یہ کیوں سوچتے ہو کہ وہ آئے گا؟"

"دیکھیں .... گلنار بیگم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا" وقار بولا۔ "ان کا انداز بڑا سچا تھا۔ انہوں نے کہا تھا.......... میں انہیں بھیجنے کی پوری کوشش.........."

"اور تم اس پر یقین کر کے' انہیں ان کے حال پر چھوڑ کر چلے آئے" صدیق نے چڑ کر کہا۔ "سچ کہتا ہوں' کسی رپورٹر نے کبھی ایسی احمقانہ حرکت نہیں کی ہو گی۔"

"میں نے تمہیں بتایا تو ہے' وہ لوگ پولیس سے مر جانے کی حد تک خوف زدہ ہیں۔" وقار نے بے بسی سے کہا "نانی بھی اور نواسی بھی۔ اگر میں ان پر زور ڈالتا' انہیں دھمکاتا یا وہیں جم کر بیٹھ جاتا تو وہ کسی نہ کسی طرح جبار شاہ کو خبردار کر دیتیں۔ وہ گھر میں نہیں تھا اور آنے والا بھی نہیں تھا۔ انہوں نے وعدہ کیا کہ وہ بعد میں اس سے رابطہ کریں گی۔ تم سمجھ نہیں رہے ہو کہ وہ لوگ کیسے خوف میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔"

"تم تھائرا کو ان کے پاس چھوڑ سکتے تھے" ڈیڈ نے کہا۔

"دیکھیں ڈیڈ' میں وہاں تھا۔ میں وہاں کا حال جانتا ہوں" وقار نے جھنجھلا کر کہا۔ "تھائرا بھی جانتی ہے۔ آپ کو صورت حال کا پتا ہی نہیں ہے۔ ہم اس لڑکی عالیہ کے پہنچنے کے پانچ منٹ بعد وہاں پہنچے تھے اس نے نانی کو پہلے ہی ڈرا دیا تھا۔ آپ ان کا حال دیکھتے تو پتا چلتا۔ وہ سامان پیک کرنا شروع کرنے والی تھیں۔ عالیہ نے شاید بتایا ہو گا کہ پولیس اس

کے بارے میں پوچھ گچھ کرتی ہوئی رینے ویسول تک آ گئی ہے۔ وہ اس وقت پُرسکون ہوئیں جب میں نے ثابت کر دیا کہ میرا تعلق پولیس سے نہیں' روزنامہ انقلاب سے ہے۔ اگر میں انہیں دھمکاتا یا تھائرا کو ان کے پاس چھوڑتا تو وہ مشکوک ہو جاتیں کہ ضرور کوئی گڑ بڑ ہے۔ آپ ان کی کیفیات سمجھ نہیں سکتے۔ یقین کریں' تھائرا کی وجہ سے صورت حال بہتر ہو گئی' عالیہ' تھائرا کو جانتی ہے۔ ورنہ وہ کبھی یقین نہ کرتی کہ ہمارا تعلق پولیس سے نہیں ہے۔ ہمارے پاس ان کی بات پر اعتبار کرنے کے سوا کوئی صورت نہ تھی۔ آپ نے مجھے بھیجا کیوں تھا؟ مجھے تو صورت حال کو دیکھ کر' اس کے تقاضوں کے مطابق فیصلہ کرنا تھا۔"

"اور تمہارے فیصلے نے سب کچھ ڈبو دیا" صدیق نے بے رحمی سے کہا۔ "اب بتاؤ گے بھی تو تم ہی کہ جبار شاہ اب تک کیوں نہیں آیا۔"

"صدیق بھائی' آپ وقار کے پیچھے نہ پڑیں" نیلوفر چیخ اٹھی "اس نے تو بساط بھر کوشش کی۔ مجھے یقین ہے کہ جبار شاہ ضرور آئے گا۔"

عمر دانتوں سے اپنا نچلا ہونٹ کاٹ رہا تھا۔ "تم کہتے ہو کہ انہیں پتا چلا کہ تمہارا تعلق روزنامہ انقلاب سے ہے تو پُرسکون ہو گئیں۔ مجھے یہ بات کچھ عجیب لگتی ہے۔ تفصیل سے بتاؤ کیا ہوا تھا؟"

وقار نے نروس انداز میں کلاک کو دیکھا۔ دس بجنے میں پانچ منٹ باقی تھے' "دیکھیے.......... میں نے دستک دی اور اندر چلا گیا" اس نے کہنا شروع کیا "لڑکی عالیہ اور اس کی نانی میز کے پاس ایک دوسرے سے لپٹی کھڑی تھیں۔ سامنے دو سوٹ کیس رکھے تھے جو خالی تھے۔ میں نے کہا.......... خاتون آپ بیگم جبار شاہ ہیں نا! عالیہ نے مجھے دیکھا اور رونے لگی لیکن گلنار بیگم بڑی باوقار خاتون ہیں۔ وہ اپنی جگہ کھڑی رہیں۔ ٹھیک ہے' انہوں نے کہا۔ اب بھاگنے کا کوئی فائدہ نہیں' لیکن سنو' ہم نے کچھ نہیں کیا ہے' کسی کو نقصان نہیں پہنچایا ہے۔ ہمیں سکون سے رہنے دو۔ تم ہم پر مقدمہ چلاؤ گے؟ میں نے کہا ایسی کوئی بات نہیں اماں۔ یہاں سے اردو زبان کا ایک اخبار نکلتا ہے.......... انقلاب میں اس کا نمائندہ ہوں۔ میں تو بس شاہ صاحب سے چند باتیں پوچھنا چاہتا ہوں۔ یہ سن کر ان کی آنکھوں میں امید نظر آئی۔ انقلاب تو میں بھی پڑھتی ہوں وہ بولیں۔ اسی وقت تھائرا

بھی اندر آگئی۔ تھائرا کو دیکھ کر عالیہ نے بھی اس بات کی تصدیق کر دی۔ اب ان دونوں کا عجیب حال ہو گیا۔ کبھی روتی تھیں، کبھی ہنستی تھیں۔ پھر گلنار بیگم نے عالیہ سے کہا "دیکھا.......... تم بلا وجہ ڈر گئیں، یہ تو اخبار والے ہیں اور تمہارے نانا سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ یہ پولیس والے نہیں.........."

"میں اب بھی نہیں سمجھا" عمر نے کہا۔

"کیا نہیں سمجھے؟" ڈیڈ نے پوچھا۔

"مجھے لگتا ہے کہ انہوں نے پر سکون ہو جانے کی اداکاری کی تھی..........ان لوگوں کو ٹالنے کے لئے" عمر نے کہا "بہرحال پھر تم نے جبار شاہ کے متعلق پوچھا؟"

"میں نے کہا، ہمارے اخبار کے ایڈیٹر صاحب، شاہ صاحب سے کچھ بات کرنا چاہتے ہیں۔ معاملہ بہت اہم ہے۔ وہ بولیں.......... وہ گھر پر نہیں ہیں، گھر آئیں گے تو میں آپ کا پیغام دے دوں گی۔ آپ لوگوں کے رکنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ آپ کی موجودگی میں وہ گھر ہی نہیں آئیں گے۔ میرے اصرار پر انہوں نے کہا "اچھا" میں انہیں صبح دس بجے تک تمہارے دفتر ضرور بھیج دوں گی، اب بتائیں، میں ان کی بات پر یقین نہ کرتا تو کیا کرتا؟"

صدیق نے افسردگی سے سرہلاتے ہوئے کلاک کو دیکھا۔ دس بج چکے تھے۔

عمر نے کہا "یہ نہ بھولو کہ محتاط رہنا ان کی ضرورت ہے۔ ویانا میں جبار شاہ بال بال بچا تھا۔ اب بھی اگر بھارتیوں کو معلوم ہو جائے کہ وہ یہاں پیرس میں ہے تو وہ اسے ٹھکانے لگانے کی کوشش ضرور کریں گے۔"

"ان کے درمیان کوئی سگنل طے رہا ہو گا" ڈیڈ نے خیال آرائی کی "جس سے جبار شاہ کو پتا چل جاتا ہو گا کہ اس وقت گھر آنے میں عافیت نہیں۔ اس کے باوجود میرا خیال ہے کہ تمہیں وہیں رکنا چاہئے تھا۔"

"میں تمہاری جگہ ہوتا تو ان دونوں کو یہاں لے آتا۔ پھر جبار شاہ خود آجاتا" صدیق نے وقار سے کہا "اب وہ کیوں آنے لگا۔ ضرورت کیا ہے اسے.........."

"اب یہ باتیں چھوڑو" عمر نے تیز لہجے میں کہا "اب وہاں کوئی بھی نہیں ہو گا۔ اگر انہیں بھاگنا تھا تو وہ وقار کے نکلنے کے آدھے گھنٹے بعد ہی وہ مکان چھوڑ گئے ہوں

گے۔"

وقار نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ وہ شرمندہ ہو رہا تھا۔ نیلوفر نے کاٹ دار نظروں سے صدیق کو دیکھا "تم لوگ اس کے پیچھے کیوں پڑ گئے ہو۔ اس نے اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق درست فیصلہ کیا ہے" یہ کہہ کر وہ وقار کی طرف مڑی "تم میرے بھائی، اپنا دل نہ چھوٹا کرو۔ انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے" عمر نے وقار کے کندھے تھپتھپائے "وہ دھوکے باز تو نہیں لگتے۔ جانے کیا بات ہے..........؟"

وہ کچھ دیر خاموش بیٹھے رہے۔ دس بج کر بیس منٹ ہو چکے تھے۔

"اور پھر گلنار نے کوئی یقینی وعدہ تو نہیں کیا تھا" عمر نے کہا "اور ہم انتظار کے سوا کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ اب ہم انہیں جا کر دیکھ بھی نہیں سکتے۔ اگر ان کا ارادہ کچھ اور تھا تو اس وقت وہ وہاں نہیں ہوں گے اور اگر وہ نیک نیت ہیں تو ہمیں دوبارہ وہاں دیکھ کر بھڑک جائیں گے۔"

پھر خاموشی چھا گئی۔ عمر سگریٹ کے کش لیتا رہا۔ ڈیڈ سامنے رکھے کاغذ پر بے معنی لکیریں کھینچ رہا تھا۔ نیلوفر سرگوشی میں وقار سے کچھ بات کر رہی تھی۔ وقار بہت اداس اور دل گرفتہ نظر آ رہا تھا۔ صدیق سگریٹ پھونکتے ہوئے کلاک کو دیکھے جا رہا تھا۔

ساڑھے دس بجے صدیق پھٹ پڑا "بھئی.......... آپ لوگ جو چاہیں، کریں۔ میں نے بھی پچھلے ایک ماہ میں آپ لوگوں ہی کی طرح ذمے داری نبھائی ہے۔ اب میں اس موقع کو ضائع ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔ میں ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھا نہیں رہوں گا۔ میں خود وہاں جا کر دیکھتا ہوں.........."

اسی وقت بیرونی دروازے پر دستک ہوئی اور وہ سب پتھر کے بت بن کر رہ گئے۔ صدیق باہر جانے کے لئے اٹھ چکا تھا۔ اس نے دروازہ کھولا۔ اگلے ہی لمحے وہ غصے سے چیخا "تم! مائی گاڈ۔ اس موقعے پر تم نازل ہو گئے۔ میں نے تم سے کہا تھا کہ آئندہ اس دفتر میں قدم نہ رکھنا۔"

تب انہوں نے دیکھا، دروازے میں گرشا کھڑا تھا۔ اخبار کو ٹپ فراہم کرنے والا.......... فیچرز کے لیے مواد فراہم کرنے والا مشرقی یورپین گرشا! ہمیشہ کی طرح اس کے

ہاتھوں میں رین کوٹ تھا جس کی رنگت اڑ چکی تھی۔ کوٹ کے کالر کے نیچے وہی مفلر باندھے ہوئے تھا جو اپنے رنگوں اور ڈیزائن کی وجہ سے سب کو یاد رہتا تھا۔ اس کی انگلیوں میں ایک پن دبی تھی جس سے سگریٹ کا ایک ٹوٹا منسلک تھا۔ اس کے چہرے پر پھڑکتے ہوئے عضلات اس کے نروس ہونے کی گواہی دے رہے تھے۔ اس کی بڑی بڑی چمکیلی آنکھوں سے خوف زدگی جھلک رہی تھی۔

صدیق کی دھاڑ سن کر اس کا چہرہ سپید پڑ گیا لیکن وہ پلٹ کر بھاگا نہیں۔ اپنی جگہ کھڑا رہا۔ اس کی نگاہیں اندر موجود لوگوں کے چہروں کو ٹٹول رہی تھیں۔ اس کے ہونٹ ہلے۔ اس نے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن آواز نہیں نکلی۔

"میرا خیال ہے' تم شرافت کی زبان نہیں سمجھتے" صدیق' گرشا پر پھر دہاڑا "میں نے تمہیں منع کیا تھا کہ اب یہاں نہ آنا۔ تم نہیں مانے۔ اب تو میں تمہیں ٹھوکریں مار کر ہی نکالوں گا یہاں سے تب تمہاری سمجھ میں میری بات آئے گی.........."

صدیق کا ہاتھ گرشا کو دھکا دینے کے لیے حرکت میں آیا ہی تھا کہ نیلوفر چیخ اٹھی "صدیق.........خبردار' یہ اچھا آدمی ہے۔ اس سے کبھی کسی کو تکلیف نہیں پہنچی.........."

لیکن اس سے زیادہ موثر عمر کا حکمیہ انداز تھا "صدیق ہٹ جاؤ۔ انہیں اندر آنے دو اور دروازہ بند کر دو۔ اب میں سب کچھ سمجھ گیا ہوں۔ اگر ہم میں سے کسی کے پاس دماغ ہوتا تو یہ مسئلہ پہلے ہی حل ہو گیا ہوتا۔ آیئے......... تشریف لایئے شاہ صاحب۔"

وہ شخص جسے وہ لوگ گرشا کے نام سے جانتے تھے' اب بھی دروازے میں کھڑا تھا۔ اس نے کہا "آپ نے مجھے بلوایا ہے عمر صاحب؟" اس بار وہ اردو میں گویا ہوا تھا۔

"جی ہاں شاہ صاحب۔ تشریف لایئے' ہمیں آپ کی مدد کی اشد ضرورت ہے۔"

اس جملے کا اثر سب نے دیکھ لیا۔ 'مدد کی اشد ضرورت ہے' نے جیسے گرشا کی پوری شخصیت ہی بدل دی۔ اس کے قدموں میں مضبوطی آگئی۔ چہرہ خود اعتمادی سے روشن ہو گیا۔ آنکھیں چمکنے لگیں۔ اس نے بڑے باوقار انداز میں چوکھٹ عبور کی۔ وہ درمیان میں رکا اور اس نے نیلوفر کو مشفقانہ مسکراہٹ سے نوازا "تم بہت پیاری بیٹی ہو نیلوفر" پھر اس نے رین کوٹ ایک کرسی کی پشت گاہ پر ڈالا اور عمر سے کہا "میں ہر خدمت

کے لئے حاضر ہوں ایکسی لینسی۔"

☆==========☆==========☆

جب وہ دونوں کمرے میں اکیلے رہ گئے تو کام کی باتیں شروع ہوئیں۔ عمر نے پوچھا۔ "آپ کو معلوم ہے کہ میں نے آپ کو کیوں بلوایا تھا؟"

جبار شاہ نے اثبات میں سرہلاتے ہوئے کہا۔ "جی ہاں۔ پارک میں میری نیلوفر بیٹی سے ملاقات ہوئی تھی۔ اس سے کسی حد تک معلوم ہو گیا تھا ورنہ شاید میں آنے کی ہمت نہ کرتا۔ یہ معاملہ آپ کے اس رپورٹر کا ہے نا جو اس وقت کشمیر میں پھنسا ہوا ہے؟"

"یہ تو خوش قسمتی تھی ہماری کہ نیلوفر پارک میں آپ سے ٹکرا گئی۔ شاہ صاحب' مجھے افسوس ہے کہ ہمارے ہاں آپ سے اچھا برتاؤ نہیں کیا گیا۔ بہرحال اسے تو اب پرانی بات سمجھیں۔ یہ بتائیں شاہ صاحب کہ کیا آپ کے پاس واقعی ایسے دستاویزی ثبوت ہیں جن سے بھارت کے وزیر داخلہ خواجہ مقصود پر دباؤ ڈالا جا سکتا ہے؟"

منحنی جبار شاہ چند لمحے خاموش رہا اور اپنی سگریٹ کو دیکھتا رہا جو' اب اس کی انگلیاں جلانے والی تھی۔ پھر اس نے عمر کے پیکٹ میں سے سگریٹ نکال کر سلگائی' پھر اس نے نگاہیں اٹھائیں تو ان میں شرمندگی تھی "ایکسی لینسی......... میں نے اسے بہت کڑے وقت کے لئے......... اپنی فیملی کی خاطر چھپا کر رکھا ہے۔"

"یعنی ثبوت موجود ہے؟" عمر نے پوچھا۔

"جی ہاں۔"

"یہاں......... آپ کے پاس؟"

"جی نہیں۔"

"تو پھر؟"

"ثبوت کشمیر میں ہے۔"

"مائی گاڈ!" عمر کے لہجے میں مایوسی تھی۔

"یہ زیادہ بہتر ہے ایکسی لینسی" جبار شاہ نے کہا۔ "وہ میں نے ایسی جگہ چھپایا ہے جہاں کوئی نہیں پہنچ سکتا اور میرے سوا کسی کو بھی معلوم نہیں۔ یعنی میں زندہ ہوں یا مردہ' کوئی مجھ سے وہ چھین نہیں سکتا۔"

"میں سمجھ گیا لیکن ایک قباحت ہے۔ زندگی اور موت کا کیا بھروسہ۔ خدانخواستہ آپ کا انتقال ہو جائے تو آپ کی فیملی کو اس سے کچھ فائدہ نہیں پہنچ سکے گا اور اگر خواجہ مقصود کا انتقال ہو جائے تو کاغذات بے وقعت ہو جائیں گے۔"

"جی ہاں۔ یہ درست ہے۔" جبار شاہ نے اثبات میں سرہلاتے ہوئے کہا۔

"لہٰذا آپ کا یہ تبصرہ کہ اسے آپ نے فیملی کی خاطر بچا کر رکھا ہے' اتنا مؤثر نہیں ہے۔"

جبار شاہ نے مسکراتے ہوئے سر کو اثباتی جنبش دی۔

"آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ مجھے آپ کی تلاش کیوں تھی اور میں نے آپ کو کیوں بلوایا تھا" عمر نے کہا۔ "میں سمجھتا ہوں کہ آپ کے پاس جو معلومات ہیں' وہ خواجہ مقصود کے لئے اتنی خطرناک ہیں کہ وہ ان کے عوض تیمور کو آزاد کر سکتا ہے۔ میں آپ سے وہ معلومات خریدنا چاہتا ہوں۔"

"میں یہ بات سمجھتا ہوں۔"

"تو آپ نے ان معلومات کی قیمت کا تعین بھی کیا ہو گا اور یہ فیصلہ بھی کیا ہو گا کہ انہیں فروخت کریں گے ورنہ آپ اس وقت یہاں موجود نہ ہوتے۔ خاص طور پر اس صورت میں کہ یہاں آپ کے ساتھ بہت زیادتی ہوئی ہے۔"

"جی ہاں۔ یہی بات ہے۔"

عمر نے سوچا' معاملات ٹھیک چل رہے ہیں۔ اب سودے بازی شروع ہو جانی چاہئے۔ اس نے کہا "آپ جانتے ہیں کہ ہمارے ایک آدمی کی زندگی داؤ پر لگی ہوئی ہے۔ ہم آپ کی فراہم کردہ دستاویزات کی مدد سے اسے بچا سکتے ہیں لیکن وقت اب بہت کم رہ گیا ہے۔ اب یہ بتائیں' آپ اس کے عوض کیا طلب کریں گے؟"

جبار شاہ چند لمحے سوچتا رہا پھر اس نے بڑے دھیمے اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ "میری فیملی کے لئے آزادی اور تحفظ۔ میں نہیں چاہتا کہ میری بیوی اور نواسی یوں خوف زدگی کی زندگی گزاریں اور بھاگی بھاگی پھریں۔ دروازے پر دستک ہو تو خوف زدہ نہ ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ پاکستان میں اپنے اصلی ناموں سے زندگی گزاریں۔ ان کا ایک گھر ہو' ایک وطن ہو۔" اس نے ایک لحہ توقف کیا "اور ان کے

پاس زندگی گزارنے کے لئے دولت ہو۔ دس لاکھ روپے۔ میری نواسی کی شادی ہو دھوم دھام سے۔ میں اسے وہ سب کچھ دینا چاہتا ہوں جو اپنی بیٹی کو نہ دے سکا۔" اس کی آواز لرزنے لگی اور آنکھیں نم ہو گئیں۔ "میں نے اپنی بیٹی کی شادی یہاں کی.......... کرسچن لڑکے سے غلط نام سے۔ دو سال بعد ایک حادثے میں وہ دونوں ختم ہو گئے۔ عالیہ رہ گئی۔ میں عائشہ کا قرض عالیہ کو ادا کر کے چکانا چاہتا ہوں۔ میں اپنی عائشہ کی مسلمانوں کے لحاظ سے تجہیز و تکفین بھی نہ کر سکا۔ اس کی' عالیہ کی تو باقاعدہ شادی کرا دوں" اس نے نظریں اٹھائیں اور پُر تشویش نظروں سے عمر کو دیکھا' جیسے یہ جاننا چاہ رہا ہو کہ کہیں وہ زیادہ مطالبہ تو نہیں کر بیٹھا ہے۔ جیسے اسے ڈر ہو کہ اس کا مطالبہ مسترد کر دیا جائے گا۔

"یہ سب کچھ ممکن ہے" عمر نے کہا۔ "میں اپنے سفیر سے بات کروں گا۔ سفیر اسلام آباد سے رابطہ کرے گا۔ اب سے آٹھ گھنٹے کے اندر اندر آپ کی بیوی اور نواسی پاکستان جانے والی پرواز میں ہوں گے۔ اس وقت تک ہم یہاں ان کے تحفظ کا پورا پورا بندوبست کریں گے۔ انہیں ہم اپنے دفتر کے کسی ساتھی کے گھر پر رکھیں گے۔ شاید آپ کو معلوم نہ ہو کہ بھارتی سفارت خانے والوں نے بھی آپ کی تلاش شروع کر دی ہے۔"

"اور رقم؟"

"ان کی یہاں سے روانگی سے پہلے رقم ڈیپازٹ کرا دی جائے گی .... آپ کے نام پر اور رسید یہاں آپ کو مل جائے گی۔ یہاں کے وقت کے مطابق چھ بجے تک یہ سب کچھ ہو جائے گا۔ اب تو مطمئن ہیں آپ؟ شاہ صاحب' جہاں آدمی کے کسی ساتھی کی زندگی کا سوال ہو' وہاں سودے بازی اور دھوکے بازی تو نہیں کی جا سکتی نا؟"

جبار شاہ مسکرایا۔ "جی ہاں۔ اب میں پوری طرح مطمئن ہوں؟"

"اب آپ بتائیں آپ اپنے حصے کا کام کب اور کیسے کریں گے؟"

"آپ کا کام کرنے کے لئے مجھے کشمیر جانا ہو گا۔" جبار شاہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "مجھے خود خواجہ مقصود سے ملنا ہو گا۔ جب تک دستاویزات اس کے ہاتھ میں نہیں آئیں گی' وہ آپ کے ساتھی کو چھوڑنے کے بارے میں سوچے گا بھی نہیں۔ ہاں' میں اس کے قبضے میں ہوں گا تو وہ تیمور صاحب کو سرحد پار کرا دے گا" یہ کہہ کر وہ مسکرایا۔ "

اب آپ بھی سمجھ گئے ہوں گے عمر صاحب کہ میں بھی انسانی زندگی کے معاملے میں سودے بازی کا قائل نہیں.........."

عمر نے ایک گہری سانس لی۔ اب وہ اچھی طرح سمجھ گیا تھا کہ جبار شاہ کیا پیش کر رہا ہے.......... کیا بیچ رہا ہے۔ وہ اپنی فیملی کے تحفظ اور بقا کی خاطر تیمور حسین کی زندگی کے بدلے اپنی زندگی دے رہا تھا۔ کشمیر سے اس کی بعافیت واپسی کا امکان نہ ہونے کے برابر تھا۔

اب عمر کے سامنے ایک اور ٹیڑھا فیصلہ تھا۔ جبار شاہ تو اپنا فیصلہ کر چکا تھا۔ وہ بزدل آدمی تھا۔ وہ بزدل آدمی جو ہر تذلیل برداشت کرتا رہا تھا' زندگی کے لئے بھاگا بھاگا پھرتا رہا تھا' اس وقت ایک نڈر اور بہادر آدمی کے روپ میں اس کے سامنے بیٹھا تھا۔

عمر سوچ رہا تھا کہ اس کے سامنے ایک ایسا فیصلہ ہے جو کر لیا گیا تو واقعات کا ایک ایسا تسلسل شروع ہو کر اپنے منطقی انجام کی طرف بڑھے گا جسے روکنا اس کے اختیار میں نہیں ہو گا۔ ایسا ہی ایک فیصلہ وہ پہلے بھی کر چکا تھا.......... تیمور حسین کو اسلام آباد بھیجنے کا فیصلہ! اور اس کا منطقی انجام سری نگر کی عدالت سے تیمور حسین کے لئے پھانسی کی سزا تھی اور اب وہ تیمور کو بچانے کے لئے ایک اور شخص کو موت کی طرف روانہ کر رہا تھا۔ ایک ایسے بہادر اور حوصلہ مند شخص کو جو اپنے پیاروں کو زندگی دینے کے لئے موت قبول کرنے کا حوصلہ رکھتا تھا۔

عمر سوچ رہا تھا کہ کیا تیمور میں اس طرح کا حوصلہ ہے.......... اور کیا خود اس میں ہے یہ حوصلہ؟ عمر نے اس محبت کے بارے میں سوچا جو تیمور کو تسکین سے تھی۔ اس نے سوچا' میں اپنے روبرو موجود اس شخص کی زندگی خرید رہا ہوں.......... تسکین کے لئے۔
اس کے وہ چند لمحے موازنے میں گزر گئے کہ کون بہتر انسان ہے۔ تیمور' اپنی خواہشات' اپنے تصورات کا اسیر جو ہر مخالف کو پامال کرنے کا عادی ہے' جو ایک لمحے کو بھی یہ نہیں سوچتا کہ اس کے کیے کی سزا کس کس کو بھگتنا پڑے گی یا پھر یہ بے وقعت اور مختصرالوجود انسان جبار شاہ جو پہلی بار کڑے وقت میں اپنے آقا کا ساتھ چھوڑ گیا تھا' جس نے اہم نوعیت کی حساس دستاویزات چرا لیں اور اپنی زندگی کو خطرے میں ڈالا.......... صرف اپنی کھال بچانے کے لئے۔

ان دونوں کی طاقت ان کی مہلک کمزوریوں میں پنہاں تھی۔ ان کی کمزوریاں صرف ان کے لئے ہی نہیں' ان کے اپنے معاشروں کے لئے بھی خطرناک تھیں لیکن آزمائش کا وقت آیا تو وہ دونوں مردوں کی طرح مرنے کے لئے تیار تھے لیکن عمر کو غصہ اس بات پر آ رہا تھا کہ تقدیر نے اسے ان دونوں کا ریفری بنا دیا تھا۔ یہ بوجھ بہت بڑا اور خوامخواہ کا بوجھ تھا۔

اسے تسکین کا خیال آیا جو اسلام آباد میں اس کے فون کی منتظر بیٹھی ہو گی.......... یہ جاننے کے لئے کہ تیمور حسین زندہ رہے گا یا مر جائے گا۔
اس نے سوچا' مجھے سوچنے کے لئے کچھ اور مہلت مل جاتی۔ ڈیڈلیپ ہام سے تبادلۂ خیال کا موقع مل جاتا۔ اس کی رائے معلوم کرتا لیکن اس خواہش کے ساتھ ہی اسے یہ احساس بھی تھا کہ اس معاملے میں ڈیڈ سے یا کسی سے بھی تبادلہ خیال نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی تمام سوچیں' اس کے خیالات' اس کی فکر مندی.......... یہ سب اس کی انسانی کمزوریوں کے سوا کچھ بھی نہیں اور اب ان کمزوریوں کے لئے اس کے پاس فرصت ہی نہیں ہے۔

پھر اس کے شکوک پر ایک واضح سچ غالب آ گیا اور وہ سچ یہ تھا کہ کہ فیصلہ نہایت سادہ اور آسان ہے۔ یہ فیصلہ ہر اس انسان کو کرنا پڑتا ہے جو کچھ لوگوں کا لیڈر ہو' لاکھوں کروڑوں کا ہو یا دس بیس کا۔ یہ ازل سے ہوتا رہا ہے۔ کون اپنا ہے کون پرایا۔ اپنے کسی آدمی کو بچانے کے لئے کسی اور کے آدمی کو قربان کرنا۔
عمر نے جان لیا کہ اپنے افعال کے نتائج سے آدمی پوری طرح کبھی فرار حاصل نہیں کر سکتا۔ نقصان کی کسی حد تک تلافی ضرور کی جا سکتی ہے۔ سزا کم ہو سکتی ہے لیکن یہ ممکن نہیں کہ افعال کی سلیٹ سے تحریر بالکل مٹا دی جائے۔ اس کے ضمیر پر ایک انسان کی موت کا بوجھ بہرحال رہتا تھا۔
اس نے فیصلہ کر لیا کہ بوجھ اپنی مرضی کا ہوتا ہے تو جبار شاہ زیادہ بہتر ہے۔
"میں سمجھ گیا" بالآخر اس نے جبار شاہ سے کہا۔ "ہمیں ایسی کوئی ترکیب کرنا ہو گی کہ تیمور کے ساتھ آپ کو بھی وہاں سے نکالا جا سکے۔"
اس بار جبار شاہ مسکرایا نہیں۔ اس کے لہجے میں بھی سنگینی تھی۔ "جی ہاں۔ ظاہر

ہے۔"

دونوں کی نظریں ملیں۔ دونوں کے ہاں وہ تفہیم تھی جو نہایت خوف ناک حقیقت بیان کرنے سے گریز کا نتیجہ ہوتی ہے۔ جہاں لفظ بہت برہنہ، بہت سفاک ہو جاتے ہیں۔

عمر نے ریسیور اٹھایا اور زرینہ سے کہا۔ "پاکستانی سفیر سے بات کراؤ۔ خواہ وہ کہیں ہوں۔ کہہ دینا کہ یہ ایمرجنسی ہے۔"

بعد میں وہ دونوں تیمور کی رہائی کے سلسلے میں اپنا لائحہ عمل ترتیب دیتے رہے۔

سری نگر سے اطلاع آ چکی تھی کہ پاکستانی جاسوس تیمور حسین کو سزائے موت سنا دی گئی ہے۔ اگر رحم کی اپیل مسترد کر دی گئی تو اگلے چوبیس گھنٹوں میں کسی بھی وقت سزا پر عمل درآمد ہو سکتا ہے۔ اس کے وکیل نے رحم کی اپیل کر دی تھی۔

"اگر خواجہ مقصود نے یا کسی اور نے مداخلت نہیں کی تو اسے کل صبح طلوع آفتاب سے پہلے پھانسی دے دی جائے گی" جبار شاہ نے تبصرہ کیا۔

گویا ان کے پاس اٹھارہ گھنٹے کی مہلت تھی!

"ایک بار پھر منصوبے کو جانچ لیں کہ کوئی خامی تو نہیں رہ گئی۔" عمر نے کہا۔ "یہ ڈیل براہ راست آپ کے اور خواجہ کے درمیان ہونی ہے۔ اگر دستاویزات خواجہ مقصود کے لئے واقعی بہت اہم ہیں تو وہ تیمور کو آزاد کرنے پر مجبور ہو جائے گا۔"

جبار شاہ نے بے حد سنجیدگی سے کہا "میں سمجھتا ہوں، وہ دستاویزات اس کے لئے پہلے کے مقابلے میں اب زیادہ خطرناک ہیں۔ پہلے تو وہ صرف حکومت سے نکالا جاتا اور طویل عرصے تک زیر عتاب رہتا۔ اب تو اسے غدار قرار دے کر پھانسی پر چڑھایا جائے گا اور وہ دوسروں کے لئے مثال بنے گا۔"

عمر نے سر کو تفہیمی جنبش دی۔ "امید تو یہی ہے۔ ہاں تو متفقہ منصوبے کے مطابق خواجہ کو یہ کرنا ہو گا کہ تیمور کو سرحد پار کر کے تسکین تک پہنچا دے۔ تسکین آپ کو مطلع کر دے گی اور آپ دستاویزات خواجہ کے حوالے کر دیں گے۔ سوال یہ ہے کہ ہم خواجہ کو اس پر رضامند کر سکیں گے؟ کیونکہ پہلا قدم اسے اٹھانا ہو گا۔ تیمور کو آزاد کر کے۔"

"میری حیثیت گارنٹی کی سی ہے" جبار شاہ نے کہا "اس وقت میں اس کے لئے

تمہارے ساتھی سے کہیں زیادہ اہم ہوں گا اور میں اس کے قبضے میں ہوں گا۔"

"یہ تو ٹھیک ہے لیکن وہ آپ پر تشدد کر کے معلوم کر سکتا ہے کہ دستاویزات کہاں چھپائی گئی ہیں۔"

جبارہ شاہ نے ہونٹ سکوڑتے ہوئے کہا۔ "مجھ پر تشدد پہلے بھی کیا جا چکا ہے۔ یقین کرو، چوبیس گھنٹے تو بدترین تشدد کے سامنے بھی جھیل جاؤں گا۔ اگر اس وقت تک میری یا خواجہ کی طرف سے مثبت رد عمل سامنے نہ آئے تو تم بھارتی حکومت کو مطلع کر دینا.......... اپنی انٹیلی جنس کے ذریعے۔ ان سے کہنا، کشمیر کی کیبنٹ بلڈنگ کے کمرا نمبر تین کے روشندان میں اہم دستاویزات چھپی ہیں۔ میں تمہیں نقشہ بنا کر دوں گا۔"

"واہ.......... کاغذات چھپانے کی جگہ خوب سوچی آپ نے" عمر نے اسے داد دی۔ "خواجہ کی ناک کے عین نیچے.......... لیکن آپ کو یہ یقین کیوں ہے کہ کاغذات اب بھی وہیں موجود ہیں؟"

"میری تلاش اب بھی جاری ہے۔ تم نے خود بتایا ہے کہ بھارتی سفارت خانہ میری تلاش میں لگ گیا ہے۔ کیوں؟ میری کوئی اہمیت نہیں۔ اہمیت ان کاغذات ہی کی ہے۔" جبار شاہ کچھ دیر کے لئے خاموش ہو گیا۔ پھر بولا "نہیں دوست، خواجہ کو جب تک وہ کاغذات نہیں مل جاتے اور وہ انہیں تلف نہیں کر دیتا، وہ مجھے چھو بھی نہیں سکتا۔"

"اور اس کے بعد؟"

جبار شاہ نے گہری سانس لی۔ "وہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔ میں اس سے نمٹ لوں گا۔ اس وقت ذاتی انتقام کی اتنی اہمیت نہیں۔ مجھے کچھ نہیں ہو گا۔"

عمر بہت غور سے اسے دیکھا رہا تھا۔ سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ کہیں وہ اسے خواہ مخواہ اطمینان دلانے کی.......... اس کے ضمیر کا بوجھ ہلکا کرنے کی کوشش تو نہیں کر رہا ہے۔ یا جو کچھ اس نے کہا ہے، اس میں کسی حد تک سچائی بھی ہے لیکن وہ جانتا تھا کہ واسطہ نہایت بے رحم اور سفاک لوگوں سے ہے۔ "بات یہ ہے کہ جاسوسوں کے لئے موت کی سزا کی تجویز خود خواجہ مقصود کی ہے۔" اس نے کہا۔ "اگر تمہارے پاس موجود دستاویزات اس کے لئے موت کے حکم نامے کی حیثیت رکھتی ہیں تو بھی کیا وہ تیمور کو آزاد کرنے کی ہمت کر سکے گا؟ اس طرح اس کے خلاف شکوک پیدا نہیں ہوں گے؟

اسے کیسے قائل کیا جائے گا؟"

جبار شاہ پھر مسکرایا۔ "دو برائیوں سے کسی ایک کا چناؤ ضروری ہو تو کون ہچکچاتا ہے۔ فوراً" ہی چھوٹی برائی کو چن لیا جاتا ہے۔ خواجہ کی ان سرگرمیوں کا ثبوت سامنے آنے کا مطلب خواجہ کی یقینی موت ہے۔ تو یقینی موت پر آدمی شکوک کو بہ آسانی فوقیت دے سکتا ہے۔ تیمور کی رہائی کی تو وہ بھی وضاحت کر سکتا ہے۔ وہ تو سیاہ کو سفید ثابت کر سکتا ہے۔ ایسا ہی ابن الوقت ہے وہ اور وہ حکومت کو قائل بھی کر سکتا ہے۔"

زرینہ دروازے میں نمودار ہوئی "اسلام آباد کی فلائٹ سات بجے روانہ ہو گی۔ مادام گلنار، اور مس عالیہ کے کاغذات وہاں تیار ملیں گے۔ فی الوقت وہ وقار کے گھر پر ہیں اور وہیں سے ائرپورٹ کے لئے روانہ ہوں گی" اس نے بتایا "میجر شبیر سے بات ہو گئی ہے۔ شاہ صاحب کا پیغام خفیہ طور پر خواجہ مقصود تک پہنچانے کا بندوبست کر لیا گیا ہے۔ بینک سے رابطہ ہو گیا ہے۔ دو گھنٹے بعد اسلام آباد، حبیب بینک آبپارہ برانچ سے دس لاکھ روپے کے ڈیپازٹ کی رسیدوں کی فیکس کاپی آ جائے گی۔ انقلاب کراچی کے حشمت صاحب نے آپ کے لئے پیغام چھوڑا ہے کہ مالی معاملات کی طرف سے بے فکر کر اپنا کام کریں۔"

"شکریہ زرینہ۔" عمر نے کہا۔ پھر وہ جبار شاہ کی طرف مڑا "دیکھ لیں، کام کتنی تیزی سے ہو رہا ہے۔" اس کے لہجے میں طمانیت تھی "یہ بتائیں، آپ کشمیر کیسے پہنچیں گے؟"

"مقبوضہ کشمیر والوں کو صرف یہ بتانا ہو گا کہ خواجہ مقصود کا مہمان آ رہا ہے۔" جبار شاہ نے بے حد سکون سے کہا۔ "اول تو میرا پیغام ملتے ہی خواجہ خود اس کا بندوبست کرے گا۔"

"آپ سفیر صاحب کے ساتھ خصوصی پرواز کے ذریعے اسلام آباد پہنچیں گے۔" عمر نے بتایا۔ "آپ کی بیوی اور نواسی چار گھنٹے بعد پی آئی اے کی فلائٹ سے جائیں گی۔ اسلام آباد سے آپ کو میجر شبیر کے پاس ایئرپورٹ پہنچا دیا جائے گا۔"

"گلنار اور عالیہ کو یہ تو نہیں بتایا گیا کہ میں مقبوضہ کشمیر جاؤں گا؟" جبار شاہ نے پوچھا۔

"جی نہیں۔ ہم نے آپ کی ہدایت پر پوری طرح عمل کیا ہے۔ آپ کا خط وقار نے انہیں دے دیا تھا۔ انہیں بتایا گیا ہے کہ آپ ایک ہفتے بعد اسلام آباد میں ان سے آ ملیں گے۔"

"ایک ہفتہ!" جبار شاہ نے آہ بھر کے کہا۔ "کون جانے۔ ممکن ہے، میں دو تین دن میں ہی واپس آ جاؤں۔"

واپس آ جانا، عمر کی سماعت کو عجیب سا لگا۔ ساتھ ہی اسے اپنی پوزیشن پھر یاد آ گئی۔ درحقیقت وہ جلاد کا کردار ادا کر رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ مختصرالوجود جبار شاہ اب کبھی واپس نہیں آئے گا۔ بلکہ اس بات کی ضمانت بھی نہیں تھی کہ جبار شاہ کی قربانی رائیگاں نہیں جائے گی۔

"عمر صاحب......... آپ نے جو کچھ میرے......... میری فیملی کے لئے کیا، میں اس پر آپ کا شکر گزار ہوں۔" جبار شاہ نے بے حد خلوص سے کہا۔

انہوں نے ساتھ کھانا کھایا۔ پھر زرینہ فیکس سے آئی ہوئی بینک کی رسیدیں لے آئی۔ جبار شاہ کے نام حبیب بینک، آبپارہ برانچ اسلام آباد میں دس لاکھ روپے جمع کرا دیئے گئے تھے۔

کھانے سے فارغ ہوتے ہوتے دو بج گئے۔ جبار شاہ نے کہا "اب مجھے چلنا چاہئے۔"

"باہر گاڑی موجود ہے۔ وہ آپ کو سفارت خانے پہنچا دے گی۔ وہاں سے آپ سفیر صاحب کے ساتھ جائیں گے۔"

جبار شاہ نے کہا "میں ایک بار پھر آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں عمر صاحب۔"

دونوں نے گرمجوشی سے ہاتھ ملاتے ہوئے ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانکا۔ دونوں کی نگاہوں میں یہ یقین تھا کہ اب وہ کبھی ایک دوسرے کی صورت نہیں دیکھ سکیں گے۔ عمر کو یہ بات تعجب خیز لگی کہ جبار شاہ کی شخصیت یکسر بدل گئی تھی......... اب وہ کوئی کمزور اور حقیر آدمی نہیں لگ رہا تھا بلکہ اب وہ اپنے قد سے بڑا دکھائی دیتا تھا۔

"گڈ لک شاہ صاحب!" عمر نے کہا۔

"شکریہ" جبارہ شاہ نے کہا اور جانے لگا۔ جاتے جاتے وہ پلٹا "مجھے خوشی ہے کہ

میری بیوی اور نواسی اب عزت اور وقار کے ساتھ جی سکیں گی۔ ان کا خیال رکھنا عمر صاحب۔"

اس کے جانے کے بعد عمر دیر تک اداس بیٹھا رہا۔ اس پر عجیب سا اضمحلال طاری ہو گیا تھا۔ اب اس میں یہ سوچنے کی ہمت بھی نہیں رہی تھی کہ جبار شاہ کے اس سفر کا انجام کیا ہو گا۔ تیمور کی جان بچ سکے گی یا نہیں۔ جو کچھ اس کے بس میں تھا' وہ کر چکا تھا۔ اب جو ہو سو ہو۔

پھر اسے خیال آیا کہ اسے فون پر تسکین اور میجر شبیر سے طے شدہ شیڈول کے متعلق گفتگو کرنی ہے۔

☆===========☆===========☆

تیمور اب اس کوٹھری میں تھا جس میں سزائے موت پانے والے مجرموں کو رکھا جاتا تھا۔ فیصلہ سنانے کے بعد اسے اس کوٹھری میں لایا گیا تھا۔ پروفیسر گروداس ابھی اس سے ملنے کے لئے آیا تھا وہ بہت خوش تھا اور تیمور کے لئے ترحم اور شکر گزاری کا جذبہ محسوس کر رہا تھا۔ تیمور نے عدالت میں جو کارکردگی دکھائی تھی اس نے حکام کی نظروں میں گروداس کو سرخرو کر دیا تھا۔ اس کی پوزیشن اور بہتر ہو گئی تھی۔

"میں تمہیں الوداع کہنے آیا ہوں۔" پروفیسر تیمور نے کہا۔

"تم نے اپنا کام بخوبی انجام دیا۔ مجھے تم پر فخر ہے۔ تم ایک لفظ بھی نہیں بھولے۔ مجھے تمہارے اس انجام پر افسوس ہے۔ مجھے ترس آ رہا ہے تم پر۔ میں تمہیں یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ میں تمہارے لئے افسردہ ہوں۔"

"افسردہ! وہ کیوں؟ اور یہ ترس کیا ہوتا ہے؟" تیمور کی سمجھ میں اس کی بات بالکل نہیں آئی۔

"پروفیسر نے کھنکار کر گلا صاف کیا "رحم کی اپیل تو دائر کر دی گئی ہے۔ ابھی اس کی سماعت نہیں ہوئی۔ میں خود اس پر رحم کی سفارش درج کروں گا۔"

یہ صریحاً جھوٹ تھا۔ پروفیسر کا ایسی کوئی حرکت کر کے اپنی پوزیشن کو خطرے میں ڈالنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا لیکن اس کے سامنے بیٹھے ہوئے دیو قامت' خوبرو شخص کو اس سفارش سے کوئی غرض نہیں تھی۔ اس نے پوچھا "آپ نے ایسا کیوں کیا؟ آپ جانتے ہیں کہ میں موت کا ہی مستحق ہوں۔"

پروفیسر کا منہ بن گیا۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا "بس' میں تمہیں یہ بتانا چاہتا تھا" یہ کہہ کر وہ کوٹھری سے نکل گیا۔

اس کے بعد ڈاکٹر موہن منیم اس سے ملاقات کے لئے آیا۔ وہ چند منٹ اس کے پاس بیٹھا رہا۔ چپ چاپ۔ پھر بولا "کیا حال ہے؟"

تیمور نے کوئی جواب نہیں دیا۔ خلاؤں میں گھورتا رہا۔

"مجھے جانتے ہو؟" ڈاکٹر موہن نے پوچھا۔

"جی ہاں۔"

"کیا سوچ رہے ہو؟"

"سوچ رہا ہوں کہ آپ مجھ سے خوش ہیں یا نہیں۔ کہیں میری پٹائی کرنے کے لئے تو نہیں آئے؟"

ڈاکٹر دل ہی دل میں مسکرا دیا۔ اس بچکانہ لفظ "پٹائی" نے اس کا دل خوش کر دیا تھا "تمہارا کیا خیال ہے' تم پٹائی کے مستحق ہو؟" اس نے پوچھا۔

"مجھے نہیں معلوم" تیمور نے کہا "مجھے پتا نہیں ہوتا کہ آپ کیا کہنے والے ہیں۔ شاید مجھے اور بہتر کوشش کرنی چاہئے تھی' انہیں سمجھانا چاہئے تھا کہ میں کس قدر شرمندہ ہوں' کتنا افسوس ہے مجھے۔ آپ کا کیا خیال ہے' سبھی لوگ سمجھ گئے تھے میری بات؟"

"ہاں۔ میرا خیال ہے' سبھی لوگ سمجھ گئے" ڈاکٹر نے سر ہلاتے ہوئے کہا "یہ بتاؤ' تم کیسا محسوس کر رہے ہو؟"

ڈاکٹر موہن کی موجودگی میں تیمور ہمیشہ الجھ جاتا تھا۔ وہ اس کے پاس نہ ہوتا تو کبھی اسے اس سے نفرت محسوس ہوتی اور کبھی شدید محبت۔ اور اس کی موجودگی میں اس کی ایک ہی خواہش ہوتی تھی......... اسے خوش کرنے کی "ٹھیک ٹھاک محسوس کر رہا ہوں۔" اس نے جواب دیا۔

"تمہارے ساتھ برتاؤ کیسا رکھا گیا؟"

"اس سے بہتر جس کا میں مستحق تھا" تیمور نے جواب دیا۔

"کوئی خواہش ہو تو بتاؤ۔ میں تمہارے لئے کیا کر سکتا ہوں؟"

"ان سے کہیں کہ جلدی کریں۔ مجھے اتنا انتظار کیوں کرا رہے ہیں؟"

"تم پھانسی پانا چاہتے ہو' ہے نا؟"

"جی ہاں۔"

ڈاکٹر موہن اٹھ کھڑا ہوا۔ "اب تمہیں زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔" وہ بولا "اب تم سونے کی کوشش کرو" یہ کہہ کر وہ پلٹ کر اسے دیکھے بغیر کوٹھری سے نکل گیا۔ وہ اس وقت اپنے جسم میں سنسنی دوڑتی محسوس کر رہا تھا۔ اسے کشمیر اور اس کے مستقبل سے کوئی دلچسپی نہیں تھی لیکن اپنے کام میں اس کی دلچسپی بہت زیادہ تھی۔ یہ کامیاب تجربہ ایک مقالے کا متقاضی تھا۔ اس وقت وہ دل ہی دل میں اپنے مقالے کا عنوان سوچ رہا تھا۔ تھکن' بے آرامی اور مصنوعی احساس جرم کی معاونت کرنے والی دوائیں اور خود تنویمی کا عمل۔ اس نے سوچا' یہ غیر رواں اور اتنا طویل عنوان تو مناسب نہیں رہے گا۔ خیر عنوان سوچنے میں کیا وقت لگے گا..........

وہ اب تک کئی افراد کو اسی طرح تباہ کر چکا تھا لیکن تیمور حسین کی بات ہی کچھ اور تھی۔ اتنا تندرست و توانا' اتنا گرانڈیل' اتنی مضبوط قوت ارادی کا مالک! ایسے آدمی کو تسخیر کرنا ایک غیر معمولی کام تھا۔ سب سے بڑی کامیابی تھی۔ سب سے بڑی بات یہ کہ اس نے اس پروسس میں شارٹ کٹ دریافت کئے تھے اور یہ کارنامہ صرف چھ ہفتے میں انجام دیا تھا۔ وہ بہت خوش تھا۔

☆============☆============☆

سب کچھ پروگرام کے مطابق ہوا تھا اور اب جبار شاہ کشمیر میں تھا۔ خواجہ مقصود سے اس کا رابطہ ہو گیا تھا اور مقبوضہ کشمیر جانے کی اجازت بھی مل گئی تھی۔ اب وہ میجر شبیر کی جیپ میں بیٹھا تھا۔ جیپ اس طے شدہ مقام کی طرف دوڑ رہی تھی جہاں سے اسے سرحد پر کرنا تھی۔

اندھیرے میں جانے پہچانے پہاڑ پُرہیبت معلوم ہو رہے تھے۔ جبار شاہ ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ جانے پہچانے مناظر اسے کھینچ کر ماضی میں لے گئے۔ اسے اپنا لڑکپن' اپنی جوانی' اپنے عزائم یاد آئے۔ اپنی محبت اور شادی یاد آئی۔ یہ سب کچھ اسی سرزمین پر ہوا تھا۔ یہ جنت اس وقت منقسم نہیں تھی لیکن ڈوگرہ راج کے مظالم تلے دبی ہوئی سسک رہی تھی۔

وہ یادوں کی بھول بھلیوں میں بھٹک گیا۔ اسے اپنا گھر' اپنے ماں باپ' بہن بھائی یاد آئے۔ پرانے..........بھولے بسرے منظر ذہن کی اسکرین پر چلنے لگے۔ اس نے بڑی

دشواریوں سے تعلیم حاصل کی تھی۔ ان دنوں حصول تعلیم بہت مشکل کام تھا۔ اس نے طبقاتی تقسیم و تفریق دیکھی تھی۔ طاقت ور کو کمزور پر امیر کو غریب پر ظلم کرتے دیکھا تھا۔ اگرچہ وہ ایک دین دار گھرانے سے تعلق رکھتا تھا لیکن یہ سب کچھ دیکھنے کے بعد احساس ہوا کہ زندگی کی جنگ دو مختلف مذاہب کے پیروکاروں میں اور مذہب کی بنیاد پر نہیں لڑی جا رہی ہے۔ یہ جنگ دو طبقوں کے درمیان ہے۔ استحصالی طاقتوں اور مظلوموں کے درمیان۔ اور وہ مظلوم تھا' غریب تھا۔ اس کا جھکاؤ بائیں جانب ہونا فطری تھا۔ سو وہ کمیونسٹ تحریک میں شامل ہو گیا۔

مگر اب وہ سوچ رہا تھا کہ کیا وہ درست تھا۔ اب جنگ کا رخ بدل گیا تھا۔ کمیونسٹوں کی طاقت کا سورج غروب ہو چکا تھا۔ کشمیر اپنی آزادی کی جنگ لڑ رہا تھا۔ استحصالی قوت اب رام راج کی تھی۔ طبقاتی جنگ تو بعد کا مرحلہ تھا۔ اس نے سوچا........ کاش میں جوان ہوتا۔ میں نے تو اپنی جنت کے لئے کچھ کیا ہی نہیں۔ موقع ہی نہیں ملا کچھ کرنے کا۔

اس نے پھر گرد و پیش کے حسن کو سراہنے والی نظروں سے دیکھا........ اور دکھی ہو گیا۔ جیسے روشنائی کا ایک قطرہ کاغذ پر گر کر پھیلتا چلا جاتا ہے........ بالآخر پورے کاغذ کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ ویسے ہی سیاسی زہر' دہشت پھیلاؤ اور حکومت کرو کا فلسفہ اس حسین جنت کو آہستہ آہستہ نگل رہا تھا۔ یہ سوچتے ہوئے اچانک اس کے اندر ایک یقین ابھرا........ نہیں' ایسا کبھی نہیں ہو گا۔

اسے احساس بھی نہیں ہوا کہ جیپ رک گئی ہے۔ وہ میجر شبیر کی آواز سن کر چونکا
"اتر جاؤ۔ اب یہاں سے تمہیں اکیلے جانا ہے۔ پاس ورڈ یاد ہے نا؟"

جبار شاہ نے سر کو جنبش دی "تھینک یو سر" اس نے میجر سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا پھر وہ جیپ سے اتر کر سامنے والی پگڈنڈی پر چل دیا۔

اسے کوئی ایک فرلانگ کا فاصلہ طے کرنا تھا۔ وہ ایک عجیب سی خوشی سے سرشار ہو گیا تھا۔ راستے پر اس کے قدم یوں پڑ رہے تھے جیسے وہ عمر گزشتہ کے چوالیس برسوں کو جھٹک آیا ہو۔ وہ گہری گہری سانسیں لیتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ وہ زندگی کے اختتام کی طرف بڑھ رہا ہے لیکن حیرت انگیز طور پر وہ بے حد مطمئن تھا۔ اب اس کا کچھ بھی ہو۔

یہ سعادت کم تو نہیں تھی کہ اس جیسے راندہ درگاہ کو وطن کی سرزمین پر قدم رکھنے کا شرف حاصل ہو گیا تھا۔

"اے وطن........ اے کشمیر........ اے میری جنت' دیکھ میں آ گیا ہوں" وہ انبساط بھرے لہجے میں بڑبڑایا۔

☆============☆============☆

وہ کار سنگ میل سے کچھ آگے ایک کچی سڑک پر کھڑی تھی۔ اگلی سیٹ پر ڈرائیور تھا جو یقینی طور پر آرمی سے متعلق ہو گا۔ یہ تمام انتظامات میجر شبیر نے کئے تھے۔ بیک ویو مرر میں کوئی پندرہ گز پیچھے ایک اور کار کھڑی نظر آ رہی تھی جس میں میجر شبیر کے علاوہ ملٹری پولیس کے چار جوان موجود تھے۔ اگلی کار میں بیٹھی ہوئی تسکین کو یہ سب کچھ خواب سا لگ رہا تھا۔

وہ سنسان سڑک تھی۔ عام حالات میں بھی استعمال میں نہیں رہتی تھی۔ وہ بہر حال آزاد کشمیر ہی کی حدود میں تھی۔ سڑک کے ایک طرف کوئی بیس گز دور ایک چھوٹا سا دو منزلہ کاٹیج تھا۔ کاٹیج کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ نچلی منزل کی ایک کھڑکی میں روشنی نظر آ رہی تھی۔

اس وقت صبح کے پانچ بجے تھے۔ رات کے اندھیرے میں صبح کی اولین سپیدی گھل مل رہی تھی۔

سردی اچھی خاصی تھی۔ تسکین خود کو گرم کوٹ میں لپیٹے بیٹھی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اب کچھ دیر میں یہ سب کچھ نمٹ جائے گا تو کیا ہو گا۔ وہ تیمور کو دوبارہ دیکھے گی تو کیا محسوس کرے گی۔ کیسا لگے گا۔ اتنا کچھ ہو چکا ہے اور اب تک تیمور پر جانے کیا کچھ گزر چکی ہے۔ پھر اسے یہ خیال بھی آیا کہ یہ اتنا نازک معاملہ ہے۔ آخری لمحوں میں کوئی گڑبڑ بھی ہو سکتی ہے۔ سب کچھ چوپٹ بھی ہو سکتا ہے۔ کچھ عجب نہیں کہ اس کہر زدہ صبح کے دامن سے تیمور کا چہرہ طلوع ہی نہ ہو۔

جب تک وہ سامنے نہ آ جائے' یقین سے کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا تھا۔

اسے عمر کے لہجے کی وہ تھکن اور دبی دبی سی شکست خوردگی یاد آئی جب اس نے پیرس سے فون کر کے اسے بتایا تھا کہ جبار شاہ عرف گرشا اسلام آباد کے لئے روانہ ہو چکا

ہے۔ اگر وہ کامیاب ہوگیا تو وہ سری نگر سے اسے فون کرے گا۔ اس فون کے بعد وہ تھی‘ ہوٹل کا وہ کمرا تھا اور اعصاب شکن انتظار۔ اور پھر دو بجے فون کی گھنٹی بجی تو اسے شاک لگا۔ اسے یقین ہی نہیں آرہا تھا۔

”مسز تسکین عمر“ دوسری طرف سے آپریٹر کہہ رہا تھا”سری نگر سے آپ کے لئے کال ہے۔“

وہ تسکین کی زندگی کی اہم ترین کال تھی۔ اسے احساس تھا کہ اپنی اعصاب زدگی کے باوجود اسے خود پر قابو رکھنا ہے۔ اس کے منہ سے ایک غلط لفظ نکل گیا تو سب چوپٹ ہو جائے گا۔ تیمور کی رہائی کا امکان معدوم ہو جائے گا۔

اس کا ریسیور والا ہاتھ لرز رہا تھا۔ ”بیگم عمر؟“ دوسری طرف سے پوچھا گیا۔

”جی ہاں۔ بول رہی ہوں۔“

”میں جبار شاہ بات کر رہا ہوں.......... سری نگر سے۔ میں پوری اتھارٹی کے ساتھ آپ سے بات کر رہا ہوں۔ آپ سمجھ رہی ہیں نا؟“

”جی.......... میں سمجھ رہی ہوں۔“

”دیکھیں.......... اب سب کچھ اس پر منحصر ہے کہ آپ پوری طرح ہدایات پر عمل کرتی ہیں یا نہیں۔ یہ ٹیلی فون نمبر نوٹ کرلیں..........“

”اس نے ایک نمبر لکھوایا جو تسکین نے نوٹ کر لیا“یہ نمبر ملانے کے بعد آپریٹر سے کہئے گا کہ سو نمبر ملا دو“ اس کے بعد جبار شاہ نے اسے تفصیل سے منصوبے کے اور اس جگہ کے متعلق بتایا جہاں ملاقات ہونا تھی۔ ٹائم ٹیبل بہت پیچیدہ تھا لیکن اس پر پوری طرح لمحہ لمحہ عمل درآمد کرنا تھا۔ اس گفتگو میں تیمور کے متعلق ایک لفظ بھی نہیں کہا گیا۔

”اب آپ سب کچھ دہرادیں“ جبار شاہ نے کہا۔

تسکین نے سب کچھ دہرا دیا۔

”بہتر بیگم عمر‘ فی الوقت اتنا کافی ہے“ جبار شاہ نے کہا۔

”ٹھہرو.......... یہ بتاؤ‘ میں کسی کو ساتھ لا سکتی ہوں؟“ تسکین نے پوچھا۔ اسے اپنی طرف سے ڈر نہیں تھا لیکن وہ سمجھتی تھی کہ اس طرح کے معاملات میں کیا کچھ ہو سکتا ہے۔ تیمور تو آنکھیں بند کر کے اندھے کنویں میں کود گیا تھا۔ وہ یہ حماقت نہیں کر

سکتی تھی۔ اسے یہ خیال بھی رکھنا تھا کہ ممکن ہے‘ جبار شاہ سے یہ سب کچھ ریوالور کے زور پر کہلوایا جا رہا ہو۔ ایک سنسان سڑک پر تنہا تو اسے بھی شکار کیا جا سکتا تھا۔

دوسری طرف خاموشی رہی۔ جیسے جبار شاہ کسی سے اس سوال کا جواب پوچھ رہا ہو مگر پھر اعصاب زدہ تسکین کو ایسا لگا جیسے رابطہ ٹوٹ گیا ہو۔ یہ سوچ کر اس کا دل ڈوبنے لگا۔

اسی لمحے ریسیور پر جبار شاہ کی آواز پھر ابھری ”جی.......... آپ لا سکتی ہیں۔ مگر آپ کے پاس ایک کار اس میں پانچ سے زیادہ آدمی نہیں ہونے چاہئیں۔ یہ بات نوٹ کر لیں۔ مقرر مقام پر پانچ آدمیوں سے زیادہ نہ ہوں۔ ٹھیک ہے؟ اچھا خدا حافظ بیگم عمر۔ مجھے امید ہے‘ بعد میں پھر بات ہوگی آپ سے..........“

رابطہ ٹوٹ گیا تھا۔ تسکین نے بھی ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔ ایک لمحہ وہ اس کاغذ کو دیکھتی رہی جس پر اس نے ہدایات نوٹ کی تھیں۔ اس پر گھبراہٹ طاری ہونے لگی۔ اسے وہ منحنی سا‘ غیر اہم آدمی یاد آیا.......... وہ حقیر آدمی جسے وہ گرشا کے نام سے جانتی تھی۔ وہ درحقیقت جبار شاہ تھا جو معمولی رقم کے عوض اخبار کو معلومات فراہم کرتا تھا۔ اب وہ بے چارہ سری نگر میں اپنے ان دشمنوں کے درمیان تھا جن سے بچنے کے لئے وہ تقریباً نصف صدی سے جلاوطنی کی زندگی گزار رہا تھا۔ یعنی کوئی چیز بھی مثبت نہیں تھی‘ کوئی چیز بھی یقینی نہیں تھی اور جبار شاہ اسے امید دلانے سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

اور امید بھی کیسی؟ یہ کہ وہ اس سرمئی اجالے میں‘ اس دھند میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتی رہے۔ آنے والی گاڑی کی ہیڈ لائٹس کی راہ تکتی رہے۔ امید.......... کہ اس ملگجے خلا سے گزر کر تیمور واپس آئے گا۔ بھاری بھرکم‘ بڑبولا‘ ہر چیز کو چیلنج کرنے والا‘ خود اعتمادی سے بھرا.......... بلکہ مغرور تیمور۔ اور وہ آتے ہی دوسروں کی کمزوریوں کے حوالے سے ان پر کڑی تنقید شروع کر دے گا۔ پہلے کی طرح۔

اس وقت تسکین ایک خواہش سے لبالب بھری ہوئی تھی۔ تیمور کو ایک بار پھر اپنے ساتھ کھڑا دیکھنے کی خواہش۔ وہ پہاڑ جیسا تیمور جو ساتھ کھڑا ہوتا تو اپنا وجود ایک حقیر سا ذرہ لگنے لگتا جس کی گونج دار آواز وجود کے نہاں خانوں تک پہنچ جاتی اور اس کے لہجے کی تندی جو اس پر یقین کرنے پر مجبور کر دیتی۔ وہ اس وقت ساتھ کھڑا ہو تو یقین آئے کہ

وہ بے یقینی کی اذیت اور مقدمے کی پریشانی ختم ہو چکی ہے اور صحافی اپنے ایک ساتھی کی جان بچانے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔

اسی لمحے ایک اذیت ناک خیال نے اس کے ذہن میں سوئی چبھوئی۔ اگر ان کی کوشش کسی نامعلوم لغزش کی وجہ سے ناکام ہو گئی ہے تو.......... تو عین اس وقت تیمور کو پھانسی دی جا رہی ہو گی لیکن اس نے اس اذیت ناک خیال کو تیزی سے ذہن سے جھٹک دیا۔ یہ سوچنا بھی محال تھا۔ اس سے بچنے کے لئے تسکین نے سامنے موجود ملگجے خلا کو تیمور کے تصوراتی ہیولے سے بھر دیا اور سماعت کو اس امید پر مرکوز کر دیا کہ اب کسی بھی لمحے تیمور کی آواز سنائی دے گی۔

پھر وہ یہ سوچنے لگی کہ اس سے ملنا کیسا لگے گا۔ قابضانہ فطرت کا مالک تیمور جس کا خیال تھا کہ اللہ نے کائنات کی ہر چیز اور دنیا کے ہر انسان کو اس کے لئے.......... صرف اس کے لئے تسخیر کر دیا ہے اور وہ خود.......... جو عمر جاوید کی بیوی تھی۔ اسے پیرس کی سڑک پر، ایک بلڈنگ کے دروازے کے سائے تلے شرمندگی کا وہ لمحہ یاد آیا جو تیمور نے اسے سونپا تھا اور اس نے اس پر کوئی احتجاج نہیں کیا تھا۔ صرف خود پر غصہ کر کے رہ گئی تھی۔ اس وقت اس نے بڑے غیر جذباتی انداز میں اس لمحے کے بارے میں سوچا.......... جیسے وہ کوئی اور دو افراد ہوں.......... اس کے شناسا.......... وہ اور تیمور نہ ہوں۔

کتنی عجیب بات تھی کہ وہ تیمور کے بارے میں اپنے جذبات کی حقیقت کو کبھی نہیں سمجھ پاتی تھی۔ بس اس کے وجود میں ایک ارتعاش سا پیدا ہو جاتا تھا۔ یہ ناقابل تسخیر خواہش ابھرتی تھی کہ بس ایک بار.......... ایک بار اور وہ تیمور کو دیکھ لے۔ اس وقت بھی اس کی یہی کیفیت تھی۔

پانچ بج کر بیس منٹ ہو چکے تھے۔ کہر اب چھٹ رہی تھی اور اجالا بڑھ رہا تھا۔ اچانک کہر کے پردے پر کسی کار کی ہیڈ لائٹس پڑیں۔ ساتھ ہی آتی ہوئی کسی کار کے انجن کی آواز سنائی دی۔

تسکین کے اعصاب جھنجھنا کر رہ گئے۔ وہ سنبھل کر بیٹھ گئی۔ چند لمحے بعد بل کھاتی پہاڑی سڑک کے موڑ سے ایک گاڑی نمودار ہوئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کی ہیڈ لائٹس دھیمی ہوئیں اور وہ کوئی پچاس گز کے فاصلے پر رک گئی۔ ہیڈ لائٹس بجھا دی

گئیں۔ ایک منٹ بعد وقفے وقفے سے ہیڈ لائٹس تین بار روشن ہوئیں۔ پھر ایک نسبتاً طویل وقفے کے بعد دوبارہ ایسا ہوا۔

وہ طے شدہ اشارہ تھا!

تسکین کا دل طوفانی رفتار سے دھڑک رہا تھا "جلدی کرو" اس نے اپنے ڈرائیور سے کہا۔

ڈرائیور کا ہاتھ ہیڈلائٹس کے سوئچ کی طرف بڑھا۔ اس نے بھی ہیڈلائٹس کی مدد سے وہی اشارہ دیا۔

دوسری کار بہت کم رفتار سے آگے بڑھی۔ اس بار وہ تسکین کی کار سے پچاس فٹ کے فاصلے پر رکی۔ ڈرائیور نے کار کو یوں گھمایا کہ اب اس کار کا رخ اسی طرف تھا جدھر سے وہ آئی تھی.......... یعنی مقبوضہ کشمیر کی طرف۔

چند لمحے بعد دوسری کار سے تین افراد اترے اور کچی سڑک پر کھڑے ہو گئے۔ تیمور ان کے درمیان نہیں تھا۔ یہ دیکھ کر تسکین کا دل ڈوبنے لگا۔ اگر وہ ان کے درمیان ہوتا تو بے حد نمایاں ہوتا.......... الگ نظر آتا۔

تسکین اپنی کار سے اتری۔ پچھلی کار سے میجر شبیر تین ساتھیوں کے ہمراہ اپنی کار سے اتر آیا تھا۔ وہ چاروں تسکین کے پیچھے کھڑے آپس میں سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے۔ تسکین جانتی تھی کہ چوتھا ملٹری پولیس والا کاٹیج میں فون پر سری نگر کی کھلی لائن لئے بیٹھا تھا۔ سب کچھ معاہدے کے مطابق ہو رہا تھا۔

مخالف پارٹی کے افراد میں سے ایک آگے چلا آیا۔ وہ سول لباس میں تھا۔ وہ تسکین کے سامنے آ کر رکا "بیگم عمر جاوید؟" اس نے تصدیق چاہی۔

"جی ہاں، میں بیگم عمر جاوید ہوں۔"

"ہم معاہدے کے مطابق تیمور کو لے آئے ہیں۔ آپ نے سری نگر فون کا انتظام کر رکھا ہے؟"

"جی ہاں۔ فون کاٹیج میں موجود ہے.......... معاہدے کے مطابق۔ لائن اوپن ہے۔"

اس شخص نے شک آمیز نظروں سے پہلے تسکین کو اور پھر کاٹیج کی طرف دیکھا

"ٹھیک ہے' تو آپ کال کر دیں' پلیز۔"

"یہ طے ہوا تھا کہ پہلے تم تیمور کو ہمارے حوالے کرو گے پھر کال کی جائے گی۔" تسکین نے بڑے اعتماد سے کہا۔

بھارتی چند لمحے تسکین کو گھورتا رہا پھر پلٹا اور اپنی کار کی طرف چل دیا۔

خدایا! یہ میں نے کیا کر دیا؟ تسکین نے سوچا۔ اگر یہ تیمور کو واپس لے گئے تو؟ اور کیا پتا' وہ اسے ساتھ لائے ہی نہ ہوں اور اگر میں پہلے کال کر دوں تو کھیل ہی ختم ہو جائے گا۔ وہ بہت زیادہ پریشان ہو گئی تھی۔

اسی وقت عقب سے میجر شبیر نے پوچھا "کیا صورت حال ہے تسکین؟ اگر کوئی گڑبڑ ہے تو بتاؤ۔ ہم انہیں قابو کر سکتے ہیں۔"

"ارے' نہیں میجر۔ پلیز" تسکین نے گڑبڑا کر کہا۔ وہ تحمل کا' انتظار کا وقت تھا۔ اس کے پاس ترپ کا ایک ہی پتا تھا........ سری نگر کو جانے والی فون کال۔ وہ اس کے ہاتھ سے وہ پتا لے لینا چاہتے تھے اور اسے مدافعت کرنا تھی........ مناسب حد تک۔ اس لئے کہ وہ لوگ بد عہد قوم سے تعلق رکھتے تھے۔

ادھر کے تینوں آدمیوں کے درمیان کچھ تبادلہ خیال ہوا پھر کار کا عقبی دروازہ کھلا اور تین اور افراد باہر آئے۔ ان میں ایک بے حد دراز قامت تھا اور باقی لوگوں پر چھایا ہوا نظر آ رہا تھا۔

تسکین کا دل جیسے اچھل کر حلق میں آ گیا۔ وہ دراز قامت شخص تیمور ہی لگ رہا تھا۔ تسکین نے بڑی کوشش کر کے خود کو قابو میں رکھا۔ وہ ان لوگوں پر ایک پل کے لئے بھی اعتبار نہیں کر سکتی تھی۔ اجالا اتنا نہیں تھا کہ تیمور کا چہرہ اسے نظر آتا۔

اب وہ چھ آدمی اس کی طرف بڑھے۔ دراز قامت شخص ان کے درمیان میں تھا۔

تسکین نے دھیمی آواز میں کہا "میجر صاحب' پلیز اب آپ زحمت کریں۔"

میجر شبیر اور اس کے ساتھی تسکین کے برابر آ کھڑے ہوئے۔ دراز قامت آدمی کے ایک طرف جو دو بھارتی تھے' ان کے ہاتھوں میں مشین گنیں تھیں۔ میجر شبیر اور اس کے ساتھی اس بات سے بے پروا نظر آ رہے تھے۔

دونوں گروپ اب آمنے سامنے تھے۔ درمیان میں صرف چند گز کا فاصلہ تھا۔ دونوں مشین گن والے دیو قامت شخص کو درمیان میں لئے آگے بڑھے۔ پھر دونوں مسلح افراد دو قدم پیچھے ہٹ گئے۔ دیو قامت شخص اب اکیلا کھڑا تھا۔

تسکین نے میجر شبیر سے کچھ کہا۔ میجر نے جیب سے ٹارچ نکال کر جلائی اور اس کا رخ دراز قامت شخص کی طرف کر دیا۔

تیمور حسین کا جانا پہچانا چہرہ' اپنے ایک ایک نقش سمیت روشن ہو گیا۔ کیوں؟ تسکین نے سوچا۔ یہ ذرا بھی تو نہیں بدلا ہے۔ آخر کیوں؟ یہ تو بالکل ویسا ہی ہے جیسا دفتر میں پہلی بار آیا تھا۔'

تیمور اس قدر نارمل اور صحت مند لگ رہا تھا کہ تسکین کو خوف آنے لگا۔ کہیں دشمن نے کسی اور شخص کو تیمور بنا کر تو نہیں بھیج دیا۔ وہ اس کے چہرے کے ایک ایک نقش کو بغور دیکھتی رہی۔ تیمور اسے نہیں دیکھ سکتا تھا کیونکہ اس کی آنکھوں میں ٹارچ کی روشنی پڑ رہی تھی۔ نہیں........ میں یہ ہونٹ تو کبھی نہیں بھول سکتی۔ تسکین نے سوچا۔

دراز قامت شخص نے پہلی بار لب کشائی کی "پلیز........ میرے ساتھ ایسا نہ کرو........"

تسکین نے میجر کو دیکھتے ہوئے سر کو اثباتی جنبش دی۔ میجر نے ٹارچ بجھا دی "ہاں........ یہ تیمور ہی ہے" اس نے کہا۔ پھر وہ تیمور سے مخاطب ہو گئی "تم جا کر آگے والی کار میں بیٹھو اور میرا انتظار کرو۔"

تیمور بغیر ایک لفظ کہے کار کی طرف بڑھنے لگا لیکن دونوں مسلح بھارتیوں نے اسے روک لیا۔ وہ بھارتی جس سے تسکین کا سب سے پہلے سامنا ہوا تھا' آگے بڑھ آیا "پہلے آپ کو آ کر ہمارے گروپ میں شامل ہونا ہو گا محترمہ" اس نے کہا "دیکھئے نا........ ہم بھی کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتے........"

تسکین ہچکچائے بغیر ان لوگوں کی طرف بڑھ گئی۔ ترپ کا پتا یعنی فون کال اب بھی اس کے ہاتھ میں تھی۔ وہ انتظار کرتی رہی اور جب تیمور کار میں جا بیٹھا تو خاصی مطمئن ہو گئی۔ ملٹری پولیس کے دونوں آدمی کار کے دونوں دروازوں کے پاس چوکنا انداز میں

کھڑے ہو گئے۔

"اب میں فون کرنے کے لئے تیار ہوں" تسکین نے کہا۔

وہ ان میں سے ایک کولے کے کاٹیج کی طرف بڑھ گئی۔ کاٹیج میں داخلی دروازے کے ساتھ ہی جو ہال تھا' وہاں ملٹری پولیس کا ایک آدمی فون کے پاس بیٹھا تھا۔ تسکین کے ساتھ آنے والا اسے دیکھ کر بھڑکا لیکن تسکین نے فوراً ہی اسے تسلی دے دی "گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ یہ یہاں کنکشن کلیئر رکھنے کے لئے بیٹھے ہیں۔"

بھارتی کا چہرہ ایک لمحے کو تاریک ہو گیا پھر اس نے بڑی تیزی سے خود کو سنبھالا اور تسکین کو دیکھ کر مسکرایا "محترمہ........... آپ مجھے بہت تجربہ کار خاتون لگتی ہیں" اس کے لہجے میں احترام تھا "خطرہ تو اناڑیوں سے محسوس ہوتا ہے۔ تجربہ کار لوگ خطرناک نہیں ہوتے۔"

اس نے بڑھ کر ریسیور کان سے لگایا۔ وہ کسی اجنبی زبان میں بات کر رہا تھا۔ اس نے جبار شاہ کا نام بھی لیا اور بیگم عمر جاوید کا بھی۔ پھر اس نے ریسیور تسکین کی طرف بڑھا دیا اور خود بھی ریسیور سے کان لگا دیا۔

"جبار شاہ صاحب؟" تسکین نے ماؤتھ پیس میں کہا۔

"جی ہاں' میں جبار شاہ بول رہا ہوں۔"

تسکین چند لمحے ہچکچائی۔ وہ اس بار اس کی آواز نہیں پہچان پا رہی تھی۔ پھر اسے احساس ہوا کہ فرق اتنا تھا کہ جبار شاہ کی آواز اور لہجے میں اب وہ پہلے سی کشیدگی اور کھنچاؤ نہیں تھا۔ اب وہ پُرسکون معلوم ہو رہا تھا۔ "میں تسکین بول رہی ہوں" اس نے کہا "ابھی چند منٹ پہلے تیمور کو ہماری تحویل میں دے دیا گیا ہے۔ جی ہاں.......... بظاہر تو وہ ٹھیک ٹھاک ہے۔ اس وقت وہ ملٹری پولیس کے جوانوں کے ساتھ ہے..........جی..........جی ہاں' میں بالکل ٹھیک ہوں۔ آپ کا بے حد شکریہ۔ اب ہم روانہ ہونے والے ہیں۔ خدا حافظ.......... فی امان اللہ شاہ صاحب۔"

اس نے ریسیور بھارتی کی طرف بڑھایا مگر اس نے سر کے اشارے منع کر دیا کہ اب اس کی ضرورت نہیں۔ تسکین نے ریسیور کریڈل پر رکھ دیا۔ ٹیلی فون کے پاس بیٹھے ہوئے ملٹری پولیس کے جوان نے ریوالور نکال کر ہاتھ میں لے لیا اور تسکین کے ساتھ ہی

کاٹیج سے باہر نکلا۔ بھارت والے شخص کو اس کی کوئی پروا نہیں تھی۔ اس نے ریوالور کو نظر بھر کر بھی نہیں دیکھا۔ اس نے مسکراتے ہوئے تسکین سے کہا "آپ کے انتظامات لاجواب ہیں۔"

لیکن وہ کاٹیج سے نکلے تو دونوں ہی کے لئے ایک حیرت منتظر تھی۔ کار کے قریب پاکستانیوں کی تعداد نہ جانے کیسے سات ہو چکی تھی۔ دوسری طرف بھارتی ایک گروہ کی شکل میں کار کے پاس ہی اکٹھے تھے۔ دونوں مسلح افراد آگے تھے۔ دو پاکستانیوں کے ہاتھوں میں ٹامی گنیں نظر آ رہی تھیں۔ ایک پاکستانی سڑک کے بیچ میں ٹانگیں پھیلائے کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں جدید طرز کی خود کار گن تھی۔ وہ یوں کھڑا تھا جیسے فائرنگ کے لئے تیار ہو۔

تسکین کے ساتھ نکلنے والے بھارتی نے ایک نظر میں صورت حال بھانپ لی لیکن بغیر کسی گھبراہٹ کے وہ اپنے ساتھیوں کی طرف بڑھا اور ان سے اپنی زبان میں' دھیمی آواز میں کچھ بات کی۔ وہ سب پلٹے اور پاکستانیوں کی طرف دیکھے بغیر اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گئے۔ ذرا دیر بعد گاڑی اسی طرف واپس چلی گئی جہاں سے آئی تھی۔

تسکین حیرت سے بیچ سڑک پر کھڑے فوجی کو دیکھے جا رہی تھی۔ "اسے میں احتیاطاً ساتھ لے آیا تھا" میجر شبیر نے وضاحت کی۔

"اور یہ دوسرے؟" تسکین نے اعتراض کیا "میں یہ سب کچھ سمجھنے سے قاصر ہوں۔ یہ کیسے پہنچے یہاں تک؟"

"کار کے نچلے حصے میں تھے یہ" میجر نے بتایا "مجھے بے وقوف بننا اچھا نہیں لگتا۔ ہمارے مخالفین زیادہ تعداد میں آئے تھے.......... اور وہ مسلح بھی تھے۔ ہمیں یہ امکان سامنے رکھنا تھا کہ وہ فون کال کے بعد تیمور کو بزور لے جانے کی کوشش کر سکتے ہیں۔ چنانچہ ہم نے احتیاطی تدابیر کیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ معاملہ خوش اسلوبی سے انجام پا گیا۔"

اچانک تسکین کو احساس ہوا کہ معاملہ نمٹ چکا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس پر کمزوری حملہ آور ہو گئی۔ اس کا جی چاہا کہ پھوٹ پھوٹ کر رو دے۔ میجر شبیر نے واقعی بڑا کام کیا تھا۔ مسلح افراد موجود نہ ہوتے تو کچھ بھی ہو سکتا تھا۔

بڑی کوشش کے بعد اس نے خود کو سنبھالا "شکریہ میجر" اس نے مسکراتے ہوئے کہا "اب مجھے اسلام آباد جانا ہے۔"

وہ اسی کار میں جا بیٹھی جس میں تیمور موجود تھا۔ اس نے ڈرائیور کو چلنے کا اشارہ کیا۔ فوجی کار ان کے پیچھے آ رہی تھی۔

وہ خاصی دیر تک خاموش رہے۔ تیمور سامنے کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ تسکین کو اب اس کا احساس ہوا کہ وہ جذبوں سے بوجھل ہو رہی ہے۔ در حقیقت اس پورے ڈراؤنے خواب کے دوران بھی وہ جذبوں سے بوجھل رہی تھی مگر صورت حال کی سنگینی میں سب کچھ دب کر رہ گیا تھا اور اسے خود بھی پتا نہیں چلا تھا۔

لیکن اب کسی جذبے کو دبانے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ اس کے ساتھ بیٹھا تھا۔ ڈراؤنا خواب ختم ہو چکا تھا۔ اس نے تیمور کو سر گھما کر دیکھا اور بولی "کچھ بولو بھی۔"

تیمور نے بھی اس کی طرف دیکھا لیکن بولا کچھ نہیں۔

تسکین کے دماغ میں آگ سی دہک اٹھی۔ کیا یہ اداس ہے........... یا کڑھ رہا ہے؟ یہ کسی بچے کی طرح روٹھا' منہ پھلائے بیٹھا ہے۔ کیا اس لئے کہ ایک عورت اس کی حماقت کی عینی شاہد ہے' ایک عورت نے اسے اس مشکل سے نکالا ہے جس میں اس نے خود کو اپنی حماقت سے دو چار کیا تھا........... مشکل کیا' ہلاکت کہنا چاہئے۔

تسکین کو غصہ آنے لگا۔ ایسا غصہ آیا کہ وہ قابو بھی نا پا سکی "اب شاید تم میں اتنی اخلاقی جرات بھی نہیں کہ میرا شکریہ ادا کر سکو..........."

تیمور نے مشینی انداز میں دہرایا "شکریہ؟" انداز ایسا تھا جیسے کسی الجھن میں مبتلا ہو "کس بات کا؟" پھر اس نے سر کو تفہیمی جنبش دی "ہاں ضرور۔ میں تمہارا شکریہ ضرور ادا کروں گا۔ اس لئے کہ تم چاہتی ہو کہ میں شکریہ ادا کروں..........."

یہ الفاظ تیمور کی زبان سے ادا ہوئے تھے اور پھر تیمور کے تاثرات ایسے تھے کہ لگا' وہ یہ بات غرور سے کہہ رہا ہے........... جل کر کہہ رہا ہے۔ تمسخر اڑا رہا ہے اس کا۔

تسکین کسی آتش فشاں کی طرح ابل پڑی "تمہاری اتنی جرات کیسے ہوئی؟" اس کی آواز لرز رہی تھی "میرے شوہر سے........... اس اخبار سے تمہارا روزگار وابستہ تھا۔ بیروزگاری کے اس دور میں یہ بہت بڑا احسان ہے۔ تم اخبار کے تمام کارکنوں سے وابستہ تھے۔

تمہیں اتنی جرات کیسے ہوئی کہ تم نے اپنی بچکانہ انا کی تسکین کی خاطر ہم سب کو مشکل میں ڈالا؟ ہماری زندگی عذاب کر دی۔ تم مرد نہیں ہو۔ کبھی بھی نہیں تھے۔ کبھی نہیں رہے۔ تم بس ایک بڑبولے دیو تھے۔ اپنے قامت سے فائدہ اٹھاتے تھے۔ بڑی بڑی باتیں کر کے دوسروں کو مرعوب کرتے تھے۔ اندر سے تم خود سر' خود نما اور غیر ذمے دار بچے سے بڑھ کر کچھ بھی نہیں تھے۔ سن رہے ہو تم؟ سنا کہ میں کیا کہہ رہی ہوں؟ تمہیں دیکھ کر مجھے متلی کا احساس ہونے لگتا ہے..........."

اور تسکین کی طبیعت واقعی بگڑنے لگی تھی۔ وہ اس کے سامنے انسانی پڈنگ کی شکل میں بیٹھا تھا "........... اور آئندہ مجھے دیکھنے کی........... مجھے چھونے کی ہمت نہ کرنا" اس نے مزید کہا "اور عمر کا کبھی مذاق نہ اڑانا" تیمور کی خاموشی اس کا اشتعال اور بڑھا رہی تھی "اگر میرا شوہر مرد نہ ہوتا........... حوصلہ مند اور ذہین نہ ہوتا تو تم اس وقت زندہ نہ ہوتے۔ اس وقت پھانسی پر لٹک رہے ہوتے۔ مجھے تم سے نفرت ہے........... شدید نفرت..........." اب غصہ اس کے قابو سے باہر تھا۔ اس نے پوری قوت سے تیمور کے رخسار پر ایک........... اور پھر دوسرا تھپڑ مارا۔ تیسرے تھپڑ کے بعد رخسار پر اس کی انگلیوں کے نشانات چھپ گئے "اس سے تم اندازہ لگا سکتے ہو کہ تم نے کتنا برا کیا ہے اور میں تم سے کتنی نفرت کرتی ہوں" وہ بولی۔

تینوں تھپڑوں کی آواز گولی چلنے کی آواز سے مشابہ تھی لیکن تیمور ساکت وصامت بیٹھا رہا۔ پھر اچانک اس کی آنکھوں سے دو آنسو رخساروں پر ڈھلک آئے۔ اس کے ہونٹ یوں لرزنے لگے جیسے وہ کوئی چھوٹا سا بچہ ہو "مجھے یوں مارنے کی ضرورت نہیں" اس نے کہا "میں نے بساط بھر سیکھنے کی کوشش کی ہے۔ دیکھیں........... میں پھر سناتا ہوں..........." یہ کہہ کر اس نے اپنا اعتراف جرم سنانا شروع کر دیا۔ اس کی آواز ویسی ہی گونج دار اور لہجہ بے حد اثر انگیز تھا۔ وہ اس مقام سے روانی سے گزر گیا جہاں اسے عمر جاوید اور تسکین پر الزام لگانا تھا کہ ان دونوں نے اسے انٹیلی جنس کے چکر میں پھنسایا۔ مگر پھر وہ کہتے کہتے رک گیا اور نفی میں سر ہلانے لگا "نہیں........... یہ ٹھیک نہیں ہے۔ بیان کا یہ حصہ تو خاصا بعد میں آئے گا۔ اب شاید تم مجھے پھر تھپڑ مارو گی کیونکہ میں کچھ بھول رہا ہوں۔ مگر خدا کے لئے' مجھے بالٹی والی سزا نہ دینا۔ پلیز مجھے بالٹی والی سزا نہ دینا" وہ اچانک

کھکھیانے لگا "دیکھو.......... میں پھر کوشش کرتا ہوں یاد کرنے کی.........." اتنا کہنے کے بعد اس نے اپنی نم آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھا۔ اس کی نظروں میں شناسائی کا شائبہ بھی نہیں تھا اور پہلی بار تسکین کو احساس ہوا کہ تیمور کی آنکھوں کی پتلیاں پھیلی ہوئی ہیں اور وہ یوں بے تاثر ہیں جیسے زندگی کی حرارت سے محروم ہوں۔

"تیمور!" تسکین چلائی۔ وہ دہشت میں ڈوبی ہوئی چیخ تھی۔ ڈرائیور نے بے ساختہ بریک لگایا اور پلٹ کر دیکھا "تیمور.......... خدا کے لئے.......... بس کرو۔ اب اور کچھ نہیں کہو۔ خدایا! مجھے معلوم نہیں تھا.......... مجھے تو اندازہ بھی نہیں تھا کہ.........."

"خدا کے لئے مجھے بالٹی والی سزا نہ دینا" تیمور گڑگڑانے لگا "اب بالٹی کی سزا مجھ سے برداشت نہیں ہو گی۔ سنو.......... میں اپنی طرف سے پوری کوشش کرتا ہوں یاد کرنے کی۔ تم کیا سمجھتی ہو کہ مجھے اپنے جرائم کا احساس نہیں۔ یقین کرو' میں پھانسی چڑھنا چاہتا ہوں۔ میرے جرائم کی فہرست بہت طویل ہے۔ مجھے پھانسی ملنی چاہیئے۔" یہ کہہ کر اس نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے ڈھانپ لیا اور بری طرح سسکنے لگا۔

دوسری کار بھی رک گئی تھی۔ میجر شبیر نیچے آیا اور اس نے کھڑکی سے اندر جھانکا۔ تیمور سسک رہا تھا اور تسکین کا چہرہ سپید ہو رہا تھا "تسکین.......... کیا ہوا؟ کیا بات ہے ڈیئر؟" میجر نے پوچھا۔

تسکین اسے خالی نظروں سے دیکھتی رہی پھر اس نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا "تیمور.......... انہوں نے تیمور کا جسم واپس کر دیا ہے.......... خالی جسم۔ اس میں کچھ بھی نہیں بچا ہے۔ نہ دماغ' نہ روح۔ مجھے احساس بھی نہیں ہوا کہ.........."

وہ بے بسی سے اس انسان کو دیکھتے رہے جس کا وجود زندگی کے ہر جذبے سے عاری ہو چکا تھا۔

☆============☆============☆

اسلام آباد میں تیمور کو آرمی کے ایک ڈاکٹر اور ایک نرس کے سپرد کر دیا گیا تھا۔ تسکین نے پیرس فون کر کے عمر کو تیمور کی بازیابی کی اطلاع دی۔ اس نے اسے تیمور کی ذہنی حالت کے متعلق بھی بتایا۔ عمر نے بتایا کہ وہ بھی شام تک اسلام آباد پہنچ جائے گا۔ تسکین نے کہا کہ وہ ائرپورٹ پر اسے ریسیو کرے گی۔

"کیا تیمور کی حالت بہت خراب ہے؟" عمر نے پوچھا۔

تسکین نے چند لمحے سوچنے کے بعد جواب دیا "فی الوقت تو وہ ایک چلتی پھرتی لاش ہے۔"

"خدایا.......... بے چارہ! مجھے اکیلے تم پر یہ بھاری ذمے داری نہیں ڈالنی چاہیئے تھی۔"

"کیوں بھئی۔ میں ایسی غیر ذمے دار تو نہیں" تسکین نے کہا۔ عمر نے کوئی جواب نہیں دیا تو وہ بولی "اخبار کے معاملات تو ٹھیک چل رہے ہیں نا؟"

ہاں' سب خیریت ہے۔"

"تو ٹھیک ہے۔ شام کو ملاقات ہو گی ائرپورٹ پر۔"

شام کو عمر ائرپورٹ سے سب سے پہلے اسپتال گیا اور تیمور کو دیکھا۔ اب تیمور کی نگرانی ڈاکٹر کے علاوہ ایک سائیکاٹرسٹ بھی کر رہا تھا۔ وہاں سے وہ تسکین کے ساتھ پرل کانٹی نینٹل چلا گیا جہاں تسکین کے پاس کمرا ابھی تک موجود تھا۔

کار میں ہوٹل جاتے ہوئے عمر نے کئی بار کن انکھیوں سے تسکین کو دیکھا۔ اس کا دل ڈوبا جا رہا تھا۔ ساتھ ہی وہ اس کے استقلال اور حوصلے پر اش اش کر رہا تھا۔ محبت میں گرفتار کوئی عورت ہی اتنی حوصلہ مند ہو سکتی ہے۔ اس کے چہرے سے پتا چل رہا تھا کہ وہ تھکن سے نڈھال ہے لیکن وہ ابھی آرام کرنے کے لئے تیار نہیں تھی۔ عمر کو افسوس ہونے لگا کہ اکثر ایسا کیوں ہوتا ہے کہ انسان جو چاہتا ہے' وہ ہوتا بھی ہے تو اس انداز میں نہیں ہوتا جس کی وہ توقع کر رہا ہوتا ہے۔ عمر نے تسکین کو اسلام آباد میں چھوڑ کر اسے یہ موقع دیا تھا کہ واپسی کی صورت میں سب سے پہلے وہ تیمور سے ملے۔ وہ تیمور کو ریسیو کرے۔ اس لئے کہ وہ اس کی مستحق تھی۔ سب سے زیادہ اس نے ہی تیمور کی رہائی کے لئے کوشش کی تھی لیکن ہوا کیا؟ عمر نے اسے خوشی دینا چاہی تھی اور قدرت نے اسے دکھ بنا دیا تھا۔ خوشی ملنے کے بجائے تسکین کو یہ شاک لگا تھا کہ دشمنوں نے اس کے پسندیدہ شخص کو کھوکھلا اور نامکمل کر کے واپس کیا تھا۔ اب وہ اس پر بھی خود کو مجرم ٹھہرا رہا تھا۔ آخر وہ ہمیشہ غلطی پر غلطی کیوں کرتا چلا جاتا ہے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ تیمور کی پیرس آمد کے بعد سے اس نے جس کام میں ہاتھ ڈالا' وہ بگڑ گیا۔ ہاں ایک مثبت بات بھی

ہوئی۔ جو کام حکومت نہیں کر سکی' وہ اس نے کئی افراد اور اپنے ارادے کی مدد سے کر دکھایا۔ وہ تیمور کو موت کے پنجوں سے گھسیٹ لایا تھا۔

لیکن اہم ترین بات یہ تھی کہ اس نے تسکین کو کھو دیا تھا۔

وہ کمرے میں داخل ہوئے ہی تھے کہ تسکین اس سے لپٹ کر رونے لگی۔

وہ لمحہ عمر کے لئے بہت کرب ناک تھا۔ تسکین کی ہچکیاں بندھ گئی تھیں اور اس گریہ کا سبب ملے جلے جذبے تھے۔ مسلسل تھکن' اعصابی شکست خوردگی اور پھر یہ اطمینان کہ مسئلہ حل ہو گیا ہے۔

عمر اسے سہارا دے کر بیڈ کی طرف لے گیا اور نرمی اور آہستگی سے اسے بیڈ پر لٹا دیا۔ اس کے اوسان خطا ہو گئے تھے۔ کم ہی مرد ایسے ہوتے ہیں جو اپنی بیوی کے رونے پر نہ بوکھلائیں۔ عمر نے فیصلہ کیا کہ ابھی اور اسی وقت وہ تسکین کے سامنے ہر ذمے داری قبول کرے گا.......... اپنی کوتاہیوں کا اعتراف کرے گا۔ وہ اسے ناخوش نہیں دیکھ سکتا تھا۔ وہ اسے یقین دلانا چاہتا تھا کہ بالآخر تیمور ٹھیک ہو جائے گا.......... پہلے جیسا۔ اور وہ اسے بتا دینا چاہتا تھا کہ وہ اسے قید کر کے نہیں رکھے گا بلکہ آزاد کر دے گا۔ اس لئے کہ وہ جانتا ہے کہ جوانی' جوانی کی طرف کھنچتی ہے۔

وہ تسکین کے قریب جا کر بیٹھ گیا "تسکین.......... میری جان' میں شرمندہ ہوں.........."

اس کے لفظوں نے جادوئی انداز میں تسکین کی ہسٹریائی کیفیت کو توڑ ڈالا۔ تسکین نے اپنا آنسوؤں سے بھیگا ہوا چہرہ اٹھا کر اسے غور سے دیکھا "عمر.......... تم شرمندہ ہو! شرمندہ تو میں ہوں جان۔ لیکن کیا کرتی۔ میں بے بس تھی۔ میں نے احمقانہ حرکتیں کیں۔ لیکن اب سب کچھ ختم ہو چکا ہے عمر۔ مجھے تمہارے پاس واپس آنا کتنا اچھا لگا ہے' تم اس کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ مجھے کتنا سکون ملا ہے" اس نے عمر کے دونوں ہاتھ تھام کر اپنی پیشانی سے لگا لئے۔

عمر اسے بڑی بے یقینی سے دیکھ رہا تھا۔ وہ حیران تھا۔

"میرے دل پر بڑا بوجھ تھا ڈیئر" تسکین اس کی کیفیت سے بے خبر اپنی کہتی رہی۔

"میں بہت برہم تھی.......... بہت غصہ آ رہا تھا مجھے۔ اس نے تمہارے ساتھ بھی بہت

زیادتی کی تھی اور اخبار کے ساتھ بھی لیکن میں اس غصے کو دبائے بیٹھی رہی۔ اس لئے کہ غصے کا اظہار کرتی تو تمہیں لگتا کہ میں تمہارے اسے اسلام آباد بھیجنے کے فیصلے پر تنقید کر رہی ہوں اور یہ سوچ کر میرا خون کھول اٹھتا کہ اس بددماغ' خود سر اور خود پرست انسان نے وہ سب کچھ ختم کر دینے کی کوشش کی تھی جو تم نے بڑی محنت سے بنایا تھا۔ تم ذمے دار آدمی ہو۔ تم نے اخبار کو ایک باعزت پالیسی دی' اسے جدید دور سے ہم آہنگ کیا اور وہ یہ سب کچھ ختم کرنا چاہتا تھا۔ جب یہ ثابت ہو گیا کہ اس نے تمہارے اعتماد کا غلط فائدہ اٹھایا تو مجھے اس سے نفرت ہو گئی۔ تم نہ ہوتے تو وہ اب تک مر چکا ہوتا.........." اس نے توقف کیا اور عمر کو بہت غور سے دیکھا "عمر.......... تم عظیم انسان ہو۔ مجھے فخر ہے اس پر کہ میں تمہاری بیوی ہوں۔ کتنا فخر ہے مجھے اپنے اس اعزاز پر' یہ تم سوچ بھی نہیں سکتے۔"

عمر نے ایک گہری سانس لے کر نظریں چرائیں۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کے اندر کا حال تسکین پر ظاہر ہو۔ اس کے اعصاب جھنجھنا گئے تھے۔ اس لئے کہ ان پر سے ایک خوفناک سسپنس کا بوجھ اٹھ گیا تھا۔ وہ پُر سکون ہوا اور اس کے ساتھ ہی اس پر کمزوری عود کر آئی۔

"انہوں نے اس پر بڑا ظلم کیا ہو گا.........." وہ بولا۔

تسکین نے اسے تیز نظروں سے دیکھا "وہ کمزور آدمی تھا.......... بودا انسان۔ جتنی آسانی سے اسے توڑ ڈالا گیا' تم اس طرح نہیں ٹوٹ سکتے تھے۔ ایک خود پرست اور ناپختہ ذہن ہی ان کے اٹیک پر شکست خوردہ بچے کا سا ردعمل ظاہر کر سکتا تھا۔ وہ ایسا ہی تھا۔ بس وہ اسے اپنے جارحیت کے مظہر ظاہر کے پردے میں چھپا کر رکھتا تھا۔ وہ لوگوں کو حقیر سمجھ کر' ان کی توہین کر کے' بڑبولا پن کر کے اپنی کمزور شخصیت کو چھپاتا تھا.........."

عمر کے لئے یہ بات بہت عجیب تھی کہ تیمور کا دفاع وہ کرے "تم نہیں جانتیں' وہ لوگ کتنے بے رحم' کتنے عیار ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ انسان کی قوت ارادی کو چُور چُور کرنے کے لئے جدید ترین طریقے اختیار کرتے ہیں۔ اور انسان کو مسلسل کھنگالا جائے تو کمزوریاں تو ہر انسان میں ہوتی ہیں.......... اور بے نقاب بھی ہو جاتی ہیں۔"

"بے شک۔ کمزوریاں ہر انسان میں ہوتی ہیں" تسکین نے اسے بغور دیکھتے ہوئے

کہا ”مردوں کی کمزوریاں عورتیں سمجھتی بھی ہیں اور ان سے سمجھوتا بھی کرتی ہیں لیکن ایسی کمزوریاں بھی ہوتی ہیں جنہیں کوئی عورت برداشت نہیں کر سکتی۔“

”مثلاً؟“ یہ سوال مشکل تھا لیکن عمر جانتا تھا کہ پوچھنا ضروری ہے۔

”گھٹیا پن‘ خودنمائی‘ خود پرستی اور غیر ذمے داری“ تسکین نے بلا جھجک جواب دیا ”عمر...... یہ ہم دونوں کے لئے ہی کڑا وقت تھا۔ لیکن جو اس وقت میں کہنے والی ہوں‘ وہ ہمیشہ یاد رکھنا۔ کمزوری اگر دکھائی ہے تو میں نے دکھائی ہے۔ تم ابتدا سے آخر تک مرد ثابت ہوئے ہو۔ تم میں ہر وہ خوبی ہے جس کی کوئی عورت آرزو کر سکتی ہے۔ میں خوش نصیب ہوں کہ آرزو سے بڑھ کر میں نے وہ سب کچھ پالیا ہے۔ یہ بات کبھی نہ بھولنا۔“

عمر نے اس کا ہاتھ تھام کر اپنے رخسار سے لگا لیا۔ اس دوران وہ سوچتا رہا تھا۔ کیا تسکین میری سب سے بڑی کمزوری سے ناواقف ہے۔ وہ کمزوری جس کی وجہ سے یہ سب کچھ ہوا۔ جس کے نتیجے میں میرا ماتحت موت کے چنگل میں جا پھنسا۔ اب وہ واضح طور پر دیکھ اور سمجھ سکتا تھا کہ تسکین کے لئے اس کے دل میں بے پناہ محبت اور عمر کے تفاوت کے خوف کے بطن سے اس کے اندر دو خامیوں نے جنم لیا ہے۔ حسد اور خود پر بے اعتمادی۔ دوسری خامی بے حد خطرناک تھی۔ تسکین ایک عورت تھی جسے مردانہ پختگی پسند تھی۔ اور وہ اسے جوانی کے لاابالی پن کے سپرد کر دینا چاہتا تھا۔ جبکہ تسکین کو اس میں نام کی دلچسپی بھی نہیں لگتی تھی۔ اگر اسے پتا چل جائے کہ اس عرصے میں وہ کس انداز میں سوچتا رہا ہے تو وہ بجا طور پر اس سے ناراض ہو گی۔

اور کیا پتا‘ تسکین کو یہ بات معلوم ہو اور کون جانے‘ وہ اسے اس خطا پر معاف بھی کر چکی ہو۔ وہ اتنے برسوں سے اسے جانتی ہے۔ کیا حسد اور جذبہ رقابت اس سے چھپا رہا ہو گا؟ کسی نہ کسی حد تک تو وہ جانتی ہی ہو گی۔ بلکہ اس نے جو کچھ کہا ہے‘ شاید اسی لئے کہا ہے۔ صرف اسی طرح وہ اس کی ممکنہ حد تک مدد کر سکتی تھی۔ اس نے کہا ہے...... یہ بات کبھی نہ بھولنا۔ بے اعتمادی کو دور کرنے کی اس سے بہتر کوئی دوا ہو سکتی ہے۔ اپنے انداز میں وہ اعلان کر چکی تھی کہ وہ ایک بالغ عورت ہے اور اسے اس سے اسی سطح پر ملنا ہو گا۔ اگلی بار وہ ناکام ہوا تو وہ خود اس ناکامی کا ذمے دار ہو گا۔

اس کا وجود تسکین کے لئے شکر گزاری سے بھر گیا۔ اس نے سوچا‘ ایسی عورت

کے ساتھ بوڑھا ہونے میں کوئی نقصان نہیں بلکہ فائدہ ہی ہے۔

اور جیسے تسکین نے اس کے خیالات پڑھ لئے۔ وہ مسکرائی۔ اس مسکراہٹ میں بے حد نرماہٹ تھی۔ پھر اس نے پوچھا ”تم نیلوفر کو ساتھ کیوں نہیں لائے؟“

”وہ کل آئے گی۔“ عمر نے جواب دیا۔

☆============☆============☆

اگلی رات تسکین ہی کے کمرے میں ایک میٹنگ ہوئی جس میں ڈاکٹر عمران صدیقی اور ماہر نفسیات ڈاکٹر صغیر سے تیمور کے متعلق گفتگو ہوئی۔ پیرس سے نیلوفر آ چکی تھی اور اس میٹنگ میں شریک تھی۔

”یہ درحقیقت ڈاکٹر صغیر کا کیس ہے“ ڈاکٹر عمران نے کہا ”یہی آپ کو اپنی ابتدائی تشخیص کے متعلق بتائیں گے۔ جہاں تک میرے معائنے کا تعلق ہے تو میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ شاک‘ دباؤ‘ تھکن اور اعصابی تھکن سے قطع نظر وہ جسمانی طور پر بالکل فٹ ہے۔ اس کے جسم پر نہ کوئی زخم ہے‘ نہ کسی زخم کا نشان۔ تاہم میں نے نوٹ کیا ہے کہ تیز آوازوں...... خاص طور پر دھاتی آوازوں کے معاملے میں غیر معمولی طور پر حساس ہو گیا ہے۔ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ کسی اسپیشلسٹ سے اس کے کانوں کو چیک کرایا جائے۔ باقی تفصیلات ڈاکٹر صغیر بتائیں گے۔“

ڈاکٹر صغیر نے کہا ”شاید آپ لوگوں کو اندازہ نہ ہو لیکن یہ حقیقت ہے کہ مریض کو مسلسل مختلف قسم کی دواؤں کے زیر اثر رکھا گیا ہے۔ ایسی دواؤں کا تسلسل بہت اہم ہوتا ہے۔ پچھلے چوبیس سے چھتیس گھنٹوں کے درمیان اسے کوئی دوا نہیں دی گئی ہے لہٰذا اثرات دھیمے پڑ گئے ہیں۔ اب وہ جانتا ہے کہ وہ کون ہے‘ کہاں ہے اور کیوں ہے۔ اسے کچھ واقعات بھی یاد آ گئے ہیں لیکن الجھن‘ ہچکچاہٹ اور ہسٹریا جیسی کیفیت جو نارکوسس کا نتیجہ ہے‘ بتدریج دور ہو رہی ہے۔ فی الوقت وہ بہت گہرے ذہنی ڈپریشن کی کیفیت میں ہے۔“

عمر آگے کی طرف جھک آیا ”معاملہ سنگین تو نہیں؟“ اس نے پوچھا۔

”بہت زیادہ سنگین ہے۔ میں نے اگرچہ اس کے ساتھ صرف چند گھنٹے گزارے ہیں لیکن میں جان گیا ہوں کہ دوا کے علاوہ اس پر تھکن‘ بے آرامی اور خوف کے ذریعے

تشدد کیا گیا ہے۔ ان اثرات کے تحت اس کے ذہن میں ایسے خیالات کی نمو ہوئی ہے اور اس نے ایسے کام کئے ہیں جو عام حالات میں اس کے لئے ناقابل قبول تھے............"

"مثلاً.........."

"ملک و قوم سے غداری' عزیز ترین ہستیوں سے' دوستوں سے بے وفائی............ اس شکل میں کہ اسے ایسے خیالات' تصورات اور ترغیبات دی گئیں جو بالکل غلط تھیں' جنہیں وہ مسترد کرتا رہا تھا نہایت شدت سے۔ اور پھر اس نے انہیں قبول کر لیا۔"

"لیکن وہ ٹھیک ہو جائے گا" نیلوفر نے پوری شدت سے کہا۔ "اسے یہ احساس بھی تو ہو گا کہ اسے دواؤں کے' تشدد کے زور پر قائل کیا گیا ہے۔ ان باتوں کا یقین دلایا گیا ہے جن کی وہ نفی کرتا تھا۔ اور اگر اسے یہ احساس ہو گیا ہے تو.........."

ڈاکٹر صغیر نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے تسکین کی بات کاٹ دی "ایسے کیسوں میں یہ نہیں ہوتا۔ یہ بات طے ہے کہ اسے ایک ایسے عمل سے گزارا گیا ہے جس کے دوران وہ اپنا ذہن' اپنی شخصیت کھو بیٹھا ہے.......... بلکہ یوں کہئے کہ اس سے اس کا ذہن اور شخصیت چھین کر اس پر ایک متبادل ذہن اور شخصیت مسلط کر دی گئی ہے۔ اسے جھوٹ.......... صریح جھوٹ کی بنیاد پر احساس جرم میں مبتلا کیا گیا تھا۔ مثلاً یہ کہ وہ پاکستانی جاسوس ہے اور اہم راز چرانے اور تخریبی کارروائیاں کرنے کے لئے اسے مقبوضہ کشمیر بھیجا گیا تھا۔"

"لیکن اب تو وہ جانتا ہے کہ یہ سچ نہیں ہے۔" ڈاکٹر عمران نے اعتراض کیا۔

"آپ سمجھ نہیں رہے ہیں۔ ایک احساس جرم کی جگہ دوسرے احساس جرم نے لے لی ہے۔ اب اسے اپنی کمزوری' نااہلی اور ناکامی پر.......... ملک و قوم سے' اپنے پیاروں سے' اپنے دوستوں سے غداری پر احساس جرم ہو رہا ہے۔ انسانی روح کے لئے اس سے تاریک عذاب اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ وہ نظریں نہیں اٹھا سکتا شرمندگی کی وجہ سے اور وہ ایسا شخص ہے' جو کبھی بہت مغرور اور سربلند تھا۔"

"اس کے اندر خودکشی کا رجحان تو نہیں' وہ مرجانا تو نہیں چاہتا؟" عمر نے پوچھا۔

"خودکشی کا رجحان اس کے اندر موجود ہے۔"

اس پر کمرے میں کچھ دیر کے لئے سناٹا چھا گیا بالآخر عمر نے پوچھا۔ "کوئی امید

ہے.......... میرا مطلب ہے' اس کی مدد کی جا سکتی ہے.......... سہارا دیا جا سکتا ہے اسے؟"

"جی ہاں۔ میرا خیال تو یہی ہے مگر آنے والا وقت ہی بتائے گا کہ میرا خیال درست ہے یا غلط ۔ فی الوقت اسے ایک لمحے کے لئے بھی اکیلا نہیں چھوڑا جا سکتا۔ یہ احتیاط طویل عرصے تک برتنا ہو گی۔ اسے سب سے زیادہ ضرورت ایک ایسے شخص کی ہے جو دن رات اس کے ساتھ رہے اور اس کی مسمار شدہ انا کی از سر نو تعمیر کرے۔ اس کی عزتِ نفس کے احساس کو زندہ کرے۔ جب آدمی اپنے عقیدوں سے یا ان لوگوں سے غداری کرتا ہے جو اسے بے حد عزیز تھے تو اس قعرِ مذلت سے اٹھنا بہت دیر طلب اور وقت طلب کام ہے۔ اب میرا مشورہ ہے کہ اسے ایک کل وقتی نرس فراہم کی جائے یا کوئی ساتھی جو اسے ایک لمحے بھی نظر سے اوجھل نہ ہونے دے اور اگر وہ اسپتال میں نہ رہے تو بہتر ہے۔ اس طرح وہ تیزی سے سنبھل سکے گا۔ اصولاً تو اسے ایک پُرسکون اور آرام دہ گھر ملنا چاہئے۔ گھر نہیں تو گھر سے ملتی جلتی کوئی جگہ ہو جہاں گھر کا سا ماحول ہو۔ میں روزانہ اسے وقت دوں گا۔ اس کے ساتھ زیادہ وقت گزار کر ہی مجھے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس کے ذہن میں کس طرح کا اٹیک کیا گیا ہے۔ پھر میں زیادہ بہتر طور پر بتا سکوں گا کہ اس کی شخصیت' اس کے ذہن اور روح کی بحالی کے لئے کیا علاج کیا جائے۔"

میٹنگ ختم ہو گئی۔ عمر نے محبت اور ہمدردی سے نیلوفر کے کندھے تھپتھپائے لیکن نیلوفر کو احساس ہی نہیں تھا۔ ڈاکٹر صغیر جاتے جاتے تسکین سے بات کرنے کے لئے رکا۔ عمر بھی ان کی طرف بڑھ گیا۔ وہ تینوں باتیں کر رہے تھے کہ عقب سے نیلوفر نے انہیں چونکا دیا۔ "پلیز عمر صاحب.......... ڈاکٹر صاحب' میں کچھ کہنا چاہتی ہوں۔"

ان تینوں نے پلٹ کر اسے دیکھا۔ عمر نے دل ہی دل میں سوچا' سب سے زیادہ خسارہ اسی بے چاری کو ہوا ہے اس کھیل میں۔ کتنی پیاری لڑکی ہے۔ کاش حسین اور پُرکشش بھی ہوتی۔ نیلوفر بولی تو اس کے لہجے میں وہ مضبوطی تھی جو صرف حتمی فیصلہ کر کے بولنے والوں کو نصیب ہوتی ہے۔ "تیمور کی دیکھ بھال میں کرنا چاہتی ہوں۔ میں اس کا خیال رکھوں گی۔ آپ کہہ رہے تھے نا ڈاکٹر صاحب کہ کوئی ایسا شخص ہو جو اسے اس کی روح واپس دلائے۔ میں ایسا کر سکتی ہوں۔ میں اس کا کھویا ہوا غرور' اس کی انا اور عزت نفس بحال کر سکتی ہوں۔"

تسکین نے بڑھ کر اس کے دونوں کندھے تھام لیے۔ ساتھ ہی اس نے عمر کو اشارہ کیا۔ عمر بغیر ایک لفظ کہے کمرے سے چلا گیا۔ نیلوفر کو پتا ہی نہیں چلا۔ اس کی نظریں تو ڈاکٹر کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

تسکین نے بے حد نرم لہجے میں کہا۔ "نیلو.......... تم تیمور سے محبت کرتی ہو نا؟"

نیلوفر نے حیرت سے اسے دیکھا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ بات دفتر کے ہر فرد کو معلوم ہے۔ "جی ہاں" اس نے جواب دیا۔

"تیمور بھی تم سے محبت کرتا ہے؟"

"معلوم نہیں۔ میرا خیال ہے' وہ مجھ سے محبت نہیں کرتا۔ کیا اس سے کوئی فرق پڑتا ہے؟"

"نیلو' میری جان.......... میرا خیال ہے' تم نے جم کر سوچا نہیں ہے۔" تسکین بولی۔ "تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ تم کتنے مشکل کام کا بیڑہ اٹھا رہی ہو۔ وہ مایوسی کی حالت میں ہے' اسے خود سے بھی نفرت ہو گئی ہے۔ اسے ہر وہ شخص برا لگے گا جسے دیکھ کر اسے اپنا کڑا وقت یاد آئے گا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کسی وقت اس پر تشدد کا دورہ پڑ جائے۔ تمہیں اندازہ نہیں کہ ان ملعونوں نے اسے کس حد تک توڑ دیا ہے۔ تم اس کی خاطر سب کچھ ترک کر دو گی۔ اپنا کام' اپنی آزادی' اپنا مستقبل' اپنی پوری زندگی؟"

"جی ہاں۔ میں اس کے لئے سب کچھ چھوڑ دوں گی" نیلوفر نے کہا۔

ڈاکٹر صغیر نے کہا۔ "ادھر بیٹھو آ کر" وہ خود بھی کرسی پر بیٹھ گیا "تمہارا نام کیا ہے؟"

"نیلوفر ریاض" نیلوفر نے برابر والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

ڈاکٹر نے چند لمحے اسے بغور دیکھا۔ پھر اس نے پوچھا "تمہاری عمر؟"

"۲۷ سال۔"

لگتی کم عمر ہو۔ یہ بتاؤ کتنے عرصے سے تیمور سے محبت کرتی ہو؟"

"اس وقت سے جب میں نے پہلی بار اسے دیکھا تھا" نیلوفر نے بلاجھجک کہا۔ اس نے یہ بات سمجھ لی تھی کہ صرف سچ بولنا ہی بہتر ہے۔

"اور یہ کب کی بات ہے؟"

"کوئی تین ماہ پہلے کی۔"

"تمہارے اور اس کے درمیان کوئی.........."

"جی نہیں۔ بس ایک بار وہ مجھ سے قریب ہوا تھا.......... وہ بھی نشے میں۔ دوسری بار اس نے مجھے خداحافظ کہا تھا.......... یہاں آتے ہوئے۔ وہ بھی مصلحت.......... ضرورت کے تحت۔"

ڈاکٹر صغیر نے ایک گہری سانس لی "اس کا مطلب ہے' تم خود کو کسی خود فریبی میں مبتلا کرنا پسند نہیں کرتیں۔ تمہیں اس بات کا بھی احساس ہے کہ تم اگر اپنی زندگی کا ایک حصہ.......... چھ ماہ' سال' دو سال اس کی خاطر قربان کرتی ہو' تب بھی تمہارے لئے یہ قربانی لاحاصل ہو سکتی ہے۔ ممکن ہے' وہ ٹھیک ہو جائے تو تمہیں چھوڑ جائے؟"

"جی ہاں' میں یہ بات سمجھتی ہوں۔"

ڈاکٹر اس کی طرف جھک آیا۔ اس کی نگاہوں میں اس کے لئے گرم جوشی اور تفہیم تھی "تمہیں یہ احساس بھی ہے کہ اس عرصے میں اس بات کا امکان کم ہی ہے کہ وہ تم سے محبت کرنے لگے بلکہ ایسا ہوا تو یہ معجزہ ہی ہو گا۔ اس لئے کہ تم نے اس کی زندگی کے کمزور ترین لمحوں میں بہت قریب سے دیکھا ہو گا۔ تم نے اس کی دیکھ بھال کی ہو گی۔ اس پر ترس کھایا ہو گا۔ وہ جان لے گا کہ تم اس کا ہاتھ تھام کر اسے گھپ اندھیرے سے روشنی میں لے کر آئی ہو۔ مرد ایسے لوگوں سے محبت نہیں کرتے۔ اس لئے کہ ایسے لوگوں کے سامنے ان کی مردانگی مجروح ہوتی رہتی ہیں۔ امکان یہی ہے کہ وہ تمہارا سامنا کرنا بھی پسند نہیں کرے گا.......... صحت یاب ہونے کے بعد۔ کوئی عظیم انسان ہی ہو گا جو ایسی لڑکی سے محبت کرے گا۔ عام مرد تو ایسی لڑکی کو اس کے تعاون اور ہمدردی پر کبھی معاف ہی نہیں کر سکتا۔"

"تو کیا یہ خیال مجھے اس کی مدد کرنے سے روک سکتا ہے؟ ہرگز نہیں۔"

"ڈاکٹر.......... کیا یہ ممکن ہے؟ کیا نیلو' تیمور کی مدد کر سکتی ہے؟" تسکین نے ڈاکٹر سے پوچھا "کیا آپ کے خیال میں یہ اس انداز میں اس کی مدد کر سکتی ہے جو تھوڑی دیر پہلے آپ نے بیان کیا تھا؟ کیا اس سے تیمور کو فائدہ پہنچ سکتا ہے؟"

ڈاکٹر نے ایک لمحے سوچا اور پھر اثبات میں سر ہلا دیا "جی ہاں' کیوں نہیں" اس

نے کہا۔ ”جس وقت میں اس کے لئے ساتھی کی بات کر رہا تھا‘ میرے ذہن میں ایک ایسی ہی محبت کرنے والی‘ کسی کی خاطر خود کو تج دینے والی ہستی کا تصور تھا۔ ہاں ...... مس نیلوفر میرے مریض کے بہت کام آ سکتی ہیں۔ میں صرف اس لئے ہچکچا رہا ہوں کہ مجھے ڈر ہے‘ مس نیلوفر کو اس سے کوئی فیض نہیں پہنچ سکے گا۔ میں کسی جوان لڑکی کی زندگی برباد ہوتے نہیں دیکھنا چاہتا۔“

”مجھے اس کی کوئی پروا نہیں ہے ڈاکٹر صاحب!“ نیلو فر بولی۔

”بعد میں......... آخر میں ہو گی......... اور وہ بھی اس کی بھلائی کی خاطر“ ڈاکٹر نے کہا۔ ”خیر........ اس پر ہم بعد میں بات کریں گے۔ تم مس نیلوفر‘ کل صبح گیارہ بجے ہسپتال آ جاؤ۔ پھر میں اور تم اس کے کمرے میں چلیں گے اور دیکھیں گے کہ کیا صورت حال بنتی ہے۔ اس کا ردعمل کیا ہوتا ہے۔“

تسکین‘ ڈاکٹر کو چھوڑنے باہر تک گئی۔ ڈاکٹر نے کہا۔ ”مجھے اس لڑکی سے بڑی امید ہے۔ حقیقت پسند اور محبت کرنے والی لڑکی ہے یہ ایسے لوگ بہت بڑا اثاثہ ہوتے ہیں۔ یہ تیمور کی مدد کرے گی اور میں اس کی مدد کروں گا۔ یہ تیمور کو دوبارہ جینا سکھائے گی اور میں اسے زندگی میں پہلی بار جینا سکھاؤں گا۔“

”ان دونوں کا خیال رکھئے گا ڈاکٹر“ تسکین نے کہا۔ ”کل شاید میں اپنے شوہر کے ساتھ پیرس چلی جاؤں گی۔ تیمور کے سلسلے میں تمام اخراجات ہمارا ادارہ برداشت کرے گا‘ انقلاب میں اور نیلوفر کی ملازمت برقرار رہے گی۔ ہم یہ سمجھیں گے کہ وہ ڈیوٹی پر ہے۔“

”آپ فکر نہ کریں مسز عمر۔“

☆============☆============☆

تحصیل اٹھ مقام کے ایک گاؤں کا وہ لڑکا دریائے نیلم کے شمالی کنارے پر ایک پہاڑی ڈھلوان پر پھولدار جھاڑیوں کے درمیان اکیلا کھیل رہا تھا۔ وہ کبھی جھکتا اور دہرا ہو

کر ادھر ادھر دیکھتے ہوئے چلتا۔ وہ اس وقت اپنی دانست میں ایک کمانڈو تھا‘ جو سرحد پار کر کے بھارت کے کشمیر میں چلا گیا تھا۔ وہ اس وقت دشمنوں میں گھرا ہوا تھا۔ اسے دشمنوں پر بس ایک فوقیت حاصل تھی۔ دشمن کو اس کی موجودگی کا علم نہیں تھا۔ کبھی وہ جھک کر چلتا اور کبھی جھاڑی میں دبک جاتا اور دریا کی طرف دیکھنے لگتا پھر وہ دریا کی سمت پیش قدمی کرنے لگتا۔

ایک بار جو اس نے دریا کی سمت دیکھا تو اس کی توجہ ایک چیز پر مرکوز ہو گئی۔ وہ عجیب سی چیز دریا کے کنارے سے قریب تر بہتی چلی آ رہی تھی۔

لڑکا اپنا کھیل بھول گیا۔ اس نئی چیز میں اس کی دلچسپی بڑھ گئی تھی۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہوا اور اس چیز کو دیکھنے لگا۔ وہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ کیا چیز ہو سکتی ہے لیکن فاصلہ زیادہ تھا اور اندازہ نہیں لگایا جا سکتا تھا۔

وہ چیز شاید کسی چٹان میں الجھ کر رک گئی تھی اور پانی کا بہاؤ اسے کنارے کی طرف دھکیل رہا تھا۔ کنارے پر وہ چیز ایک جھاڑی کی شاخ میں الجھ گئی۔

اب لڑکے کے پاس اپنے تجسّس کی تسکین کا موقع تھا۔ وہ ڈھلوان پر بھاگتا ہوا دریا کی طرف لپکا‘ لیکن آدھا راستہ باقی تھا کہ وہ چیز جھاڑی سے علیحدہ ہو کر پھر پانی پر بہنے لگی۔ لڑکے نے اپنی رفتار بڑھا دی۔ وہ کنارے پر پہنچا تو وہ چیز خاصی آگے جا چکی تھی۔ لڑکا کھڑا ہو کر اسے دیکھنے لگا۔ اچانک اس کے رونگٹے کھڑے ہونے لگے۔ کپڑوں کے اس ڈھیر میں اسے واضح طور پر ایک انسانی ہاتھ نظر آیا تھا۔ اس نے نظر پر زور دیا اور جان لیا کہ وہ کسی انسان کی لاش ہے۔

اسی وقت اس کی نظر جھاڑی پر پڑی۔ لاش کی کوئی چیز جھاڑی سے اٹکی رہ گئی تھی۔ وہ جھاڑی کی طرف گیا اور وہ چیز نکال لی۔ وہ ایک بوسیدہ مفلر تھا۔ بوسیدگی کے باوجود اس کے رنگ ماند نہیں پڑے تھے۔ اس کا ڈیزائن بھی عجیب سا تھا۔ اس پر سبز‘ سرخ اور زرد رنگ کے ہیرے بنے ہوئے تھے۔

لڑکا مفلر ہاتھ میں لیے بہتی ہوئی لاش کو دیکھتا رہا جو دور تر ہوتی جا رہی تھی۔ وہ نظروں سے اوجھل ہو گئی تو لڑکا پلٹا اور پگڈنڈی پر چڑھنے لگا۔ اس نے مفلر کو بڑی محبت

سے دیکھا۔ وہ اس کے لئے یادگار تھی.......... نشانی تھی۔ اس نے سوچا کہ لڑکوں کو بتائے گا کہ اس نے کمانڈو کی حیثیت سے ایک دشمن کو ٹھکانے لگایا ہے اور یہ مفلر بطور نشانی رکھ لیا ہے۔

اس نے مفلر کو چوم لیا۔

========== ختم شد ==========